

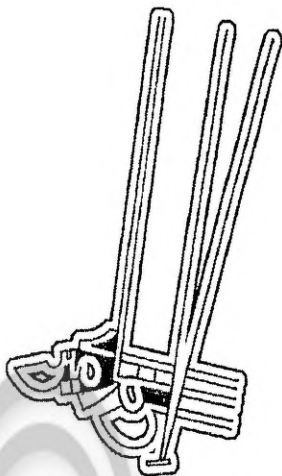
خواتین کے لیے خاص ستر افریقی ادب

# پاکستان پوائنٹ

Naeyufaq.com

Pakistanipoint  
Earning Point

صلاحتی



ابتداءً

- 10 سرگوشیاں  
مدیرہ  
11 حمد  
صبحِ رحمانی  
11 نعت  
ناہید اختر بلوچ  
12 در جواب آل  
مدیرہ

دانش کدہ

- 22 چراغِ دل  
راجہ افتخار  
168 محبت جاویدانِ زندگی  
فاطمہ عاشی

ناولٹ

رہنما آتنا  
مشتاق احمد شیشی

- 124 اونچے قدر کہونے لوگ  
صباء ایشل

ہمارا آچل

افسانہ

- 20 کنول ناز  
انٹرویو

- 70 رفاقت جاوید  
لارج

سلسلہ 9 ادا ناول

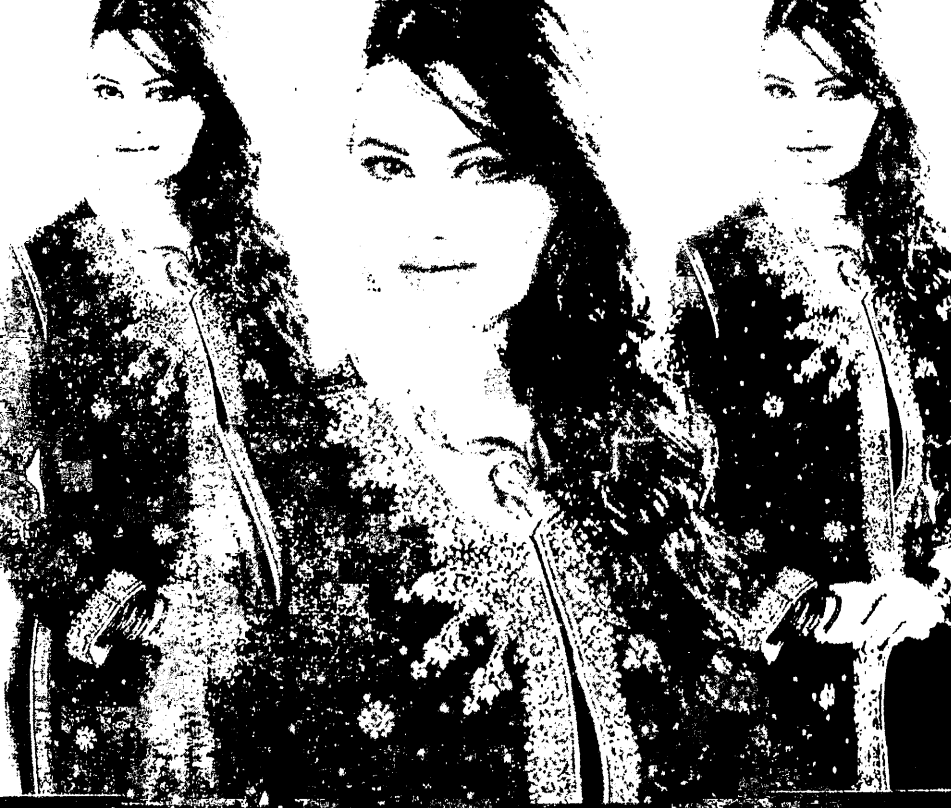
- 106 صدف آصف  
ستم گمر

- 82 عشما کوثر سردار  
اکائی

- 194 نظیر فاطمہ

- 144 اُم ایمان قاضی  
سناسول کے اس فن میں

پبلشر مشتاق احمد و ستریش پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی  
دفتر کا پتا: 81 ٹیچر بیرکس، ہاکی کلب آف پاکستان، اسٹیڈیم روڈ، آچل پریس کراچی 75510



عکاسی: منویٰ رضا

سرورق: فریہ آغاز

### مستقل سلسلہ

- |                  |              |     |              |                          |     |
|------------------|--------------|-----|--------------|--------------------------|-----|
| بیاض دل          | میمونہ رفوان | 198 | یادگار لمحے  | جویریہ یاسک              | 213 |
| دشمن مقابلہ      | طلعت آغاز    | 200 | آئینہ        | شہلا عامر                | 217 |
| نیرنگ خیال       | ایمان وقار   | 204 | ہم سے پوچھیے | شائلہ کاشف               | 221 |
| دوست کا پیغا آئے | ہما احمد     | 209 | آپ کی صحت    | ہومیوڈاکٹر شائستہ سرفراز | 224 |

خط و کتابت کا پتہ: ”آنٹھیل“ پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200، فون: 021-35620771/2

03008264242 کیے از مطبوعات نئے آنٹھیل پبلی کیشنز، ای میل: Info@naayufaq.com



# سرگوشیاں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اگست ۲۰۲۰ء کا شمارہ آپ کے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے حاضر ہے۔  
اہل وطن کو عید النضیٰ مبارک

حسب معمول اہل وطن سخت ترین دن اور مشکل وقت گزار رہے ہیں رات آتی ہے اور پھر سپیدہ سحر نمودار ہو جاتی ہے۔ ہند سے بدل جاتے ہیں مگر ہم حضرت انسان نہ بدل رہے ہیں، نہ ہمارا دل بدل رہا ہے نہ رز و نین اور خواب بدل رہے ہیں۔ نجانے ہم کب خود کو پہچان پائیں گے، کب اپنے اندر سدھارا اور بدلاؤ لائیں گے، کب ہم باشعور اور تعلیم یافتہ کہلائیں گے، نجانے کب ہم اپنی اسلامی اقدار، رسم و رواج اور شعائر کو اپنائیں گے، ہم کب ایک اجتماع، سچے مسلمان بن پائیں گے۔ شاید کبھی نہیں کیونکہ یہی روئی طاقتوں نے اسلام دشمنی میں ہمیں اور ہماری آنے والی نسلوں کو اس قدر بے حس اور ناکارہ بنا دیا ہے کہ ہم اپنا بھلا اور براسو چننا ہی نہیں چاہتے اور سارا قصور اپنے بڑوں اور حکومت پر ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور چاہ رہے ہیں کہ ہم آرام سے بیٹھے رہیں اور کوئی دوسرا آئے اور سب کچھ درست کر دے اور ہمیں کچھ کرنا نہ پڑے، کیا ایسا ممکن ہے؟ اللہ سبحان و تعالیٰ کا بھی حکم ہے کہ جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسے ہی حکمران تم پر مسلط کر دیئے جائیں گے۔ اب یہ ہمارے سوچنے کا عمل ہے کہ ہمیں ایسے کیا اعمال کر لے چاہیے جس سے اللہ سبحان و تعالیٰ خوش ہو جائے اور ہمیں نیک صالح، دین دار ایمان دار اور مخلص حکمران مل جائیں جن کے دل میں عوام کی خدمت کا جذبہ اور درد ہو۔

رواں سال میں اس ناگہانی وبائی مرض نے ملک و قوم کو بھاری نقصان پہنچایا ہے اور مسلسل پہنچا ہی رہا ہے۔ اس مرض میں مبتلا ہو کر کیسے کیسے ہیرے اور قابل لوگ ہم سے بچھڑ گئے جن میں جید علمائے کرام، شعبہ ادب سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور فن و ادب کے قابل قدر اشخاص شامل ہیں اور یہ نقصان ہم چاہ کر بھی کسی طرح بھرنے پائیں گے۔ اللہ سبحان و تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ امت مسلمہ کے تمام مرحومین کی کامل مغفرت و بخشش فرمائے اور سب کو اپنی خاص جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور مریضوں کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے آمین۔

اس ماہ کے ستارے:

رفاقت جاوید، رابعہ افتخار، صدف آ صد، صبا یشیل، نظیر فاطمہ، فاطمہ عاشی۔

اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

مدیرہ  
قیصر آراء



# حکمران

حوصلہ دے فکر کو اور بارش فیضان کر  
ہے ثناء تیری بہت مشکل اسے آسان کر  
رفتہ رفتہ کھول مجھ پر راز ہائے جسم و جاں  
دھیرے دھیرے مجھ پہ ظاہر تو مری پہچان کر  
زیست کے پتے ہوئے صحرائیں ہوں اس سے نکال  
میرے سر پر نیلراں رحمت کی چادر تان کر  
کفر آلودہ فضاء میں سانس لینا ہے محال  
پھر سے اس گم کردہ رو کو صاحب ایمان کر  
ختم ہو جائے بساط خاک کا سب شور و شر  
بے سکونی کو عطا پھر حسن اطمینان کر  
نیمہ شب سے یہی آواز آتی ہے صبح  
حمد لکھ اور اس طرح بخشش کا کچھ سامان کر

صبح رحمانی

# نعمت

سلام الرحمن ﷺ پہ جو کار ثواب دیکھتی ہیں  
ہماری آنکھیں مدینے کے خواب دیکھتی ہیں  
سراپا الرحمن ﷺ کا صحابہ یوں دیکھتے ہوں گے  
نگاہیں جیسے خدا کی کتاب دیکھتی ہیں  
چمن میں جب بھی وہ ﷺ تشریف لے کر آتے ہیں  
بہارین چاروں طرف بس گلاب دیکھتی ہیں  
کبھی جو آئے نظر مجھ کو گنبد خضریٰ  
مری نگاہیں اسے بے حساب دیکھتی ہیں  
کہیں بھی دیکھ لیں آنکھیں جو ان ﷺ کا پیارا نام  
کھلا ہوا وہیں رحمت کا باب دیکھتی ہیں

ناہید اختر بلوچ



نزہت جبین ضیاء..... کراچی

پیری نزہت! سدا سہاگن رہو، زندگی مشکلات سے، تجھی اور خوشیوں سے بچی ہوئی ہے۔ یہ مشکلات د پریشانیاں ہمیں اللہ سبحان و تعالیٰ سے قریب کرتی ہیں اور پھر وہی ذات پاک ہمیں خوشیاں عطا کرتا ہے۔ پچھلے کچھ مہرے سے آپ اپنے شوہر نامدار کی خراب طبیعت کی وجہ سے پریشان ہیں اب وہ انجیو پلاستی کروا کر گھر آئے ہیں۔ اللہ سبحان و تعالیٰ انہیں صحت نامہ دے۔ بدھ صفا فرمائے اور آپ دونوں کا ساتھ ہمیشہ قائم رکھے آمین۔ قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

ماوراطحہ..... سحرات

پیری ماورا! سدا سہاگن رہو، ہم تو عید کے حوالے سے آپ کی تحریر کے منتظر ہی رہے۔ پتا چلا کہ آپ اپنے نانا کی رحلت کے باعث لکھ نہیں پاری ہیں، بے شک انسان جن کے زیادہ قریب ہوتا ہے ان کا اس دنیا سے جانے یا بچھڑنے کا بھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ خود کو سنبھالیں اور ان کی مغفرت کی دعا کریں اس میں آپ کو اور نانا کو بھی سکون ملے گا۔ آپ کے شوہر نامدار کے حادثہ کا پتا چلا دعا گو ہیں کہ اللہ سبحان و تعالیٰ ان کو سلامت رکھے اور آپ دونوں کا ساتھ ہمیشہ قائم رکھے آمین۔ قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

گنہت سیماء..... چکوال

پیری گنہت! خوش و آباد رہو، سچ کہوں تو پرانے لکھنے والے اب کم ہوتے جا رہے ہیں اور وجہ نشریاتی ادارے ہیں کیونکہ بہت کم وقت میں زیادہ شہرت مل جاتی ہے پر آپ کے لیے یہ کہنا مناسب نہیں ہے کیونکہ آپ نے رسالہ کو ہی اہمیت دی اور جب سے سنا ہے کہ آپ آفچل کے لیے تحریر ارسال کر رہی ہیں۔ میں اس دن سے انتظار میں ہوں اب نجانے آپ کتنا انتظار کراتی ہیں پر اس انتظار کا اپنا ہی مزہ ہے کیونکہ آپ کی تحریر دل کو چھو لیتی ہے اور مدتوں یاد رہتی ہے۔ اللہ سبحان و تعالیٰ آپ کی تحریر میں مزید نکھار پیدا کرے، آمین۔

مصباح نوشین..... فیصل آباد

پیری مصباح! سدا سہاگن رہو، یوں تو آپ نے لکھنے کی شروعات آفچل سے کی اور پھر دیگر رسائل میں لکھ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ نشریاتی اداروں پر بھی آپ لکھ رہی ہیں۔ یعنی مصروفیت ہی مصروفیت ہے۔ اگر ٹھوڑا سا وقت ہمارے آفچل کے لیے نکال کر مختصر سی تحریر ہی ارسال کر دیں تو خوشی ہوگی، آپ کی والدہ کی خراب طبیعت کا جان کر دعا گو ہوئے کہ اللہ سبحان و تعالیٰ ان کو صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے آمین، قارئین سے بھی دعا کی درخواست ہے۔

سمیرا شریف طور..... گوجرانوالہ

پیری سمیرا! سدا شاد و آباد رہو، آپ کی جانب سے بے حد خوش کن خوش خبری ملی کہ آپ جلد ہی اپنے قارئین اور چاہنے والوں کے لیے جلد ہی قلم آزمائی کرنے والی ہیں تو سن کر بہت خوشی ہوئی اور قارئین کے ساتھ ساتھ ہم بھی بے حد بے چینی کے ساتھ آپ کی کہانی کے منتظر ہیں اور امید کرتے ہیں کہ پہلے سے بھی بہت زیادہ دلچسپ ناول لے کر جلد ہی آفچل کے

صلوات پر علاء افراد ہوں گی۔ ہمیں بے خوبی اندازہ ہے آپ کی مصروفیت کا کہ دو پھوٹے بیٹے اور اوپر سرخا دی نوری آپ کو فرصت کے لمحات بہت کم ملیں میرے آتے ہوں گے۔ اب ارادہ کر ہی لیا ہے لکھنے کا تو اس کو جلد ہی پایا تکمیل تک پہنچا دیں۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ سبحان و تعالیٰ آپ کے لیے آسانی کا معاملہ فرمائے آمین۔

شبینہ گل..... راولپنڈی

پیاری شبینہ! سدا سہاگن رہو، حجاب میں شائع ہونے والی تحریر ”ایک ٹھی میر“ بہت خوب صورت انداز تحریر اور الفاظ کا چناؤ آپ نے خوب کیا یوں کہوں کہ بہت عرصہ بعد شاندار تحریر پڑھنے کو ملی تو غلط نہ ہوگا۔ دل کو چھو لیا۔ شروع سے آخر تک تحریر نے اپنے حصار میں جکڑے رکھا اور مکمل ہو جانے کے بعد تڑپ کو پھر قارئین کی نظر سے پڑھا۔ بھی بہت خوب شبینہ دلوں میں گھر کرنا خوب جانتی ہیں۔ پر آپ کی ایک تحریر ”ہانڈی روٹی“ کے لیے معذرت چاہتی ہوں وہ ہمارے پرچے کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔ امید ہے آئندہ بھی آپ ”ایک ٹھی میر“ جیسے موضوعات کو قلم بند کر کے ہمیں ارسال کرتی رہیں گی۔

یاسمین نشاط..... لاہور

پیاری یاسمین! سدا سہاگن رہو، یوں تو آپ آج کل حجاب میں لکھتی رہتی ہیں اور قارئین آپ کو پسند ہی کرتے ہیں آپ کی آخری تحریر ”نیلا دل“ پڑھی اور اس کے بعد اب بالکل خاموشی ہے امید ہے جلد ہی اپنی تحریر ارسال کریں گی۔ اللہ سبحان و تعالیٰ آپ کے لکھنے میں مزید نکھار لائے آمین۔

قرۃ العین سکندر..... چینیٹ

پیاری عینی! آبا د رہو، بے شک اس وقت حالات

ایسے ہیں کہ ہر شخص پریشان ہے اور اپنے طور ان حالات کا مقابلہ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ آپ کی پریشانی سمجھ سکتی ہوں، اللہ سبحان و تعالیٰ آپ کی پریشانیوں کو دور فرمائے، آمین۔ آپ کی جانب سے تحریر ”جرم محبت“ موصول ہوئی تحریر میں ربط نہیں ہے اور موضوع بھی کچھ خاص نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے تحریر جگہ بنانے میں ناکام ٹھہری ہے۔ کوشش کریں کہ کسی اور موضوع پر قلم اٹھائیں اور پوری توجہ اس کو دیں امید ہے توفیق ہوئی ہوگی۔

عالیہ توصیف..... آسٹریلیا

پیاری عالیہ! خوش رہو، آپ کی جانب سے تحریر ”دروازے“ موصول ہوئی، پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ہمارے تینوں پرچے کے مزاج کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لیے معذرت چاہتے ہیں۔

حمیرا علی..... کراچی

پیاری حمیرا! سدا سہاگن رہو، آپ کی جانب سے قسط دار ناول ”تیرے خواب کے یقین میں“ موصول ہوا۔ آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ سلسلے وار کے لیے پہلے ادارے سے رابطہ کرنا ہوتا ہے۔ ادارے کی اجازت کے بعد ہی سلسلے وار ناول لکھا جاتا ہے۔ ابھی ہمارے دونوں پرچوں میں بالکل بھی گنجائش نہیں ہے اس لیے معذرت آپ مکمل ناول ارسال کر سکتی ہیں۔

نگہت غفار..... کراچی

پیاری نگہت! شاد و آباد رہوں، گزشتہ دنوں آپ نے شکوہ کیا کہ آپ کی تحریر شائع نہیں کی جارہی۔ طویل عرصہ سے باری آنے کے انتظار میں ہے۔ اب کیا کریں جب سے لاک ڈاؤن ہوا ہے تحریروں کی ترتیب نہیں بن پارہی جن کی وجہ سے مصنفین ناراض بھی ہو رہی ہیں۔ کوشش ہے کہ جلد ہی آپ کی تحریر شائع کر دیں دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔

مونا شنہزادہ..... راولپنڈی

کیا کریں۔ اپنا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع کریں۔ نامور مصنفین کو بخور پڑھیں تاکہ لکھنے میں بہتری آئے۔

ایمان بھٹی..... وہاڑی

پیاری ایمان! خوش رہو، آپ کی جانب سے تحریر ”گل حزین“ موصول ہوئی۔ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے تحریر کو جس خوب صورتی سے آپ نے اختتام کیا۔ ہے اس سے آپ کی محنت ظاہر ہوئی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی منفرد موضوع کو اس خوب صورتی کے ساتھ قلم بند کرتے تحریر ارسال کریں گی۔

خواص عنایت..... مانسہرہ

پیاری خواص! سلامت رہو، آپ کی جانب سے شاعری موصول ہوئی۔ متعلقہ شعبہ میں بھیج دی وہاں سے جواب آیا ہے کہ ابھی آپ اپنی تعلیم پر توجہ دیں اور شاعری فی الحال چھوڑ دیں۔ امید ہے ان کی بات پر عمل کریں گی۔

سیدہ تبسم بشیر حسین..... ڈنگہ

پیاری تبسم! خوش آباد رہو، دو ماہ کی دوری میں نے بھی بہت محسوس کی۔ آپ سب کی محبت کی عادی ہو گئی ہوں اس لیے ہر قاری دل کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ آپ لکھنا چاہتی ہیں ضرور لکھیں لیکن وہ لکھیں جو آپ خود پڑھنا چاہتی ہوں ہر طرف پریشانی، لڑائی جھگڑا ہے اور کوئی بھی قاری یہ پڑھنا نہیں چاہے گا اس لیے ایسے موضوع کا انتخاب کریں جس میں جھگڑا تو ہو پر اس کے ساتھ محبت بھی ہو دونوں کا توازن رکھیں تحریر اچھی ہو جائے گی امید ہے بات سمجھ میں آ گئی ہوگی۔

رقیہ ناز..... میلی

پیاری رقیہ! سدا سہاگن رہو، خط تاخیر سے موصول ہوا۔ پرچہ تکمیل کے مراحل میں تھا اس لیے

پیاری مونا! سدا سکھی رہو، یوں تو آپ اپنی تحریروں سے نئے افق کو سمجاتی رہتی ہیں اور اپنی تحریر سے قارئین کے دلوں پر حکمرانی بھی کرتی رہی ہیں۔ اب آپ کی کتاب شائع ہو کر منظر عام پر آ گئی ہے جس کی ادارے کی جانب سے بے حد مبارکباد آپ کی ارسال کردہ کتاب موصول ہو گئی ہے فرصت کے لمحات ملتے ہی پڑھیں گے۔ اللہ سبحان و تعالیٰ آپ کو مزید کامیابی و کامرانی عطا کرتا رہے آمین۔

عطیہ گل..... ننکانہ صاحب

پیاری عطیہ! جگہ جگہ جیو، آپ کی جانب سے تحریر ”منزل تنہائی“ موصول ہوئی پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ابھی آپ کو سخت محنت کی ضرورت ہے۔ اس لیے اپنا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع کریں نامور افسانہ نگاروں کو پڑھیں تاکہ لکھنے میں مدد ملے امید ہے تشفی ہوگی۔

نجم انجم اعوان..... کراچی

پیاری نجم! سدا سہاگن رہو، پچھلی بار آپ کے خط کا جواب نہیں دے سکی۔ یوں سمجھ لیں آنکھ سے ادھمکل ہو گیا تھا یا جگہ کم تھی خیر اس بار جواب حاضر ہے۔ کرونا وائرس نے سب کو ہی مفلوج کر کے رکھ دیا ہے گوکہ اب حالات پہلے سے بہتر ہیں لیکن احتیاط ضروری ہے اور اس سے بہتر کوئی علاج نہیں۔ آپ کے شوہر نامدار کا جان کرافسوس ہوا۔ اللہ سبحان و تعالیٰ ان کو صحت کا ملہ دے جلد عطا فرمائے آمین۔

ماہانیا مست علی..... لاہور

پیاری ماہا! سدا آباد رہو، آپ کی جانب سے تحریر ”خالی ہاتھ“ موصول ہوئی، پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کو ابھی محنت کی ضرورت ہے اور ہزار بار کہا ہے کہ نوٹو انٹیمت کہانی قابل قبول نہیں ہوتی اصل مسودہ ارسال

تاخیر سے جواب دے رہی ہوں۔ شادی کا احوال پڑھ کر اپنا وقت یاد آ گیا اس وقت پارلر تو نہیں ہوتے تھے البتہ گھر پر ہی بہنیں یا سہیلیاں تیار کر دیتی تھیں، سادگی کا دور تھا۔ ڈھولک، گانے اور مہندی نکاح اور پھر رخصتی ہو گئی۔ یوں نئے گھر سے نئی زندگی کا سفر شروع ہو گیا تھا ایک خوف ہر انسان کے اندر ہوتا ہے یا شاید سب لڑکیوں کے اندر کہ نجانے اب کیا ہوگا، الارم بجتا رہتا ہے۔ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شوہر کو سمجھنے کی کوشش کریں، محبت سے گھر کو بسائیں گی تو کوئی درمیان میں نہیں آئے گا اور پھر سب سے بڑھ کر خالہ کا گھر ہے اور خالہ تو پھر ماں پر تو ہوتی ہے۔ گو کہ رشتہ بدل جانے سے فرق ضرور آتا ہے پر اپنے دل میں فرق نہیں آنے دین تو سب ٹھیک رہے کارٹھنے بنانا اور انہیں نہانا آنچل سے سیکھ ہی لیا۔ اب اہل زندگی میں بھی عمل لائیں۔ اللہ سبحان و تعالیٰ دے دے کہ خوشیوں و راحت سے آپ کا دامن بھر دے اور اپنے گھر میں سرخرو کرے، آمین خوش رہیں۔

کوثر خالد سودا... جڑا نوالہ

پہلی کسی قاری نے لکھا تھا کہ کوثر آنچل کی رافقہ ہے۔ اس نے ٹھیک ہی لکھا تھا جس محبت سے آپ آنچل میں شرکت کرتی ہیں اور ہر ایک کے لیے فکر مند رہتی ہیں یہ اچھی بات ہے کہ اس دور میں بھی بے غرض محبت کرنے والا کوئی ہے جو اپنی مصروفیت میں بھی ہر ایک کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھتا ہے اور آپ کی دعاؤں سے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ جس محنت سے اپنے گھر کو چلا رہی ہیں اور پوتوں کو پڑھا رہی ہیں یہ ایک اچھا کام ہے۔ ان شاء اللہ حالات بہتر ہونے ہی جلد آپ کے بیٹے کو نوکری مل جائے گی۔ دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔

خوش سرانوالی..... سیالکوٹ

پیاری خوشی! جگ جگ جیو، یوں تو آپ ہر ماہ ہی آنچل میں شامل ہوتی ہیں اور اپنی نگارشات سے آنچل کو سجاتی ہیں پر اس بار آپ کی جانب سے ڈاک تاخیر سے موصول ہوئی۔ آنچل تکمیل کے مراحل میں ہے اس لیے آپ کی ڈاک آئندہ ماہ شامل کر لی جائے گی امید ہے کہ حالیہ پرچے پر تبصرہ لکھ کر ارسال کر دیں گی۔

جنت ایمان چودھری..... گجرات

پیاری جنت! سدا شاد رہو، آپ کا خط موصول ہوا، آپ لکھنا چاہتی ہیں ضرور لکھیں اور سب سے پہلے مختصر تحریر ارسال کر دیں تاکہ آپ کا انداز تحریر جان سکیں، موضوع کا انتخاب اور اس پر گرفت ہی آپ کے افسانے کو بہتر بنا سکتی ہے۔ امید ہے کہ جواب پڑھ کر آپ جلد ہی تحریر لکھ کر ارسال کر دیں گی۔

کائنات..... کراچی

پیاری کائنات! جگ جگ جیو، آپ کی تحریر دنیا موصول ہوئی پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کو لکھنے کے لیے بہت زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ اس لیے لکھنے کے عمل کو وقتی طور پر ترک کر کے اپنا مطالعہ وسیع کریں اور نامور افسانہ نگاروں کو پڑھیں تاکہ لکھنے میں مدد ملے پہلے کمپوز کرنے کے بجائے صفحات پر اپنی تحریر لکھیں اور ہمیشہ اوپر والے پیرا گرام کو پڑھ کر دوسرا پیرا گراف لکھیں تاکہ تسلسل قائم رہے، امید ہے تسفی ہوئی ہوگی۔

روبی حمید..... کراچی

پیاری روبی! جگ جگ جیو، کہانی شائع ہونے پر مصنفین کو اعزازی پرچا ادارے کی جانب سے ارسال کیا جاتا ہے پر آپ غالباً گھر تبدیل کر چکی ہیں



اس لیے ادارے کی جانب سے ارسال کردہ اعزازی پرچا دفتر کو واپس موصول ہو گیا ہے۔ آپ برائے مہربانی فوری دفتر کے نمبر پر رابطہ کر کے اپنا مکمل پتا لکھوا دیں۔

قابل اشاعت :-  
تیسرا حصہ، گل حزیں، آنچل کی کہانیاں، شکر کا شربت، بے نشان جزیرے۔  
ناقابل اشاعت :-

عزت کی تلاش، آبرو، محبت بوجھ کیوں بنی، ادھاری زندگی، پھر یوں ہوا، خالی ہاتھ، سراب، دنیا، نبی رحمت، دکھیا رے دل، چھین ہم ساتھ ساتھ، بند دروازے، پازیب، سزا، من جوں، بغاوت، میں

www.naeyufaq.com

### مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف خوش خط لکھیں۔ ہاشیہ لگائیں صفحہ کی ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور صفحہ نمبر ضرور لکھیں اور اس کی فونو کا پی کرا اپنے پاس رکھیں۔

☆ قسط وار ناول لکھنے کے لیے ادارہ سے اجازت حاصل کرنا لازمی ہے۔

☆ نئی لکھاری ہمیں کوشش کریں پہلے افسانہ لکھیں پھر ناول یا ناولٹ پر طبع آزمائی کریں۔

☆ فونو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ ادارہ نے ناقابل اشاعت تحریروں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ کوئی بھی تحریر نیلی یا سیاہ روشنائی سے تحریر کریں۔

☆ مسودے کے شروع میں کہانی اور اپنا نام لکھیں اور آخری صفحہ پر اپنا مکمل نام پتا اور رابطہ نمبر خوش خط تحریر کریں۔

☆ کہانی ای میل کرنے کے لیے ایچ کی فائل ہو ایم ایس ورڈ کی فائل میں اردو میں لکھیں تحریر ہونی چاہیے یا یونی

کوڈ پر ہو۔ کہانی کے نام سے فائل کا نام رکھنا ہوگا۔ کہانی کے شروع میں کہانی اور اپنا نام لکھیں اور آخر میں اپنا پورا نام مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی لکھنا ہوگا۔

☆ ای میل چاہے کہانی کی کرنی ہو یا مستقل سلسلوں میں ہمیشہ نیو ای میل کا انتخاب کریں اور سبجیکٹ میں کہانی اور

سلسلے کا نام لکھیں۔ جوابی میل پر کچھ بھی ای میل نا کریں اگر جوابی میل پر کچھ بھی ای میل کیا جائے گا وہ قابل قبول نہیں

ہوگا۔ editor\_aa@naeyufaq.com

☆ ای میل پر کہانی یا مستقل سلسلے میں شرکت کے لیے اسکیں 'امیجر' روٹن یا پی ڈی ایف قابل قبول نہیں ہوتی۔

☆ دیگر سوشل ایپ پر بھی کہانی یا سلسلوں کی کوئی بھی چیز قابل قبول نہیں ہوگی۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ اک یا کوریئر کے ذریعے ارسال کیجئے۔ 81 پیپر بیرکس ہاکی کلب آف پاکستان

اسٹیم نزل آنچل پریس کراچی 75510

# بیجا آتما

مشتاق احمد قریشی

اسلام میں عبادات و معاملات ایک دوسرے سے غیر متعلق نہیں بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اگر ہم انسانوں سے عمدہ معاملہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کریں۔ معاملہ میں حسن توازن اور عدل کا حکم رب العزت نے دیا ہے اور ان کا بیان صرف سمجھانے کے لیے الگ الگ کیا گیا ہے۔ حقیقت میں معاملات بھی تو عبادت ہی ہیں۔ فرائض و احکام الہی میں سے کسی ایک سے بھی انحراف و انکار اللہ کے ساتھ کئے گئے عہد و معاہدے کی خلاف ورزی ہوگا اور اللہ تعالیٰ تو صاحب اختیار و اقتدار ہونے کے باوجود انسان کو آخرت کے خطرے سے آگاہ فرما رہا ہے دیکھو کوئی ایسا غلط کام نہ کرنا جس سے تمہاری نجات آخرت خطرے میں پڑ جائے۔ تمہیں شدید نقصان سے دوچار ہونا پڑے کہ قیامت پر ہاپونے کے بعد روزِ حشر کوئی کسی کا کام نہیں آئے گا۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی نہ باپ اپنی اولاد کے کسی کام آسکے گا نہ اولاد اپنے باپ کے کام آسکے گی۔ اس لیے اپنی آخرت کے لیے جو کچھ کرنا ہے خود ہر انسان کو ہی کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے کرم کے اپنے رحم و فضل کے دروازے کھولتا چلا جا رہا ہے اور فرما رہا ہے کہ اوصراطِ مستقیم کی طرف کہہ بی نہیں تمہاری اصلی اور دائمی زندگی کے پر اسٹار راحوں و نعمتوں سے بھرے ہوئے ٹھکانوں تک پہنچانے والی ہے۔ اس کے علاوہ ہر راہ ہر راستہ جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رکھتا وہ تو بتاتا جتنا چلا جا رہا ہے کہ تمہارے کسی نیک عمل کی کیا جزا اور بد عمل کی کیا سزا ہوگی۔ اس ذاتِ عالی نے انسان کو یہ اختیار بھی عطا کیا ہے کہ وہ اپنی بھلائی اور بہتری کا انتخاب خود کرے طریقے اور تدابیر اس نے خوب اچھی طرح سمجھا دی ہیں۔ یہ تو خود انسان کی بدقسمتی ہی ہوگی کہ وہ سب کچھ سمجھتے جانتے بوجھتے ہوئے خود اپنے پر ظلم کرے اور اپنے لیے جہنم کی آگ و عذاب کا انتخاب کرے انسان تو خود اپنے اعمال و افعال سے خسارہ اٹھاتا ہے۔

ترجمہ۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان لاتے ہیں وہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ (الانعام۔ ۹۲)

تفسیر۔ آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ انسانی نفسیات کو اجاگر فرما رہا ہے کہ جب انسان کے دل میں اللہ کا خوف آخرت کا خوف اور قیامت کے قیام کا یقین پیدا ہو جاتا ہے تو وہ لوگ صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے اللہ کی کتاب قرآن حکیم کو اپنا لیتے ہیں اور اسی سے ہدایت حاصل کرتے ہیں اور صراطِ الہی کے مطابق اپنی اطاعت و بندگی کا اظہار نماز کی صورت اللہ سے اپنا تعلق قائم کر کے کرتے ہیں اور انہیں یہ یقین بھی ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کا ایک دن خاتمہ ہونا ہے اور دنیا کا بھی خاتمہ ہونا ہے۔ قیامت کے بعد حشر کا میدان لگے گا جہاں اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و قدرت سے تمام انسانوں کو بلا کر اپنے سامنے جمع کرے گا تاکہ ان کی دنیا میں کی گئی تیاری کے اور ان کی اپنی طلب کے مطابق ان کا حساب کتاب کر کے انہیں آخرت کی زندگی میں داخل فرما دے۔ جب انسان ایمان لاتا ہے اور دعوتِ حق قبول کر لیتا ہے تو اس کی رہنمائی کے لیے قرآن کریم موجود ہے۔ اہل ایمان اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں کیونکہ نماز اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرتی ہے اور روزِ محشر نجات و بخشش کا ذریعہ بنتی ہے۔ اگر ہم اسے یوں سمجھیں کہ نماز اہل ایمان کے لیے آخرت میں اچھا پر اسٹار گھر الاٹ کرنے کے لیے الاٹمنٹ آرڈر کا کام کرتی ہے تو غلط نہ ہو۔ نماز ہی مسلمان کو فواہش اور منکرات سے بچاتی ہے اور اسلام و کفر کے درمیان خط فاصل کا درجہ رکھتی ہے

ترجمہ۔ اور یہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور قیامت کے پیش آنے کو بھٹلایا ان کے سب کام عارت گئے۔ ان کو وہی

سزا دی جائے گی، جو کچھ یہ کرتے تھے۔ (الاعراف۔ ۱۷۷)

تفسیر۔ آیت مبارکہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جن لوگوں نے آیات الہی یعنی قرآن کریم کی تکذیب کی اور آخرت سے انکار کیا ان کے سب کام سب اعمال غارت یعنی ختم ہو جائیں گے چونکہ ان کے عمل کی اساس عدل و حق پر نہیں ظلم و باطل پر ہے اس لیے ان کے نامہ اعمال میں بھی شر ہی شری ہوگا جس کی کوئی قیمت کوئی صلہ اللہ کے یہاں نہیں ہوگا ہاں ان کے شر ان کی برائی کا بدلہ ضرور ان کو عذاب الہی کی صورت میں بطور سزا ملے گا۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں انسانی اعمال کو بخش کے بار آور ہونے کا دو باتوں پر انحصار ہے ایک یہ کہ تمام اعمال قانون الہی شرعی پابندیوں کے مطابق ہوں اور دنیا کی کامیابی کے بجائے آخرت کی کامیابی پیش نظر ہو۔ یہ دونوں شرطیں جہاں پوری نہیں ہوں گی وہاں لازماً اللہ کی راہ سے ہٹ کر اللہ کی ہدایات سے بغاوت اور منہ موڑ کر عمل کئے گئے ہوں گے۔ ظاہر ہے ایسے تمام سرگشی اور باغیانہ اعمال کے اجر کی توقع کرنا حماقت ہی ہوگی یہ کیسے ممکن ہے کہ غلام اپنے آقا کی نافرمانی بھی کرے اور اس سے صلے میں جزا و انعام کی توقع بھی کرے جب انسان احکام الہی کے خلاف عمل کرے گا تو وہ خود کو سزا کا مستحق بنالے گا اور اس طرح جہاں وہ اپنی دنیا کی زندگی برباد کرتا ہے وہ اپنی آخرت بھی خراب کر لیتا ہے۔

جو لوگ اللہ کی اطاعت و بندگی نہیں کرتے اور سرگشی اختیار کرتے ہیں دراصل ان کی روح منح ہو چکی ہوتی ہے اور وہ شیطان کی راہ کو اپنا چکے ہوتے ہیں اور ایسے لوگوں کے اعمالی قوانین الہی اور شریعت کے خلاف ہوتے ہیں پھر چاہے کتنے ہی مسخو کن اور خیرہ کن کیوں نہ ہوں وہ سب کے سب حقیقت میں بے معنی و بے اثر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی غفلوں کے بارے میں آیت مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ ان کے تمام اعمال غارت ہو جائیں گے اور ان کو وہی سزا دی جائے گی جس کی انہوں نے اپنے اعمال سے خود تیاری کی ہوگی کیونکہ وہ تو شیطان کی راہ پر لگ کر احکام الہی اور آیات الہی کے منکر و مخرف ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ اہل حقیقت (جو اس عارضی دنیاوی زندگی کے خاتمے کا سبب بننے والی ہے) قیامت۔ اس کو بھی بھلا بیٹھے تھے اور اس کا بھی انکار کرتے ہیں اور یوں وہ خود اپنے پیروں پر کھڑائی مار لیتے ہیں اور دنیا کی حرص و ہوس میں بڑکرائی آخرت غارت کر لیتے ہیں۔

ترجمہ۔ اور آخرت والا گھران لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ رکھتے ہیں پھر کیا تم نہیں سمجھتے۔ (الاعراف۔ ۱۶۹)

تفسیر۔ آیت مبارکہ کے اس حصے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لیے آخرت کا گھر ہے یہ بات تمام ایسے لوگوں کو سمجھنی چاہیے جو دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ کر جانے تو جھٹے آخرت سے غفلت برتتے ہیں ایسے ہی لوگوں کی آگاہی کے لیے بار بار تاکید و ملامت مسلسل کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے جاری فرما رکھا ہے کہ لوگ سمجھ سکیں اور اپنی دنیاوی زندگی میں اصلاح کر کے صراطِ مستقیم پر چلنے کا اہتمام کر لیں کیونکہ یہ حقیقت بھی روشن ہے کہ نہ تو کسی کا کسی بھی طرح اللہ پر زور چلتا ہے نہ چل سکتا ہے اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ کسی رشتے نامتی کی وجہ سے انسان قیامت کے دن سزا سے بچ سکے اور جنت کا حقدار بن سکے۔ لیکن جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں اور اپنے اعمال بدوار گنہوں کی سزا کا احساس کرتے ہوئے اللہ سے توبہ اور مغفرت مانگتے ہیں اور احکام الہی کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں تقویٰ اختیار کرتے ہیں تو ایسے ہی افراد کو اللہ مغفرت کی خوش خبری سنارہا ہے۔

آخرت کی فکر اور اس کی تیاری اسلام کا محور و مرکز بھی ہے اور بنیادی عقیدہ بھی یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی اس پیمان خیز کشمکش میں صرف آخرت کی فکر اور آخرت کی سزا و جزا پر ایمان ہی انسان کے لیے سکون کا سبب بن سکتا ہے۔ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں وہ تمام دنیاوی آلائشوں آلودگیوں سے بچے رہتے ہیں اور دین حق پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ احکام الہی اور اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے دل مطمئن ہوتے ہیں پھر بھی آخرت کی کامیابی کے لیے اللہ سے لڑنا اور بخشش کے ہمیشہ طلب گار رہتے ہیں۔

انسان کے نفس اور اس کی عملی زندگی کی اصلاح صرف فکر آخرت کے ذریعے ہی ہوتی ہے ورنہ تو وہ شیطان کے بہکائے میں پھنس کر ہر عمل کر گزرتا ہے جو اسے جنت سے دور اور دوزخ کے قریب کر تا چلا جاتا ہے۔ تقویٰ ہی انسان کو ہر کم طمع لالچ اور دوسروں کے مال پر دست درازی سے روکتا ہے اور اس کی زندگی کو پر کشش و مطمئن بناتا ہے۔ ایسے ہی پاک باز

اور متقی لوگوں کو خبر سنائی جا رہی ہے کہ وہ دنیا کی سختیوں اور شیطانی وسوسوں سے گھبراہٹیں نہیں ان کے لیے اللہ نے روزِ آخرت بڑے اجر کا انتظام کر رکھا ہے۔

ترجمہ۔ تم تو دنیا کے مال (فائدے) چاہتے ہو اور اللہ کا ارادہ آخرت (کا اجر عطا کرنے) کا ہے اللہ زور اور حکمت والا ہے۔ (الانفال۔ ۶۷)

ترجمہ۔ ہاں یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے اور کچھ نہیں اور جو کچھ انہوں نے یہاں کیا ہوگا وہاں سب اکارت جائے گا اور جو کچھ ان کے اعمال تھے سب برباد ہونے والے ہیں۔ (ہود۔ ۱۶)

تفسیر۔ دونوں آیات کا مفہوم ایک ہی ہے کہ جن لوگوں کے پیش نظر شخص دنیا اور اس کے فوائد ہوں وہ اپنی دنیا بنانے کی جیسی کوشش یہاں کرتے ہیں ویسا ہی اس کا پھل انہیں ملے گا کیونکہ ان کے پیش نظر صرف دنیا ہی دنیا رہی تھی۔ اس کی طلب کی کوشش کرتے رہے تھے اس لیے انہیں جو کچھ ملنا ہوگا وہ دنیا میں ہی دے دیا جائے گا۔ آخرت میں صلہ پانے کے لیے اگر کوشش کی ہوتی تو اس کا صلہ ملتا۔ دنیا کا سارا سامان انسان کی موت تک ہی اس کا ساتھ دیتا ہے اور اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی سب کچھ اس کے لیے بیکار ہو جاتا ہے جو کچھ اس نے زندگی بھر کمایا یا بچا تھا وہ سب اسی دنیا میں رہ جاتا ہے۔ اس نے ساری محنت دنیا کے لیے کی تھی اس لیے اس کی ساری کمائی دنیا میں ہی رہ جائے گی جس طرح اس نے دنیا کمانے کے لیے سخت محنت مشقت کی تھی اگر وہ ساتھ ساتھ اپنی آخرت کا بھی خیال رکھتا اور آخرت کے لیے بھی کچھ کمائی کرتا تو یقیناً اس کی محنت ضائع نہ ہوتی۔ یہ تو قانونِ فطرت اور مشیتِ الہی ہے کہ ہم جو بویں گے ویسی فصل تیار ہوگی یہ ممکن نہیں کہ بویا تو کیکر جائے اور پھل ملے آم۔ یہ قانونِ الہی ہے اس سے کسی طرح انحراف نہیں ہو سکتا ہاں اگر اللہ چاہے تو سب کچھ ممکن ہے لیکن جو لوگ دنیا طلب کرتے ہیں اللہ انہیں ان کی طلب پر دنیا عطا کر دیتا ہے لیکن آخرت ان کی خراب ہوتی ہے سوائے عذاب اور آگ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ بنی اسرائیل آیات ۱۸-۱۶ اور سورہ شوریٰ آیت ۲۰ میں بھی بیان ہوا ہے۔

ترجمہ۔ اور وہ آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ (ہود۔ ۱۹)

ترجمہ۔ بے شک یہی لوگ آخرت میں خسارے میں رہیں گے۔ (ہود۔ ۲۲)

تفسیر۔ جو لوگ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کی جگہ ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے ہیں اللہ کی اطاعت کی جگہ وہ دنیا کے لوگوں کی اطاعت و بندگی میں لگے رہتے ہیں وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے ہیں اور یوں دنیا و آخرت دونوں کے خسارے سے دوچار ہوتے ہیں اور دنیا و آخرت دونوں کو اپنے لیے تباہ و برباد کر لیتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اہل ایمان اعمالِ صالح کے ذریعے نہ صرف اپنے رب کو راضی کرتے رہتے ہیں اور آخرت کی تیاری میں لگے رہتے ہیں وہ نہایت سکون، اطمینان سے اپنے رب کی طرف متوجہ رہتے ہیں جبکہ منافقان شرک و کفر کرنے والوں کو آخرت سے نہ کوئی دچکائی ہوتی ہے نہ اس کی تیاری کرتے ہیں۔ وہ خود تباہی کے گڑھوں میں گرتے چلے جاتے ہیں اور آخرت میں بھی یہی لوگ خسارے میں رہتے ہیں کیونکہ متقی لوگ تو جنت نشین ہوں گے اور اناغفلت نشینوں کی خاطر مدارت کے لیے جہنم کی آگ بھڑک رہی ہوگی تا کہ جلد از جلد ان کو لپک لے۔ جہنم کے عذاب ہوں یا جنت کے مزے آخرت کی زندگی چونکہ دائمی اور کبھی ختم نہ ہونے والی ہوگی کیونکہ روزِ حشر اللہ کے حکم سے موت کو بھی موت آپچی ہوگی اس لیے چاہے وہ جنت کی رانیں لذتیں ہوں یا جہنم کی آگ عذاب و سزا سب کے سب کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے والا ہوگا یہ نہیں کہ اس فانی دنیا کی طرح گولی لگی مرے گا قصہ تمام یا آگ میں جل مرے گا تو کہانی ختم لیکن یہ بات ضروری اور یاد رکھنے والی ہے کہ آخرت کی زندگی میں سب کچھ مسلسل دائم و قائم رہے والا ہوگا یہ نہیں کہ روزِ آخر کی آگ نے جلا کر خاک کر دیا اور عذاب و سزا ختم نہیں ایسا نہیں ہوگا عذاب بھی مسلسل اور کبھی ختم نہیں ہونے والا ہوگا۔ اللہ ہر مسلمان کو اپنی پناہ عطا فرمائے آمین۔

(جاری ہے)



# ہمسرا لاچل

کنول ناز

والدین اور بچوں میں دوستی جیسا ارشہ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ آپ سے ہر بات شیئر کر سکے۔

۷۔ بشر سے بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں۔ انسان کبھی بھی حقوق اللہ بھرپور طریقے سے ادا نہیں کر سکتا مگر کوشش ضرور ہونی ہے کہ اللہ کا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرے اور جہاں تک بات ہے حقوق العباد کی تو ان کی ادائیگی کا بہت خیال رکھتی ہوں کیونکہ حقوق العباد تب تک معاف نہیں ہوتے جب تک حق دار معاف نہ کرے۔

۸۔ پرفیکٹ کوئی نہیں ہوتا، سب میں خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں اسی طرح مجھ میں بھی ہیں۔ پہلے آتے ہیں خامیوں کی جانب تو جناب غصہ بہت آتا ہے اور جلد اترا تا بھی نہیں۔ ضدی ہوں اور خوبیاں حساس اور نرم دل ہوں معاف کر دیتی ہوں اگر کوئی دکھائے مگر شکوکا دینے والوں سے نفرت ہے۔

۹۔ خوشی کے موقع پر دل سے خوش ہوتی ہوں اور سب کے ساتھ مل کر انجائے بھی کرتی ہوں، عیدین رمضان اور تمام تہواروں سے منائی ہوں، غم میں برداشت دھیر سے کام لیتی ہوں کسی غم شیئر نہیں کرتی بس تنہائی میں رو کے بوجھ کم کرتی ہوں۔

۱۰۔ محبت پر یقین ہے کیونکہ مجھے میرے ماں باپ، بھائیوں، دوستوں سے شدید محبت ہے جہاں تک بات صنف نازک کی تو مجھے اس محبت پر یقین نہیں کیونکہ آج کل کی صنف نازک کی محبت نرا لٹوکا ہے۔

۱۱۔ وعدے بے وفا کے چاہت جسم کی اگر یہ عشق ہے تو ہوں گے کہتے ہیں اگر ارادوں میں غلبہ ہو تو خدا ایسی محبت سے بچائے رکھے یا مین۔

۱۲۔ ہمارے گھر میں فیصلہ تو بابا جان کرتے ہیں مگر سب کے مشوروں سے سب کو بٹھاکے بات کرتے ہیں سب کی رائے لیتے ہیں جس کی بات درست ہو اسے مانتے ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ ان کے فیصلے کبھی غلط نہیں ہوتے مجھے اپنے بابا پر فخر ہے خدا ہمیشہ ان کو سلامت رکھے یا مین۔

۱۳۔ باہمی تو گزرا زمانہ ہے مگر کوئی اچھی عادت جو باہمی میں چھوڑ دی ہو کوشش کروں گی کہ اسے دوبارہ اپناؤں حال کو خوش گوار طریقے سے گزاریں۔ مستقبل کی کوئی پلاننگ نہیں کی، کبھی آج اچھا کر جائے کل کی کل دیکھیں گے نہ جانے زندگی کتنی ہے۔

زیست کے موجودہ لمحے کر خوشگوار ناز

۱۔ الحمد للہ میری زندگی اب تک تو خوشگوار رہی ہے مگر سب سے زیادہ بچپن پسند تھا۔ بے فکری کبھی تب مل کر کھانا، کھینا، دوستوں کے ساتھ ہنسنا، رونا کیا دور تھا مگر اب کبھی کبھی ہم اسی دور میں چلے جاتے ہیں۔ خوب مومن مستی کرتے ہیں بچوں کے ساتھ مل کر۔

۲۔ بہت ذہن اور لائق طالب علم تھی ہمیشہ اے پلس سے کامیابی ملی جہاں تک بات ہے غیر نصابی سرگرمیوں کی تو میرے خیال میں ان سے انسان کا کنفیڈنس بڑھتا ہے میں ہیڈ مائن پلیر ہوں اور ڈیوٹی اور دونوں میں سیکنڈ پوزیشن بھی تحصیل بھر میں غیر نصابی سرگرمیاں، بہت ضرور ہیں میری تمام گزراؤں سے ریکورسٹ ہے کہ غیر نصابی سرگرمیوں میں ضرور حصہ لیں۔

۳۔ مجھے ریاضی سخت ناپسند ہے مگر ہمیشہ ریاضی میں 80 سے زیادہ مارکس لیے مگر پتا نہیں عجیب سی چڑ ہے ریاضی سے دل کرتا ہے ریاضی ایجاد کرنے والے کو دنیا سے رخصت کر دوں مگر پھر خود ہی سوچ کر ہستی ہوں کہ وہ تو نہ جانے کب کا دنیا سے رخصت ہو چکا ہوگا۔ ہا ہا ہا ہا۔

۴۔ میں اپنی تعلیم سب میں بانٹ کر کام میں لاتی ہوں، ٹیوشن بھی پڑھاتی ہوں اس کے علاوہ پیٹنٹنگ بنا کر اسکولز کو دیتی ہوں جو مختلف رومز میں لگائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کوشش کرتی ہوں کہ خود زیادہ سے زیادہ اپنے علم پر عمل کروں۔

۵۔ میرے خیال میں، میں ایک خوش نصیب طالب علم تھی کہ مجھے انتہائی اچھی اساتذہ ملی آج میں جو ہوں ان کی وجہ سے ہوں مجھے سب سے عقیدت اور محبت ہے مگر سب سے زیادہ مجھے مس نجمہ شاہ نے متاثر کیا۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ ان کو فوٹو کروں اس کے علاوہ جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا میں سب کی عزت کرتی ہوں۔

۶۔ پابندیاں حد سے زیادہ ہوں تو بچوں کی شخصیت متاثر ہوتی ہے مگر آپ پر کوئی پابندی نہ ہو تو آپ باغی بن جاتے ہیں سو پابندیاں ہونی ہی چاہیے مگر کسی حد تک اور سب سے بڑھ کر



بلبل، کتا، کاکڑ، سانپ کسی سے نہیں ڈرتے انکیٹ، ہم تو لاشی  
اٹھا کے دھلائی کرتے ہیں تو تب بھی ہم ایسا ہی کریں گے اور  
خوب درگت بنائے گے جو بھی سامنا آیا ان میں سے البتہ  
مہمانوں کا کچھ کہہ نہیں سکتے، کہیں ڈر کے بھاگ ہی نہ جائیں،  
بلبل۔۔۔۔۔

۲۰۔ مہمان اللہ کی رحمت ہیں سوتقید اور برائی تو میں نے کبھی نہیں کی ہاں مگر اگر کسی کی اچھائی سے متاثر ہو جاؤں تو تعریف ضرور کرنی ہوں اور مجھے بس مہمان عورتوں میں ایک چیز بری لگتی ہے منہ چومنے والی اس لیے جب تک مہمان خواہن سکون سے بیٹھنے جائیں اپنے بچاؤ میں لگی رہتی ہوں۔

۲۱:- باتونی لوگ میں خود بہت باتونی ہوں مگر گھر کی حد تک گھر سے باہر تو ہم ڈیڈ سنٹ اور بڑے سمجھدار بنے ہیں اگر کوئی مجھ سے زیادہ باتونی ہو تو خاموشی سے سنتی ہوں۔ ہوں ہاں میں جواب بھی دیتی ہوں، ایک دم سے منع نہیں کرتی کیونکہ کسی کا دل توڑنا مجھے پسند نہیں۔

۲۲۔ وطن سے بہت پیار ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں پاکستانی ہوں مجھے آرمی میں جانے کا بہت شوق ہے جو پورا ناپا ہو گا مگر پھر بھی میں ہر وقت اپنے وطن کے لیے شہید ہونے کو تیار ہوں کیونکہ۔

لہو جو ہے شہید کا وہ تو مکی زکوٰۃ ہے  
 شہید کی جموت ہے وہ تو مکی حیات ہے  
 میرے وطن کو جب جب میری ضرورت ہوگی تو میں اپنی  
 آ کر سانس تک شاکر کر لوں گی۔

۳۳: زندگی کا ہر لمحہ خوب صورت ہوتا ہے اگر ہم دل سے جے تو میری زندگی بہت خوب صورت اور مکمل ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ اپنے والدین کے لیے کچھ کروں اور اگر اللہ نے چاہا تو ضرور میں اپنے والدین کو جگہ کر اؤں گی۔ اس لمحے کا مجھے شدت سے انتظار ہے چلیں جی بہت برداشت کیا آپ نے ہمیں اب اجازت دیں کیسا لگا مجھ سے مل کر بتائیں گا ضرور خرابی کسی کو اپنی صفائی مت دو کیونکہ جو آپ کا ہے اسے ضرورت نہیں جو آپ پر یقین نہ رکھتا ہو وہ دمانے کا نہیں، اللہ حافظ۔

۱۹۔ بابا بابا ہوائی پہلے تو ایسا کبھی ہوا نہیں اگر کبھی ہوا تو ہم جوہا،

# چراغِ دل

## رابع افکار

آزمائش رشتوں میں ضروری ہوتی ہے  
نہ مل پانا کسی کی مجبوری ہوتی ہے  
یاد تو دور سے بھی کر سکتے ہیں لیکن  
مل کے ہی دل کی حسرت پوری ہوتی ہے

اللہ حافظ کہہ کر ان سے پہلے باہر نکل گئی تھی۔  
”صبح تو تم کہہ رہی تھی کہ بیچر کی اشد ضرورت ہے۔“  
وہ آفس کو لاگ لگا رہی تھی کہ اسود نے حیرت سے پہلے  
عائلہ کو اور پھر عزت کو دیکھا جواب اسکول کے احاطہ سے  
باہر نکل کر رکشہ روک رہی تھی۔

”ہاں لیکن اسے دیکھتے ہی مسز ہاشمی کی عقل پر ماتم  
کرنے کو جی چاہ رہا تھا میرا تو دل کر رہا تھا کہ اس کی سی وی  
اٹھا کر اس کے منہ پر دے ماروں کہ بی بی بیچنگ کے لیے  
آئی ہو یا ماسی کی نوکری کے لیے..... بھتی حد ہوتی  
ہے..... میرے اسکول کی ماسی بھی اس سے بہتر حلیے میں  
آئی ہے۔“ عائکہ نے غصہ سے کہا۔ اپنے گولڈن بالوں  
سے سن گلاسز کو اتار کر آنکھوں پر ٹکاتے ہوئے وہ گاڑی کی  
طرف بڑھ رہی تھی۔

”تم جم سے آئے تھے تو بایک پر ہو گے ناں؟“ اس  
نے گاڑی کی چابی اسود کی طرف اچھالی اور خود آرام سے  
دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

”ہاں..... بایک پڑا تھا۔“ اس نے ڈرائیونگ سیٹ  
سنبھال لی۔

”السلام علیکم۔“ میزمر آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا وہ  
ایک عام سی لڑکی تھی۔ فائل کو سینے سے لگائے چادر میں سمٹی  
سمٹائی آفس میں داخل ہوئی تھی۔

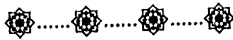
”وعلیکم السلام! آئیے بیٹھیے پلیز۔“ عائکہ نے اسے  
بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسود نے کتاب اٹھا کر باہر کی طرف قدم  
بڑھائے تھے کہ جب عائکہ نے آواز دے کر اسے بھی  
روک لیا۔

”سنو اسود..... ایک منٹ روکو پلیز..... مجھے دیر ہو رہی  
ہے میں ساتھ ہی چلوں گی اینڈ مس؟“ اس نے بات  
کرتے ہوئے اس لڑکی کی سمت دیکھا۔

”عزت..... عزت فاطمہ۔“ وہی میزمر آواز۔

”عزت..... بات یہ ہے کہ میرے پاس فی الحال  
وینکس نہیں ہے مجھے مسز ہاشمی نے آپ کے بارے میں بتایا  
تھا میں سی وی رکھ لیتی ہوں اور کوشش کروں گی کہ جلد ہی  
آپ سے کامیاب کر لوں..... دراصل میری اپائنٹمنٹ ہے  
ڈیمنٹس کے پاس تو.....“ عائکہ نے اٹھتے ہوئے بیک کو  
کندھے پر ٹکایا عزت کے چہرے پر مایوسی کے گہرے  
بادل چھا گئے تھے وہ ڈاکومنٹس رکھ کر اثبات میں سر ہلاتی

مرکوز کردی۔ عائلہ اسود کی بہن تھی، اس کا اپنا پرائیویٹ اسکول تھا جو اپنی پڑھائی اور معیار کی وجہ سے علاقے میں بہت مشہور تھا..... عائلہ کی ساس حیات نہیں تھیں، سر زیادہ وقت اپنی بیٹی داماد کے پاس انگلینڈ میں ہوتے تھے، جب پاکستان آئے تو عائلہ کی مصروفیات کی وجہ سے گھبرا کر ایک دو ماہ رہ کر پھر واپسی کی تیاری پکڑ لیتے..... عائلہ کا شوہر زوہیب ڈاکٹر تھا اولاد نہیں تھی عائلہ کا زیادہ وقت اسکول اور مکے میں ہی گزرتا تھا۔ اسود کے ساتھ امی دادی اور چھو پورہتی تھیں، بابائرس کے سلسلے میں زیادہ تربیرون ملک ہی رہتے تھے۔ مانی طور پر انتہائی مستحکم فیملی تھی، چھو پو طلاق یافتہ تھیں یا بیوہ یہ راز ہی تھا جو اسود اور عائلہ پر نہ کبھی کھلاتھا نہ انہیں مجس ہوا تھا۔



”آگنی عزت..... آج بہت دیر کردی بیٹا۔“ تانی امی نے باورچی خانے سے باہر آتے ہوئے اسے دیکھا اور پھر گھڑی کو دیکھا۔

”تمہیں ڈراپ کر کے پھر آنا پڑے گا مجھے۔“

”ہاں پہلے تو ڈیٹسٹ کی طرف جاؤں گی..... دانت کے درد نے جان نکال رکھی ہے۔ ساری رات سو بھی نہیں سکی خیر تم مجھے گھر ڈراپ کر کے پھر آ جانا اپنی بائیک لینے۔“ وہ آرام سے موبائل دیکھنے لگی۔

”ہوں..... اوکے۔“

”مجھے وہ لڑکی ضرورت مند لگ رہی تھی، تم اسے رکھ لیتی اور سمجھا دیتی کہ ٹیچرز اور ماسی میں فرق ہونا چاہیے..... روٹی روزی کے لیے انسان اتنا تو کر ہی لیتا ہے۔“ گاڑی کو سڑک پر لاتے ہوئے یونہی رکشہ اسٹینڈ کی طرف دیکھا وہ بے چاری سواریاں پوری ہونے کے انتظار میں موٹر سائیکل رکشہ پر بیٹھی تھی۔

”تمہیں سمجھتے اس طرح کے لوگ اور تمہیں کیوں ہمدردی ہو رہی ہے اس سے..... کہو تو گھر پر ماسی رکھ لوں؟“ عائلہ نے تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے ساری توجہ ڈرائیونگ کی طرف



کی میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہیں..... میں تو بس اس گھر کی مشکلات دور کرنے کے لیے یہ سب کر رہی ہوں۔“ وہ چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔ تائی امی کے ہاتھ کی خوشبودار چائے پی کر اس کی دن بھر کی تھکن اترنے لگی تھی۔

”کھانے میں کیا پکا رہی ہیں خوشبو تو بہت اچھی آرہی ہے۔“ نان خطائی کو گرم چائے میں ڈبو تے ہوئے اس نے چولہے پر رکھی ہنڈیا کی طرف دیکھا..... اندر کے کچھ دکھ اور کچھ محرومیاں تھیں، کچھ سوال تھے جنہیں دبانے کے لیے دھیان بنانا ضروری تھا۔

”ہاں..... وہ اسماعیل قیہ لے کر آیا تھا، آلو قیہ بھون رہی ہوں۔“ وہ بھی مسکراتے ہوئے چائے پینے لگیں، ان کے نرم مہربان چہرے کی مسکراہٹ دیکھ کر عزت بھی مسکرا دی تھی۔

عشاء کی نماز ادا کر کے وہ معمول کے مطابق چھت پر چہل قدمی کر رہی تھی کہ اسماعیل آ گیا۔

”تم آج پھر گئی تھی جاب کے لیے؟“ وہ اس کے سامنے کھڑا ہوا۔

”جی گئی تھی..... آپ کو تائی امی نے بتایا تو تھا؟“ وہ اسماعیل کے غصے سے ڈرتی بھی تھی۔

”ہاں..... میں کوشش کر رہا ہوں ناں نوکری کے لیے..... مل جائے گی..... تمہیں کس نے کہا یوں سڑکوں پر خوار ہوتی پھرو..... مجھ سے پوچھا تم نے؟“ اس کی لال ہوئی آنکھیں عزت کو مزید خوف زدہ کر رہی تھیں۔

”گھر کی ضروریات، تاپا ابوکی دوائیوں کا خرچ، بل اور باقی کے اخراجات میں اگر میں تھوڑی سی مدد کروں تو کیا برا ہے؟“ وہ نظریں جھکائے، آہستہ سے بولی۔

”میری نظر میں برا ہے..... بہت برا..... باہر کی دنیا کتنی خراب ہے تم کچھ جانتی بھی ہو اس بارے میں؟ گھر سے نکل کر ملازمت کرنے والی عورتوں کے بارے میں لوگ کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں۔“ اس کا غصہ کم نہ ہو رہا

”میں چائے کے لیے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ خیر تو ہے ناں بیٹا؟“ ان کی فکر مندی دیکھ کر اس نے مایوسی کی خبر سنانا مناسب نہیں سمجھا۔

”جی تائی امی خیریت ہی ہے..... بس ذرا دیر ہو گئی رکشہ نہیں مل رہا تھا۔“

”اور وہ اسکول والے..... انہوں نے کیا کہا؟“ وہ اس کے پاس آ بیٹھیں۔

”نی لال سی وی رکھ لی ہے..... کہتے ہیں ضرورت ہوئی تو بتا دیں گے..... یہ اسماعیل بھائی کہاں ہیں؟“ اس نے بات کرتے ادھر ادھر دیکھا، اسماعیل کہیں نظر نہیں آیا تھا وہ جانتی تھی کہ وہ بھی اس کی طرح نوکری ڈھونڈنے ہی نکلا ہوگا۔

”بس بیٹا صبح گیا تھا پر اپنے سیٹھ صاحب کے گھر بقایا جات لینے، وہاں سے کچھ رقم ملی تو آتے ہوئے گھر کا کچھ سامان اور تمہارے تاپا ابوکی دوائیاں لے آیا..... پھر چائے پی کر پھر سے نکل گیا۔“ تائی امی اٹھ کر دوبارہ باورچی خانے میں چلی گئیں۔ باورچی خانہ کیا تھا برآمدے میں شیف ڈال کر چوہا رکھا گیا تھا اور ایک پرانی بغیر کواڑکی الماری میں برتن اور مسالوں کے ڈبے رکھے تھے۔ اسی برآمدے میں دو کرسیاں رکھ کر کڑی کا پرانا سی میز رکھ دی گئی تھی۔

”ہاتھ منہ دھو کر آ جاؤ چائے پی لو..... اسماعیل خستہ اور تازہ نان خطائیاں لایا تھا۔ تمہیں بہت پسند ہیں ناں؟“ تائی امی کی آواز پر وہ جی اچھا کہتی اٹھ گئی، ایک نظر عصر کی نماز پڑھتے تاپا ابوکو دیکھا اور پھر وہیں آ بیٹھی۔

”اسماعیل کو بالکل اچھا نہیں لگتا تمہارا نوکری کی تلاش میں جانا، بہت غصہ کر رہا تھا مجھ پر کہ میں تمہیں گھر سے نکلنے ہی کیوں دیتی ہوں..... ابھی یہ بات اسے سمجھ میں نہیں آرہی کہ تمہاری شادی اور جہیز کے لیے یہ ضروری ہے۔“ تائی امی نے چائے کا کپ تھماتے ہوئے بتایا تو وہ تڑپ اٹھی۔

”توبہ کریں تائی امی..... مجھے جہیز کی فکر ہے نہ شادی

تھا، اس بات پر عزت نے نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔

”کیا مطلب؟ اسماعیل بھائی..... کسی کی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے ناں اور لوگوں کا کیا ہے؟ لوگ تو ہر حال میں باتیں بناتے ہیں اور آپ کی سوچ بھی اتنی عامیانا ہے مجھے اچھا نہیں لگا اسماعیل بھائی..... میں تو ویسے بھی اسکول کی چاب کے لیے گئی تھی..... کسی بینک یا دوسرے دفتر میں نہیں۔“ اس کی بات سن کر اسماعیل کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

”عزت..... اسکول کی نوکری کے لیے بھی گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا پڑتا ہے، رکشے اور وہیکن کے دھکے کھانے پڑتے ہیں، تم مجھ ہی نہیں رہی ہو جو میں کہنا چاہتا ہوں..... تم مجھے پرانے خیالات کا سمجھو یا جو بھی، میری غیرت یہ ہرگز گوارہ نہیں کرے گی کہ میرے ہوتے ہوئے تم یوں چند ہزار کی نوکری کے لیے باہر دھکے کھاؤ، مل جائے گی مجھے نوکری اور اگر نہ بھی ملی تو مزدوری کر لوں گا لیکن عزت تم آئندہ گھر سے باہر نہیں نکلو گی۔“ وہ انگلی اٹھا کر خبردار کرنے والے انداز میں بولا۔ گہرے بھورے رنگ کے کھدر کے شلواری قمیص میں ملبوس وہ مضبوط جسامت کا مالک شخص اس وقت اس کو ڈرا رہا تھا۔ وہ رونے لگی۔

”تو پھر مجھے پڑھنے کیوں دیا؟ نہ بھیجتے اسکول اور کالج، تب بھی تو گھر سے باہر نکلتی تھی ناں میں۔“ وہ روتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

”عزت..... تم خواہ مخواہ بات بڑھا رہی ہو تب کی بات اور تھی..... تب تم پڑھنے جاتی تھی، اب میں نہیں کمانے کے لیے باہر دفتروں اور سڑکوں کے دھکے کھاتے نہیں دیکھ سکتا۔“ ہاں اگر کوئی اور مسئلہ ہے تو بتاؤ۔“ وہ اب کے تھوڑا نرم ہوا، عزت نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ شکوہ تھا ان آنکھوں میں۔

”دیکھو عزت تم شاید وہ بات نہیں سمجھ رہی جو میں سمجھانا چاہ رہا ہوں۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے سیڑھیاں اتر گیا۔ عزت کو اس کی پرواہ کرنا آج تک بھی اتنا برا نہیں لگا تھا جتنا

آج لگ رہا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہی آنکھیں صاف کرتی اتر آئی تھی۔

دال کے بگھار کی خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسماعیل غسل خانے سے تو لیے سے بال رگڑتا باہر نکلا تھا..... وہ چٹائی پر دن کے کھانے کے برتن لگا رہی تھی بھیگی سوچی آنکھیں، نظریں جھکائے اب وہ سلاک کاٹ رہی تھی۔

”آج جلدی آگئے اسماعیل..... مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ تائی امی کمرے سے نکلیں تو اسے صحن میں لگے آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ کر حیرت سے بولیں۔

”جی امی آج کام بن گیا، نوکری مل گئی بس اسی لیے جلدی آ گیا۔“ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

”نوکری مل گئی.....! ارے یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے..... کہاں ملی اور تنخواہ کتنی ہے؟“ تائی امی اس کا ہاتھ چومتے ہوئے بولیں، لحظہ بھر عزت نے نظریں اٹھا کر اس کو دیکھا وہ اسی ہی سمت دیکھ رہا تھا۔

”بہت بڑے بزنس مین ہیں امی ان کے گھر ڈرائیور کی نوکری ملی ہے اور بیس ہزار تنخواہ ہے..... کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے امی..... صبح آٹھ بجے سے رات دس بجے تک اور آپ پریشان نہ ہوں..... یہ نوکری ہمیشہ کے لیے نہیں ہے..... اللہ ضرور ہمارے لیے بہتر کرے گا۔“ اسماعیل کی یہی عادت اچھی تھی وہ محنت سے گھبراتا نہیں تھا اور کسی بھی قسم کے حالات ہوں یا یوں نہیں ہوتا تھا، وہ اپنی ذمہ داریاں نبھانا جانتا تھا۔

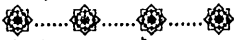
”بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ ایک نظر اسے دیکھتا چٹائی پر بیٹھ گیا نجانے کیوں اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”میں تاپا ابو کو لے آؤں۔“ وہ اس سے نظریں چراتی تاپا ابو کے کمرے میں گھس گئی۔ ان کی ذیل چیر دھکیلتی وہ وہیں لے آئی۔ اسماعیل کی نوکری کی خبر ان کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھی اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے دعا دی تھی۔



نہ میں کوئی ہیرو..... ہم عام سے لوگ بہت ہی عام..... تو پھر برائی کیا ہے، اچھا ہے نہ جہیز کا مسئلہ ہوگا نہ بری اور زبورا کا نکاح کے بعد تم اپنے کمرے سے میرے کمرے میں آ جانا..... ایک نئی اچھی زندگی کے لیے۔“ وہ سیدھا سدا دھاسا انسان تھا۔ عزت کا دل بند ہونے لگا..... اس نے بھی اسماعیل کے لیے ایسا نہیں سوچا تھا۔

”کیا کہہ رہے ہیں اسماعیل بھائی، بولنے سے پہلے سوچ تو لیا کریں، بہت عزت کرنی ہوں میں آپ کی۔“ وہ سر کو جھٹکتے ہوئے بولی اور جلدی سے میڑھیاں اتر گئی اسماعیل کو اپنی جلد بازی پر دکھ ہوا اور خود پر غصہ بھی آیا۔



”نہ کیا ہے؟ ڈانٹنگ ٹیبل پر ناشتے کی شکل میں بریڈ سلاؤس، مکھن اور چائے دیکھ کر اسو نے منہ بنایا پھوپھو نے عینک کے پیچھے سے اسے دیکھا پھر عالم کی طرف جو بیگ کندھے سے نکالتی غلبت میں باہر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

”اب کیا کر سکتے ہیں بیٹا، تمہاری امی کو تو فکر نہیں ہے تمہاری شادی کی اور عالمہ اچھی بہن ہے جس کی اپنی ہی دنیا ہے نہ سسرال کی ہے نہ میکے کی..... اب یہ کام بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا، تمہارے لیے لڑکی دیکھنے کی بات شبانہ سے کی ہے میں نے۔“ پھوپھو کی بات سن کر امی نے ایک لمبی اس کی سمت دیکھا لیکن اس گھر میں ان کی اہمیت ہی کیا تھی۔

”اور آپ سے کس نے کہا پھوپھو کو آپ میرے لیے لڑکی دیکھیں؟“ اب وہ خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ بات ہی اتنی بڑی تھی۔ پھوپھو نے ابرو چڑھا کر اس کی سمت دیکھا، اس گھر میں کون تھا جو انہیں جواب دے سکتا تھا۔

”آپ کیا سمجھتی ہیں کہ میری بیوی کام کرنے آئے گی اس گھر میں، مجھے امی جیسی زندگی نہیں دینی اپنی بیوی کو اس لیے اس معاملے میں آپ خود کو ذمہ نہ لیں..... مجھے جہاں شادی کرنا ہوگی میں امی کو بتا دوں گا۔“ وہ ناشتہ چھوڑ کر اٹھ گیا ساڑھے پھوپھو ہکا بکا بیٹھی رہ گئی تھیں۔

”ان شاء اللہ اس سے اچھی نوکری بھی ضرور ملے گی..... بس یہ میری بیماری کی وجہ سے جو تمہاری پڑھائی مکمل نہیں ہو سکی یہ دکھ تو رہے گا۔“

”آپ پریشان نہ ہوں ابا..... کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے کہ نوکری مل گئی۔“ وہ پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے بولا۔ عزت نے نظریں اٹھا کر ایک بار پھر اسے دیکھا..... شاید اسماعیل کو شکوہ تھا، ابھی تک اس نے اس کی نوکری کی مبارک نہیں دی تھی۔ خاموشی سے کھانا کھایا گیا اسماعیل جو بات عزت کو سمجھانا چاہتا تھا وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

”تو مل گئی نوکری آپ کو۔“ شام کے ملگجے اندھیرے پھیل رہے تھے جب وہ چائے کے دوپ کے لے کر اوپر چلی آئی، وہ چار پائی پر لینا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا اسے دیکھتے ہی فون بند کر کے اٹھ بیٹھا۔

”ہاں مل گئی..... ملنی ہی تھی کیونکہ میری نیت صاف ہے۔ میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ مزدوری کر سکتا ہوں، رکشہ چلا سکتا ہوں، سڑکوں پر پتھر توڑ سکتا ہوں۔“ وہ عجیب انداز میں مسکرایا تو وہ سمجھ گئی کہ وہ آگے کیا کہنا چاہتا ہے۔

”اور آپ کو کیا لگتا ہے کہ اس رقم میں آپ سارا گھر چلا لیں گے؟ بقول تانی امی ان تمام اخراجات سے ہٹ کر ہم دونوں کی شادیاں بھی بہت بڑا مسئلہ ہیں ان کے لیے۔“ وہ چائے لے کر وہیں منڈیر کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ اسماعیل نے بغور اس کو دیکھا..... وہ واقعی نا سمجھ تھی یا پھر ایسا ظاہر کرتی تھی۔

”ہم دونوں کی شادیاں یا ہم دونوں کی شادی..... مسئلہ حل ہو سکتا ہے اگر تم چاہو تو.....“ وہ کہہ گیا دل میں رکھنے سے کیا فائدہ؟ وقت ہاتھ سے نکلتے دیر ہی کہاں لگتی ہے۔

”جی.....؟“ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ پروا اس لیے تھی۔

”کیوں کیا برائی ہے..... نہ تم کوئی مس یونیورس ہو اور

”تائی امی۔“ وہ جو پردے کے پیچھے سے دیکھ رہی تھی  
تڑپ کر ان کی سمت بڑھی تھی۔

”آپ کو ضرورت ہی کیا تھی یوں کسی کو بھی رشتے کے  
لیے کہہ دینے کی..... امی آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ آج  
کل لوگوں کا معیار کیا ہے، ہمارے پاس عزت کے جہیز  
کے نام پر ایک پھولی کوڑی بھی نہیں ہے۔ امی آپ کیوں  
جان بوجھ کر خود کو عزت کو اور ہمارے گھر کو ذلیل و خوار کروا  
رہی ہیں۔“ وہ سننے ہی آگ بگولہ ہو گیا اور اپنی جگہ سے اٹھ  
کھڑا ہوا۔

”ہاں تو اسی لیے تو کہتی تھی ناں کہ عزت بھی نوکری  
کر لے اچھے پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھے بیٹھے گی، اپنی  
تنخواہ سے جہیز کا کچھ سامان بنالے گی..... باہر نکلے گی،  
لوگوں سے ملے گی شاید کوئی راز فکھ آئے بچی کے لیے لیکن  
تم نے اس پر بھی اپنا حکم صادر کر دیا، اب ہمارا پیٹ پالو  
گے، گھر کے باقی اخراجات پورے کرو گے یا اس کے  
نصیب کھلنے کا بندوبست کرو گے۔ اسماعیل تم اس کے  
خواب نہیں چھین سکتے۔“ فردوس بھی پھٹ پڑیں اسماعیل  
سے زیادہ انہیں عزت سے محبت تھی ماں بیٹی کی محبت اور  
دوستی شروع سے دونوں کے درمیان قائم رہی تھی۔

”خواب..... عزت کے خواب؟“ وہ زرب لب بولا اور  
ان کے سامنے سے ہٹ گیا جبکہ وہ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کام  
میں مصروف ہو گئی تھیں۔

”کیا ہیں تمہارے خواب بتاؤ؟ اگر وہ میری پہنچ سے  
دور ہوئے تو ٹھیک ہے، ورنہ نہیں روکوں گا تمہیں۔“ وہ  
رات اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ جو بارہا بچی خانے  
میں برتن دھو رہی تھی اس کی یوں اچانک آمد پر چونک گئی۔  
”آپ کیوں ایک بات کو لے کر اپنی انا کا مسئلہ بنا  
رہے ہیں اسماعیل بھائی؟“ وہ تائی امی کی باتوں کی وجہ  
سے اب بھی ہوئی تھی۔ اس کے کوئی خواب نہیں تھے سوائے  
اس گھر کی خوشحالی کے اس کے کوئی خواب نہیں تھے۔  
”کچھ تو کہا ہے تم نے امی سے..... وہ تمہاری

چھوٹی سی بیٹھک میں وہ دونوں خواتین بیٹھی بڑی  
ناقدرانہ نظروں سے درو دیوار کا جائزہ لے رہی تھیں صاف  
ستھرے سادہ اور پرانے سامان سے سچی بیٹھک تھی۔ میز پر  
رکھی چائے، کباب اور بسکٹ..... یوں تو لڑکی کا سلیقہ ان  
چیزوں سے ہی عیاں ہو رہا تھا لیکن وہ زمانے بیت گئے  
جب لڑکی کی سیرت اور اس کے سلیقے سے غرض ہوتی تھی۔  
”نی الحال شادی تو نہیں کر سکتے ہم لوگ..... ابھی  
میرے بیٹے کو ملازمت ملی ہے اگر آپ لوگوں کو مناسب  
لگے تو بات سچی کر کے چھوٹی سی رسم کر لیتے ہیں اور پھر دو  
سال تک شادی۔“ تائی امی نے سکوت توڑا۔

”دیکھیں بہن، ہمیں پتا چلا ہے کہ یہ بچی آپ کے دیور  
کی بیٹی ہے اور.....“ ایک عورت نے ایک بار پھر سر سے  
پاؤں تک عزت کو دیکھا۔

”عزت بیٹی جاؤ..... تایا اب کو دوائی دے آؤ نا تم ہو گیا  
ہے۔“ انہوں نے اسے اٹھا دیا۔ وہ ایک لمحے کی دیر کیے بنا  
چلی گئی۔

”جی ہاں میری دیورانی کا انتقال ہو گیا، بچی کے نصیال  
میں کوئی تھا نہیں اس لیے میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔  
دس سال کی تھی جب میرے دیور کا مزدوری کرتے ہوئے  
تیسری منزل سے پاؤں پھسلا اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا میں  
ہی اس کی ماں ہوں۔“ تائی امی کی متا بھری آواز ابھری اور  
وہ اپنے باپ کے ذکر پر دل میں آنسو بہانے لگی۔

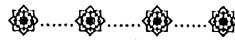
”ابھی تو یہ پتا چلا ہے..... کل کو اور پتا نہیں کیا کیا علم ہو  
آپ لوگوں کے بارے میں اور ویسے بھی ہمیں شادی کی  
بھی جلدی ہے اور صاف بات ہے کہ ہم اپنے معیار کے  
لوگوں میں ہی رشتہ کرنا چاہتے ہیں رشتہ کروانے والی نے  
بہت غلط بیانی کی ہے ہم سے، ہم تو دروازے سے ہی  
واپس لوٹ جاتے بس مروتا آ گئے..... آپ برامت  
منائیے گا۔“ وہ دونوں خواتین کھڑی ہو گئیں، فردوس بیگم  
(تائی امی) انہیں نہ اللہ حافظ کہہ سکیں نہ کوئی جواب دے  
سکیں وہیں صوفے پر ڈھسے ہو گئی تھیں۔

خواہشات کو میری خواہش سے بھی مقدم سمجھ رہی ہیں۔“ وہ شاید اب کے بات کھل کر کرنا چاہ رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کہا تانی امی سے..... وہ ماں ہیں شاید میری عمر اور لوگوں کی باتیں انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہیں، جہاں تک جاب کی بات ہے تو انہوں نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا لیکن آپ بے فکر رہیں اگر آپ نہیں چاہتے تو نہیں کروں گی میں جاب..... وےسے بھی آپ کی بددعا میں ساتھ رہیں تو کہیں جاب ملے گی بھی نہیں۔“ وہ بات مکمل کر کے دوبارہ بتن دھونے لگی۔

”میں کبھی کسی کو بددعا نہیں دیتا عزت اور تمہیں دینے کے لیے صرف دعائیں ہیں، ہر طرح کی دعائیں..... خوش رہو اور جو کرنا چاہتی ہو کرو..... میں تمہیں اب منع نہیں کروں گا۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے چلا گیا۔

اس کا عجیب شکست خوردہ سا لہجہ جان کر ایک لمحے کو عزت کا دل ڈوبا تھا، کیا اسماعیل کی محبت کافی نہیں تھی زندگی گزارنے اور اس گھر کے مسائل ختم کرنے کے لیے؟ اور اگلے ہی لمحے اس نے سر جھٹک دیا تھا۔



”اف خدا یا..... یہ آج کل کی لڑکیاں دو چار مہینے کام کر کے سمجھتی ہیں کہ سارا تجربہ حاصل کر لیا، سب کچھ گنیا، اب یہ مس فروا کو کیا مصیبت آ پڑی ہے؟ چار دن ہو گئے بغیر اطلاع کے غیر حاضر ہیں جس جس بچہ کی ڈیوٹی لگا رہی ہوں اب تو وہ بھی تنگ آ گئی ہیں۔ سنیں مس فاطمہ۔“ غصے سے بولتے ہوئے آئینہ آفس میں داخل ہوئی۔

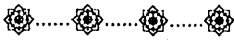
”جی میم۔“

”وہ جو کچھ دن پہلے ایک لڑکی آئی تھی..... وہ مسز مجتبیٰ ہاشمی کے ریفرنس سے۔“

”جی میم..... مجھے یاد ہے۔“

”آپ ایسا کریں اس سے کانٹیکٹ کریں اور اسے صبح بلا لیں اس کا بیج توڑا ہلکا بھی رکھا تو مان جائے گی..... ضرورت مند لگتی تھی اور ہاں ذرا اسکول کے ڈسپلن کے بارے میں اچھی طرح بریفنگ دے دیجیے گا۔“ وہ اپنی

سیٹ پر بیٹھ کر لیپ ٹاپ کھولے مس فروا کو میل کرنے لگی۔ ”یہ مس فروا کا اکاؤنٹ فریز کر دانا ہے اور ہاں کوئی رونا رونے کی کوشش کریں تو بالکل ہمدردی دکھانے کی ضرورت نہیں، مجھے نکلے اور کام چور لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔“ وہ ساری ہدایات دیتی اٹھ ٹی..... آج اسود کے لیے لڑکی دیکھنے جانا تھا۔ امی اور عائکہ اسود کے علم میں لائے بغیر یہ کام کرنے والی تھیں تاکہ پھوپھو کسی بھی قسم کی پیش قدمی سے باز رہیں۔



”تانی امی..... تانی امی..... کہاں ہیں آپ؟“ پھولی سانس کے ساتھ وہ باورچی خانے کی طرف بھاگتی ہوئی آئی صحن کے واش بیسن کے سامنے کھڑا شیو بنانا اسماعیل چوہیکے بغیر نہ رہ سکا، جب بھی کوئی بہت ہی خاص بات ہوتی تھی تب وہ اسی طرح امی کو پکارنی ان تک آتی تھی یہ منظر وہ اس کے ہرزلٹ پر دیکھ چکا تھا اس کے ہاتھ رک گئے۔

”کیا ہوا؟ سانس تو لو۔“ تانی امی نے اسے شانوں سے تھام کر سنبھالا۔

”تانی امی وہ جو اسکول کی جاب تھی ناں..... وہ ہو گئی..... انہوں نے بلایا ہے صبح اور آپ کو پتا ہے انٹرویو بھی نہیں ہے۔ میری سلیکشن کر لی ہے انہوں نے۔“ اس کی خوشی چہرے سے عیاں تھی اسماعیل نے سر جھٹک کر اپنا کام جاری کر دیا تھا۔

”ارے ماشاء اللہ بہت مبارک ہو..... اللہ میری بچی کو کامیاب کرے۔“ وہ اس کا ہاتھ چومنے لگیں، اس نے ایک نظر اسماعیل کی طرف دیکھا وہ بے پرواہ بنا کھڑا تھا۔

”کب سے جانا ہے؟“

”صبح جاؤں گی ان شاء اللہ اور پھر سوموار سے جاب شروع۔“ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ کن اکھیوں سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

اندر کچھ مسلسل جب رہا تھا اور جب درد بڑھنے لگا تو وہ گھر سے نکل گیا۔ تانی امی اور اس نے چونک کر اس کے

جاتے دیکھاتھا۔

”تمہارے لیے لڑکی دیکھ لی ہے بہت خوب صورت ہے۔ میری یونیورسٹی فیلوکل آئی، جو نیر بھی میری۔“ اسود کو چائے کا کپ تھمتے ہوئے عائد نے ایک نظری کی سمت دیکھا۔

”ہوں.....! کیا کہا؟“ وہ جو اپنے موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے تھا اس کی بات پر چونکا۔

”تمہارے لیے لڑکی دیکھی ہے..... بہت خوب صورت ہے۔“ عائلہ نے اپنی بات دہرائی تو اسود کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

”تس نے کہا تھا دیکھنے کو؟ میں نے.....“ اس کے لہجے کی سختی عالمہ اور اعمی دونوں کے لیے غیر متوقع تھی۔ جہاں تک وہ اسے جانتی تھیں اس کی کوئی پسند نہیں تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ شادی کی عمر ہوگئی ہے تمہاری، اب نہیں کرو گے تو پھر کب کرو گے؟“ امی کا لہجہ بہت کم سخت ہوتا تھا۔ اسے ان کے لہجے کی سختی محسوس ہوگئی۔

”کروں گا..... جلد ہی کروں گا لیکن ایسے تو نہیں جیسے آپ لوگ چاہ رہے ہیں۔ میں شادی آپ لوگوں کی پسند سے تو ہرگز نہیں کروں گا“ ہاں میری پسند میں آپ لوگوں کو کبھی خوش ہونا پڑے گا۔“ وہ بڑے مطمئن سے انداز میں بولا۔

”تو تم بیرشتہ میرا مطلب ہے یہ لڑکی تو دیکھ لو۔“ عائشہ کی بات اس نے ہاتھ اٹھا کر رد کر دی۔

”تم نے دیکھ لی کوئی معقول سا بہانہ بنا کر انکار کر دو۔“  
وہ بات مکمل کر کے اٹھ گیا۔ امی اور وہ ایک دوسرے کا منہ  
دیکھتے رہ گئیں۔

گاڑی معمول کے مطابق بیکری کے باہر کی تھی۔ بلی نے پچاس کانوٹ ڈرائیور کی سمت بڑھایا۔

”ٹھنڈی بوتل لانا اور ساتھ برگر بھی پر جلدی۔“ اس

کے حکم کی تعمیل کرتا وہ بیکری کے اندر چلا گیا تب ہی معمول کے مطابق وہ کلائی میں بندھی گھڑی دیکھنے لگی، بس دو منٹ رہ گئے تھے۔ دو موٹر سائیکل آگے پیچھے گاڑی کے بالکل قریب سے گزرے تھے، پیچھے والے موٹر سائیکل سوار نے ایک نظر گاڑی کی سمت دیکھا کسی فلمی ہیرو کی طرح سر پر اٹنی ٹوپی رکھے وہ آگے بڑھ گیا تھا، بجلی کے لمبوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ روزانہ بیکری کے باہر گاڑی روکواتی تھی اور وہ دونوں موٹر سائیکل سوار اسی وقت وہاں سے گزر رتے تھے..... آگے والا تو اپنے دھیان میں آگے بڑھ جاتا تھا جبکہ پیچھے والا کبھی کبھی ایک نظر گاڑی کی طرف دیکھتا بالوں کو ہاتھ سے درست کرتا ایک مسکراہٹ بھی دیتا تھا..... بجلی کے لیے یہ مسکراہٹ اور ایک نظر ایک نئے ہی جہان کا درکھول دیتا تھا۔

”تیم آئینے کے سامنے کھڑی سرخی پاؤڈر میں لگی رہتی ہو..... اس کی کوئی توجہ ہوگی یاں۔“ ماں کی نظریں بہت دنوں سے بلی کا جائزہ لے رہی تھیں۔

”نہیں تو امی..... ایسا کچھ نہیں ہے..... اب میں کالج میں پڑھتی ہوں، ہمو کار میں بیٹھ کر کالج جاتی ہوں، گلوگوں کو پتا تو چلے کہ میں سیٹھ ہاشم علی کی بیٹی ہوں اب سر جھاڑ منہ پھڑا حلیے میں تو غریبوں کی بیٹیاں آتی ہیں۔“ اس کے جواب براماں کی گردن بھی رعونت سے اکڑ گئی۔

”ہاں بھئی یہ تو ہے پورے شہر میں ہمارے گھرانے جیسا ٹھاٹھ ہاٹھ کسی اور کا نہیں۔“

”اسی لیے تو..... آپ کو پتا ہے کالج کی لڑکیاں بڑی حسرت اور حسد سے میری طرف دیکھتی ہیں۔“ اس نے بیگ اٹھا کر کندھے سے لٹکایا۔

”یاد رکھنا بلی تیری شہادی بھی ہم اپنی ہی جیسے لوگوں میں کریں گے..... نکل کر کے لوگوں میں۔“ اماں کی بات پر وہ سسکرانے لگی۔

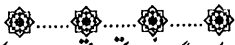
”فکر نہ کرو اماں..... ایسا ہی ہوگا۔ بالکل ندیم اور جاوید شیخ جیسا داماد ملے گا تمہیں۔“ اماں کے چہرے پر مسکراہٹ

ابھر کر معدوم ہو گئی۔

ایک حادثے میں بازو ٹوٹ گیا اور بڑھکی ہڈی بھی.....  
تب سے تایا ابوکا بیٹا ہے، میرا کزن وہی، ہم سب کا فیصل  
ہے بس گزرا ہوا جاتا ہے۔“

”اوہ..... ویری سید..... خیر..... آپ کو مس فاطمہ  
سارے روز بتا دیں گی اور بہتی خواہ آپ کو کیٹش کی شکل میں  
ملے گی اس کے بعد آپ کا اکاؤنٹ کھل جائے گا۔“ عاتکہ  
نے بات ختم کر کے اسے جانے کا اشارہ کر دیا۔

”اور میں پک اینڈ ڈراپ کی سروس اسکول کی طرف  
سے ہوگی۔“ وہ لیپ ٹاپ کھولے مصروف سے انداز میں  
بولی۔ ایک اطمینان کا سانس لیتی عزت ہیڈ سسٹریس کے  
کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔



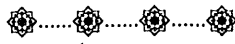
”بہت بھوک لگ رہی تھی قسم سے امی کل رات کا  
کھانا کھایا ہوا تھا۔ اتنا کام تھا وہاں..... ایک لمحے کی  
فرصت نہیں ملی..... دوسرا ڈرائیور بتا رہا تھا کہ مالک تو  
چائے کا بھی نہیں پوچھتا اور وہ مالی بابا تو گھر سے تھرماس  
میں چائے لے کر آتا ہے۔ اللہ نے دولت دے دی پر دل  
نہ دیا۔“ اسماعیل بڑی رغبت سے امی کے ہاتھ کے پکے  
قیمہ کریلے کھا رہا تھا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ تو کہیں اور بھی نوکری کے لیے  
کوشش کر کے دیکھ لے بیٹا! ایسے تو بہت کمزور ہو جاؤ  
گے..... بہت ہی سخت ڈیوٹی ہے یہاں۔“ امی نے اس  
کے لیے گلاس میں پانی نکالتے ہوئے کہا۔ اس کی صحت  
دیکھ کر وہ واقعی پریشان ہو گئی تھیں۔

”کوشش تو کر رہا ہوں امی اور یہ عزت نے کچھ بتایا  
اسکول والوں کے بارے میں اسکول کہاں ہے، کیسے لوگ  
ہیں؟“ وہ چاہہاں اس سے بالکل لالہ نہیں رہ سکتا تھا۔

”ہاں آج تمہارے جانے کے بعد اسکول کی وین آتی  
ہے چھٹی ٹائم بھی وہی وین آتی ہے بلکہ آج تم گھر ہو تو ذرا  
باہر نکل کر ڈرائیور سے سلام دعا کر لینا..... خوش ہے کہہ  
رہی تھی کہ میڈم بھی اچھی لڑکی ہے، بس بیٹا ہم کون ہوتے  
ہیں اس بچی کی خواہشات پر دروازہ بند کرنے والے اور پھر

”مجھے بھانڈ اور میراثیوں میں رشتا نہیں کرنا تیرا.....  
سوچ لینا۔“ وہ بات کر کے باہر نکل گئیں، بجلی کے چہرے  
پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔



”آپ کا تعارف۔“ جان بوجھ کر گاڑی کا دروازہ کھول  
کر کتابیں گراتے ہوئے اس نے ایک نظر موٹر سائیکل  
سوار کو دیکھا تھا۔ موٹر سائیکل سوار نے پہلے کتابیں اس کو  
تھمائیں اور پھر اس کو دیکھنے لگا۔

”اوہ..... بہت شکریہ؟“ ایک اداسے سوالیہ نظروں  
سے وہ اس کی سمت دیکھنے لگی۔

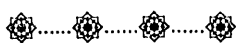
”افضل..... افضل علی۔“ اس نے بھی جاندار  
مسکراہٹ دیتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

”آپ روز گزرتے ہیں یہاں سے؟ لگتا ہے یہیں  
کہیں دفتر ہے آپ کا۔“ وہ بات بڑھانا چاہتی تھی، مقابل  
کھل کر مسکرا دیا۔

”دفتر؟ جی جی یہیں آگے۔“  
”اور یہ آپ کے ہاتھ سے چوٹ کیسے لگی؟“ یکا یک بجلی  
کی نظر اس کے بائیں ہاتھ پر پڑی تھی۔

”یہ..... یونہی..... اوکے مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ  
موٹر سائیکل کو کک لگا تا چلا گیا۔

”افضل..... افضل علی.....“ وہ زیر لب دہراتی رہی  
تھی۔



”پورا نام کیا ہے آپ کا؟“ عاتکہ نے ایک بار پھر سری  
وی دیکھ کر عزت کی سمت دیکھا۔  
”عزت فاطمہ۔“

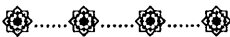
”آپ کے والد کا انتقال ہو گیا ہے تو آپ کی اور آپ  
کی والدہ کی ثقالت کون کرتا ہے؟“ اس کے سوچ کے لیے  
یہ سوال ضروری تھا۔

”جی میری والدہ بھی نہیں ہیں اپنے تایا اور تائی امی  
کے ساتھ رہتی ہوں، تایا اب پو پہلے کام کرتے تھے پھر ان کا



کچھ غلط تو نہیں ہے پڑھانے کا کام تو اچھا عزت دار کام ہے اس تم اس سے زیادہ ناراض نہ رہو..... میں نے سمجھایا ہے اسے کہ ہر ماہ خواہ سے اپنے جہیز کے لیے کچھ نہ کچھ بنائی رہے یا کمیشیاں ڈال کر رقم جمع کرے۔“ امی نے تو سے گرم گرم روٹی اتار کر اس کے سامنے رکھی وہ ان کی بات سمجھ کر اثبات میں سر ہلانے لگا قسمت میں اس کا ساتھ شاید نہ ہو تو پھر اسے کیا حق تھا ایک معصوم لڑکی کے خواب چھینے کا، امی سچ کہتی تھیں وہ سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھانے لگا تھا۔

آزمائش سے نکل کر دوسری آزمائش میں داخل ہونے کے لیے ہی بدلی تھی..... فرق شاید حرام اور حلال کا تھا، وہ بھی صرف دنیا کی نظر میں..... رب کی نظر میں تو ہم وہاں بھی خون پسینے کا کھاتے تھے، وہ الگ دنیا تھی اور یہ الگ ہے..... پر دنیا اس کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھتی تھی..... یہاں بھوک اور فاقوں سے لپٹی عزت ہے جو ہمیں منظور ہے اپنی اولاد کے لیے۔“ وہ بات کر کے رونے لگیں، اکرم علی کھلی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے بے بسی بے بسی تھی۔



”اوہ آئی ایم ریلی ویری سوری۔“ دروازہ بہت زور سے کھلا تھا اور کسی کے سر سے ٹکرایا تھا۔ سامنے کھڑی لڑکی اپنا سر سہلار رہی تھی۔ اسود بولکھا کر رہ گیا تھا۔ اسے عالمہ کو لینے کی جلدی تھی دس بار ہارن بجانے کے باوجود وہ باہر نہیں آئی تو وہ غمت اور غصے میں تیزی سے اس کے آفس کی طرف بڑھا تھا اور یہ حرکت اسی غمت کا نتیجہ تھی کہ اندر سے دروازہ کھلتی ٹیچر اس کے غصے کی زد میں آ گئی تھی۔

”اوہ.....“ اس نے سر اٹھا کر دیکھا..... میڈم عالمہ کا بھائی تھا۔

”اوہ..... آپ؟“ اسود کے لب مسکرائے عزت نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس کے گومز زدہ ماتھے کو دیکھ کر وہ مذاقاً مسکرایا۔ وہ ایک طرف سے راستہ بناتی نکل گئی۔

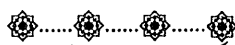
”آگئے اسود۔“ وہ ضروری سامان سمیٹنے لگی۔

”ہاں کب کا آیا ہوا ہوں تمہیں تو خبر ہی نہیں اور یہ.....“ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

”تم نے اس لڑکی کو جاب دے دی۔“ اس کے یوں اچانک پوچھنے پر عالمہ نے عجیب سی نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

”ہاں تمہیں بہت ترس آ رہا تھا ناں اس پر تو دینی پڑی۔“

”یہ کہو کہ تمہیں پھر کسی ٹیچر نے تنگ کیا اور مجبوراً اس ماسی کم ٹیچر کو تمہیں بلانا پڑا۔“ وہ اسے باہر آنے کا اشارہ کرتا نکل گیا۔



”ٹی وی دیکھیں گے؟“ اکرم علی جو کب سے لیٹے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے بیوی کی آواز پر سیدھے ہونے کی کوشش کرنے لگے..... انہوں نے سہارا دے کر بٹھایا تو ان کے چہرے پر ایک تھکن سی تھی جو چہرے پر پڑا ٹھہری تھی۔

”کچھ سوچ رہے ہیں آپ؟“ ہاتھ میں چائے کا کپ تھماتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں اسماعیل کی ماں..... میں سوچ رہا تھا کہ کہیں سے عبدالباری صاحب کا نمبر ڈھونڈوں اور اپنے اسماعیل کے لیے بات کروں، کہیں کوئی اچھا کام.....“ ان کی بات سن کر وہ ہکا بکا انہیں دیکھتی رہیں..... آج اتنے سال بعد ان کی زبان سے عبدالباری صاحب کا نام سن کر وہ حیران رہ گئیں۔

”قسم کھاتی تھی ناں آپ نے..... کبھی اپنی اولاد کے سامنے ماضی اور ماضی سے جڑے کسی نام کو بھول کر بھی نہیں لیں گے۔“ آنسو آنکھوں کے کنارے پڑا کر رک گئے۔

”ہاں لیکن اب یہ حالات نہیں دیکھے جاتے..... عزت کو دیکھتا ہوں تو اس کے باپ کا سوال کرتا چہرہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔“ وہ بھی آنسوؤں پر بند نہ باندھ سکے۔

”یہ زندگی جو بہت سال پہلے بدل گئی تھی شاید ایک

کی جیولری، اس کا میک اپ ٹیچر بتا رہی تھیں کہ بے چاری کی اولاد نہیں ہے اور شوہر بھی ملک سے باہر ہوتا ہے..... اپنی مرضی کی زندگی جیتی ہے۔“ وہ فرخ سے دودھ نکال کر لائی۔

”بس بیٹا پیسے والے لوگوں کی باتیں نہ کر رہی ہوئی ہیں۔ یہ تو ہم جیسے لوگ ہوتے ہیں“ چھوٹی چھوٹی ضرورتوں اور خواہشوں کو ترسنے والے..... خیر اللہ کی تقسیم ہے اور ہمیں اس تقسیم پر شکر مبارک کرنا چاہیے۔“ وہ دوپٹوں میں چائے نکال لے لگیں، سامنے صحن میں دھوپ دوپٹوں پر چڑھنے لگی تھی۔ تاپا ابو کے کمرے سے ریڈیو کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی، اسماعیل تو رات گئے آتا تھا اور وہ اسکول جانے کی وجہ سے رات جلدی سو جاتی تھی۔

”ارے آپ؟“ وہ بیکری سے باہر نکل رہی تھی جب افضل بیکری میں داخل ہوا تھا اچانک سامنا ہونے پر وہ زیر لب مسکرایا۔

”آپ؟“ وہ اپنا تعارف تو کروا چکا تھا اب اس کا نام جاننا بھی ضروری تھا۔

”اوہ.....“ وہ ہنسنے لگی۔

”میں بلی ہوں“ کالج جاتے ہوئے یہاں سے کبھی ناشتہ اور کبھی یونہی بسکٹ وغیرہ لیتی ہوں..... آپ بھی روز نظر آتے ہیں..... آپ کا آفس اسی طرف ہے کیا؟“ وہ بات سے بات نکالنا چاہ رہی تھی۔

”آپ؟ ارے..... آپ مجھے کیا سمجھ رہی ہیں..... میں کسی آفس میں کام نہیں کرتا۔“ وہ ہنسنے لگا، اس کی ہلکی دیکھ کر بلی کو زندگی خوب صورت لگنے لگی تھی، یونہی بلا وجہ۔

”تو کچھ کیا کرتے ہیں آپ؟“ تجسس سے بھری آنکھیں پھیلانے وہ اسے دیکھنے لگی۔

”بہت کچھ..... بہت کچھ کرتا ہوں میں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”بلی کی مسکراہٹ بھی گہری ہو گئی۔

”وہ تو آپ کا حلیہ اور آپ کا یہ موٹر سائیکل بھی بتاتا ہے کہ آپ بہت اچھی چیز ہیں۔“

”ہاں سچ تو یہی ہے۔“ وہ اس کے پیچھے نکلنے اپنی گلاسز آنکھوں پر نکالتے ہوئے ایک بار پھر گراؤنڈ میں کھڑی عزت کو اشارے سے بلانے لگی۔

”جی میم۔“ وہ قریب آ کر مودب لہجے میں بولی۔ اسود نے دیکھا وہ ایک سادہ سی لیکن خوب صورت لڑکی تھی۔

بظاہر بہت عام نظر آنے والی۔

”مس عزت آپ جاتے ہوئے کلیرک آفس سے آج تک کی سیلری کیش میں لے جایئے گا۔“ اس نے دیکھا عائدہ کے یہ الفاظ اس کی آنکھوں میں روشنی لے آئے تھے۔ دھیرے سے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مڑ گئی تھی۔

.....

”فی الحال تو کچھ بھی نہیں بناؤں گی تائی امی..... کمیٹی ڈال لوں گی اور کچھ رقم آپ کو دیا کروں گی آپ گھر کی کوئی نہ کوئی چیز بنالیا کریں۔ گھر کا بہت سا سامان پرانا اور خراب ہو رہا ہے۔“ وہ کھانا کھاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی یوں جیسے جائزہ لے رہی ہو۔

”ہوں..... کبھی تو ٹھیک ہو بیٹا..... کوئی رشتہ لے کر آتا بھی ہے تو پہلے گھر کا جائزہ لیتا ہے..... واقعی گھر کی حالت اچھی ہوگی تو تمہارا رشتہ بھی اچھی جگہ ہوگا ناں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں اسماعیل کے نام کے خواب ٹٹولنے لگیں۔

”بات رشتے کی نہیں ہے تائی امی..... بات اس گھر کی حالت کی ہے اور آپ بار بار یہ رشتے کی بات نہ کیا کریں۔ مجھے فی الحال اس گھر سے کہیں نہیں جانا۔“ وہ بڑی توجہ سے کھانا کھا رہی تھی، انہوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے چوہے پر چائے کا پانی رکھ دیا۔

”اسکول کی میڈم آپہیں عورت ہے۔“ تائی امی کے اندازے پر وہ مسکرائے لگی۔

”پینتیس چھتیس سال کی ہے لیکن ذرا بھی نہیں گنتی“ اتنی خوب صورت ہے کہ کیا بتاؤں..... اس پر اتنی تہنگی اور اسٹائلش ڈریسنگ کرتی ہے اتنے مہنگے مہنگے سن گلاسز، اس

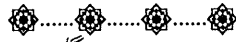
”اچھا مثلاً؟“ اس نے بروچڑھائے۔

”آپ کو فلموں میں ہیرو ہونا چاہیے۔“

”ہیرو تو میرے سامنے زیرو ہو جاتا ہے۔ جب تک میں نہ ہوں فلم پوری نہیں ہوتی۔“ وہ ہتھ پر لگا کر ہنسا۔  
”مطلب؟“ وہ چونکی۔

”کچھ نہیں مذاق کر رہا تھا۔ میں جاب کرتا ہوں اور اب یہ مت پوچھیے گا کہ کہاں کیونکہ میں پہلے ہی بہت لیسٹ ہو گیا ہوں۔“ وہ کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھنے لگا۔

”شکر ہے کہ آپ فلموں کے ہیرو نہیں ہیں میری امی انہیں بھانڈا اور میری بہتی ہیں۔“ زبان سے پھسلا تھا یا قصداً کہا تھا وہ ان سنی کرتا واپسی کے لیے مڑ گیا تھا۔



”چائے۔“ وہ دیوار پر جھکا نیچے گلی کا جائزہ لے رہا تھا جب پیچھے سے عزت کی آواز آئی۔  
”ہوں..... شکر یہ۔“

”کیسا ہے اسکول؟“ یونی بات کی غرض سے پوچھا۔  
”اچھا ہے..... پہلی تنخواہ مل گئی ہے۔“ وہ اپنی چائے لے کر کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔

”چلو اچھی بات ہے یہ تو۔“ وہ دوبارہ گلی میں جھانکنے لگا۔

”آپ مجھے اتوار والے دن بازار لے جائیں گے۔ تائی امی سے کہا تو وہ بچت کا درس دیں گی، مجھے فی الحال بچت نہیں کرنی بلکہ گھر کی حالت ٹھیک کرنے اور میں آپ کو میں میرا ساتھ دینا ہے۔“ وہ بولی رہی تھی اور اسماعیل نے خود سے عہد کیا تھا کہ اب اس کی کسی بات پر انکا نہیں کرنا۔

”ہوں لے چلوں گا۔“ وہ چائے کی چسکیاں لینے لگا۔  
”آپ ناراض ہیں مجھ سے اسماعیل بھائی؟“ اس کا لیے دیئے رہنے والے انداز سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ناراض ہے۔

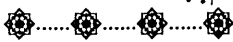
”نہیں بھلا میں کیوں ناراض ہوں گا تم سے؟ ہم بچپن

سے اس گھر میں ایک چھت کے نیچے رہتے آئے، ہم چاروں کی زندگی میں بہت دکھ و محرمیاں ہیں..... ہم لوگ آپس کی ناراضی انور کو نہیں کر سکتے شاید مجھ سے غلطی ہو گئی عزت..... ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔“ وہ یونی گلی میں دیکھتے ہوئے یولا اسے اپنے کہے لفظوں پر بھی ندامت محسوس ہو رہی تھی۔

”مجھے یقین تھا آپ ناراض ہو ہی نہیں سکتے۔“ وہ مسکرا دی۔

”ہاں..... تم سے کیا میں کسی سے بھی ناراض نہیں ہو سکتا، تم سے تو پھر کچھ گلے تھے مجھے عزت۔“ وہ سوچ کر رہ گیا۔ اس کی طرف خالی کپ بڑھاتے ہوئے وہ دوبارہ باہر گلی میں دیکھنے لگا وہ چائے کے کپ لے کر نیچے چلی آئی تھی۔

”پتا نہیں تمہاری خواہشات اور خواب مجھے کیوں دکھائی نہیں دیئے عزت..... جب تم مجھے اسماعیل بھائی کہتی ہو تو دل چاہتا ہے تمہیں منع کر دوں پھر سوچتا ہوں کہ ایک دن تم سے وہ رشتہ بناؤں گا جب یہ بھائی کہنے سے تمہیں خود میری امی منع کریں گی خود تم اسماعیل بھائی کہتے کہتے زبان و انتوں تلے دبا لیا کرو گی تب..... تب میں کتنا ہنسوں گا تم پر، یہ گھر ہم دونوں مل کر خوشیوں سے بھر دیں گے..... امی ابو کا ہم دونوں کے علاوہ اور ہے ہی کون، تم اس گھر کے درد کو محسوس ہو..... ہم دونوں کے لیے زندگی کو سنبھالنا، امی ابو کے بڑھاپے کو سنبھالنا آسان ہو جائے گا لیکن شاید تم اس زلویے سے سوچنا ہی نہیں چاہتی جس زلویے سے میں دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں میرے لیے زندگی میں سکون، بہت اہمیت رکھتا ہے اور مجھے یوں لگتا ہے کہ سکون ہم دونوں کے ساتھ میں ہی ہے لیکن میں غلط تھا شاید تمہارے لیے زندگی میں اور بھی خواہشات ہیں جن کے لیے پیسہ بہت ضروری ہے۔“ وہ دل میں سوچ رہا تھا اور پہلے ہی قدم پر ہارنے لگا تھا۔



لکڑی کا بوسیدہ سار دروازہ تھا جس کے عین اوپر ایک

ایک خوف سا آنکھوں میں آنکھ رہا تھا۔  
”تو؟“

”اماں..... میں نے اس سے کہا ہے کہ میرے گھر والے یہاں نہیں رہتے..... میں اور میرا بھائی ہیں بس اور اماں جب شادی ہو جائے گی جب میں اسے اس گھر میں لے آؤں گا تب ساری سچائی اسے معلوم ہو ہی جائے گی۔“  
وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یہ تو دھوکا ہوا ناں افضل..... ہم لوگ غریب ہیں، بچ ہیں مگر جھوٹ نہیں بولتے، دھوکہ نہیں دیتے تو اسے سب سچ سچ بتا دے اگر وہ واقعی محبت کرتی ہے تو جو بھی اسے جو بھی کام کرتا ہے..... جس بھی خاندان کا ہے اسے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔“ اماں کی بات سن کر وہ چند لمحے ان کی بات پر غور کرتا رہا پھر اس بات پر ایک فیصلہ لے کر گھر سے نکل گیا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد عبدالباری صاحب کی کٹھی پر نکاح ہوا تھا شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل میں ولیمہ کی تقریب ہوئی تھی اور یہ سب عبدالباری صاحب کی خواہش پر ہوا تھا..... بلی کے گھر والے بھی مطمئن نظر آ رہے تھے..... افضل کے چہرے پر بے سکونی اور اضطراب سا دکھائی دے رہی تھا..... بلی نے افضل کی سمت دیکھا۔

”عبدالباری انکل تمہارے کون ہیں افضل؟“ رات لان میں غلطے ہوئے بلی نے پوچھا۔

”میرے باس ہیں..... استاد ہیں میرے۔“ وہ بہت عقیدت سے بولا۔

”اوہ..... اور تمہاری امی بھائی اور بھائی کہاں چلے گئے..... اور یہ عبدالباری انکل ابھی بھی یہیں ہیں۔“ بلی کے سوال توقع سے بہت جلدی شروع ہو گئے تھے افضل نے ماتھے کا پسینہ صاف کیا۔

”وہ سب لوگ گھر چلے گئے۔“  
”گھر.....! مطلب وہ یہاں نہیں رہتے؟“

”نہیں..... وہ یہاں نہیں رہتے لیکن میں یہاں ہی رہتا ہوں..... اسی گھر میں۔“ وہ اب نظریں جھکانے پر

طاق بنا ہوا تھا اور اس طاق میں لائین رکھی تھی جس کی مدہم لو سے اندر صحن کا منظر دھندلا سا واضح ہو رہا تھا..... اسی دروازے کے ساتھ زینہ تھا اونچی تاریک سیڑھیاں ان سیڑھیوں کے موڑ پر ایک روشن دان تھا جس سے نیچے کئی کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگنا صحن میں آ گیا تھا۔

”اماں..... کہاں ہے؟“  
”کیا ہے افضل، کیوں شور مچا رکھا ہے؟“ اماں کے ہاتھوں میں آٹا لگا تھا وہ داورچی خانے کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی، بجلی نہیں تھی۔

”اماں بہت ضروری بات کرنا ہے تجھ سے۔“ وہ اماں کے ہاتھ تھامے صحن میں لے آیا۔

”اماں..... وہ جس لڑکی کا تجھے بتایا تھا ناں وہی جو روز صبح ملتی ہے..... اماں وہ شادی کرنا چاہتی ہے..... آج اس نے کہا کہ چائے پیتے ہیں کسی بہت اونچے گھر کی ہے بڑی سی گاڑی میں آئی ہے چائے کے دوران اس نے کہا کہ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے..... وہ اپنی ماں سے میرے بارے میں بات بھی کر چکی ہے۔“

”اچھا تو پھر مسئلہ کیا ہے؟“ اماں نے اشتیاق سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

”اماں..... وہ مجھے بہت بڑا آدمی سمجھتی ہے، وہ سمجھتی ہے کہ میں کوئی میز کرسی والی نوکری کرتا ہوں۔“ سارا مسئلہ سننے ہی اماں کی خوشی کم ہو گئی۔

”تو..... تو نے اسے بتایا نہیں کہ ہم لوگوں کا کام دھندا کیا ہے؟ اور یہ کہ تو اور تیرا باپ کیا کام کرتے ہیں؟ اور تیرا بھائی کیا کرتا ہے؟ تیری ماں اور تیری بھابی کیا کام کرتی ہیں؟“ اماں اندیشوں میں گھر کر بولیں۔

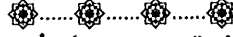
”نہیں اماں..... میں نے سوچا کہ شاید ہمارے حالات بدلنے کے لیے وہ کوئی وسیلہ بن رہی ہے..... محبت بڑی عجیب شے ہے اماں یہ سب باتیں جو دنیا سے جڑی ہیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔“

”لیکن..... اگر سچ جان کر اس نے راستہ بدل لیا تو؟“

مجبور ہو گیا تھا۔

”مطلب؟“ بلی اچھ کا شکار ہوئی۔

”محبت میں زیادہ سوال دوری کا سبب بنتے ہیں بلی۔“  
افضل بوکھلا سا گیا پھر ڈرائیور کی پکار پر وہ بلی کا ہاتھ تھا سے  
گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ انہیں سینما فلم دیکھنے جانا تھا۔



”عالمہ مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔۔۔۔۔ بہت  
ضروری۔“ عالمہ میکے سے گھر جانے کے لیے نکل رہی تھی  
کہ اسوداس کے پاس آیا، چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کوئی  
بہت ضروری بات ہے، اس نے نظریں اٹھا دیکھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ کہو۔“

”مجھے تمہاری نئی ٹیچر کے متعلق معلومات چاہیے۔۔۔۔۔  
وہ کہاں رہتی ہے، کس ٹیچر سے ہے، اس کی کہیں کوئی  
وغیرہ تو نہیں ہوئی؟“ وہ بول رہا تھا اور عالمہ ہونٹ بنی اسے  
دیکھ رہی تھی۔

”اسود۔۔۔۔۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تمہیں صرف اس پر  
تس آ رہا ہے اور بس لیکن اسود تم پاگل ہو گئے ہو؟“ وہ غصہ  
سے بولی۔

”تم شاید میری بات سمجھ نہیں رہی ہو عالمہ۔۔۔۔۔ مجھے  
اس لڑکی کے گھر تمہیں اور امی کو بھیجنا ہے۔۔۔۔۔ تم میری بات  
پر سنجیدگی سے غور کرنا اور اگر تم مجھے نہیں بتاؤ گی تو میں خود  
معلوم کروا سکتا ہوں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ تم اور امی خوشی  
سے اس معاملے میں میرا ساتھ دو اور یہ بات میں پہلے بھی  
کہہ چکا ہوں۔“ وہ اپنی بات مکمل کر کے چلا گیا عالمہ اس  
کی بات پر غور کرتی اُلٹے قدموں باہر نکل گئی تھی۔

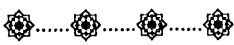
”امی۔۔۔۔۔ یہ اسود پاگل تو نہیں ہو گیا۔ اس کا دماغ  
خراب ہو گیا ہے کیا۔“ وہ جائے نماز پر بیٹھی تیج پڑھ رہی  
تھیں وہ سامنے بیٹھی۔

”کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“

”خیریت کہاں ہے امی۔۔۔۔۔ دو چار دن مجھے اسکول  
پک اینڈ ڈراپ کی سروس کیادی۔ اس نے وہاں اسکول  
میں اپنے لیے داہن بھی پسند کر لی اور لڑکی بھی وہ جسے کوئی

گھر میں ملازمہ رکھتے ہوئے بھی دس بار سوچے، میری تو  
مجبوری تھی اس کو ٹیچر رکھنا۔۔۔۔۔ اس سے پوچھیں یہ کیا بے  
وقوفی ہے؟“ وہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ وہ خود حیران ہو میں یہ  
سب سن کر۔

”تم جاؤ اپنے گھر سسر والے انتظار کر رہے ہوں  
گے۔۔۔۔۔ میں سمجھاتی ہوں اسے، بات کرتی ہوں، تم  
پریشان نہ ہو۔“ امی کے تسلی دینے پر وہ اٹھ گئی۔ اسود  
کے لہجے کی مضبوطی اس کو ہلار رہی تھی۔ عالمہ واقعی پریشان  
ہو گئی تھی۔



اسامیل اور عزت بازار سے لوٹے تو عزت کے  
ہاتھوں میں ڈھیروں شاپر تھے۔ اسامیل بھی دو بڑے  
بڑے شاپر اٹھائے اندر داخل ہوا۔

”یہ کیا کیا لے آئی عزت۔۔۔۔۔ تمہیں منع بھی کیا تھا بیٹی  
کہ فضول خرچی نہ کرنا۔“ تانی امی حُفلی سے بولیں۔  
اسامیل جس طرح آتھا تھا اسی طرح اسے چھوڑ کر موٹر  
سائیکل لے کر واپس چلا گیا۔

”آپ کے اور تانیا ابو کے کپڑے ہیں تانیا ابو کے لیے  
کمرے کے پردے ہیں تھوڑا سا بچن کا سامان ہے اور یہ  
نئی بیڈ شیٹ ہے یہ اسامیل بھائی کے کمرے میں بچھا دینا  
ان کے لیے کچھ اور لیتی تو وہ لینے سے انکار کر دیتے سوچا  
ایسے گھر کا سامان بھی بن جائے گا اور انہیں پتا بھی نہیں  
چلے گا۔“ تانی امی نے اسے ساتھ لگا لیا۔

”اور اپنے لیے کچھ نہیں لیا۔۔۔۔۔ ساری تنخواہ لگا دی کیا۔“  
انہوں نے پیار سے ڈانٹا۔

”اگلے مہینے لے لوں گی ویسے بھی مسئلہ کپڑوں کا  
تھا۔۔۔۔۔ وہ نادیہ (عزت کی سہیلی) نے اپنے نئے نئے  
کپڑے اٹھا کر دے دیئے مجھے جوتے بیک میک اپ  
الماری بھر گئی میری تو۔۔۔۔۔ اس کی شادی ہو رہی ہے اسے تو  
سب کچھ نال جائے گاناں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”میری بچی۔۔۔۔۔ اللہ تجھے خوش رکھے۔“ انہوں نے  
اس کا ہاتھ چومنا۔ تانی امی کی خوشی میں اس کی خوشی تھی، اس

کے لیے وہی ماں تھیں..... ان کی مسکراہٹ زندگی کی ہر خوشی سے زیادہ عزیز تھی۔

جبکہ بلی حیرت سے اس کو دیکھ رہی تھی۔  
”سرکس والے؟“ بلی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”بلی جلدی کرو..... تیار ہو جاؤ گھر چلنا ہے۔“ فضل عجلت میں اندر آیا وہ پریشان لگ رہا تھا۔  
”گھر.....! کس کے گھر..... کہاں؟“ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

”میرے گھر..... میرے اماں ابا کے گھر..... میرے ابا بہت بیمار ہیں وہ مجھے یاد کر رہے ہیں، تم دعا کرو وہ ٹھیک ہو جائیں۔“ اس کی آواز زندہ لگتی۔

”میرے ابا نے بہت محنت کی ہے، بہت دکھ دیکھے ہم لوگوں کے لیے۔“ وہ باقاعدہ رونے لگا بلی اٹھ گئی۔

”تم یہاں رہتے ہو..... یہ گھر کس کا ہے؟“ راستے میں وہ اس سے سوال کر رہی تھی، شادی کے بعد وہ میٹے بھی اسی گھر سے گئی تھی اور ویسے کے بعد ایک مرتبہ افضل کی امی ملنے بھی اسی گھر میں آئی تھیں۔

”یہ گھر عبدالباری صاحب کا ہے..... وہ میرے اور اکرم بھائی کے استاد ہیں..... ہمیں کام دلاتے ہیں..... عبدالباری صاحب کی کوئی زینہ اولاد نہیں ہے مجھے میری محنت کی وجہ سے بہت عزیز رکھتے ہیں، بیٹا ہی مانتے ہیں..... اسی لیے میری شادی اور ایک ماہ تک جب تک ہماری دعوتیں اور مہمان داری چل رہی تھی اس گھر اور گاڑی کی سہولت بھی دی انہوں نے۔“ وہ بول رہا تھا اور بلی کے ارد گرد دھماکے ہو رہے تھے۔

”ایک مہینہ بعد وہ واپس انگلینڈ چلے جائیں گے..... بہت بڑے بزنس مین ہیں..... ابا آپک زمانے میں ان کے ڈرائیور تھے ڈرائیور ہمارا خاندانی پیشہ بھی ہے..... پارٹ ٹائم جاب سمجھ لو..... اصل میں ہمارا کام بھی عبدالباری صاحب کا محتاج ہے..... عبدالباری صاحب کا فلموں کے پروڈیوسر ڈائریکٹر سے بہت ملنا ملنا ہے..... انہی کے توسط سے ہم سرکس والے فلموں کے اسٹینٹ بن گئے۔“ وہ بولت رہا جیسے آج سارے پردے اٹھا دے گا

”ہاں..... میں اور اکرم بلکہ ہم سب ہی اسی کام سے منسلک ہیں۔ اب ہم دونوں مختلف فلموں میں ہیرو کے ایکشن سین کرتے ہیں۔ میں نے تمہیں کہا تھا ناں کہ ہیرو میرے بغیر زیرو ہے..... ہمارا باب ہیرو ہے بلی..... دعا کرو انہیں کچھ نہ ہو۔“ وہ پھر سسکنے لگا بلی کے ارد گرد آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

”اور سرکس میں کیا کرتے ہو تم؟“ اسے اپنی ہی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

”موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتا ہوں۔“ گاڑی کو زوردار بریک لگا کر وہ بھاگتا ہوا ایک بوسیدہ سے مکان کے باہر کھڑے ہجوم میں گھس گیا تھا۔

”چلا گیا تیرا ابا افضل..... تیرا ابا چلا گیا۔“ کسی نے دہائی دی گاڑی میں بیٹھی بلی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانا چلا گیا اس کے اندر بھی کچھ زور سے ٹو مارتھا۔

عشق بے گھر کرے عشق بے در کرے  
عشق کا سچ ہے کوئی ٹھکانہ نہیں  
ہم جو کل تک ٹھکانے کے تھے آدمی  
آپ سے مل کے کیسے ٹھکانے لگے

(جاویدا اختر)  
کب جنازہ اٹھا، کب صف ماتم ختم ہوئی، کب قل ہوئے..... وہ انجمنی بنی ان سب کے درمیان بیٹھی رہی۔  
یہ ایک بہت پرانا سا گھر تھا بوسیدہ کھنڈر نما لکڑی کا محرابی دروازہ جس کے دونوں طرف میں محرابی کھڑکیاں تھیں کمرے کی کھڑکیاں جو رنگین شیشوں سے مزین تھیں باہر گلی کی طرف کھلتی تھیں، لکڑی کی چوکھٹ اور صحن کے پتھوں بیچ اوپر کی منزل کی چوکور منڈیر جس کے اطراف میں رکھے گئے نیچے سے دکھائی دے رہے تھے۔

”یہ سب کیا ہے بلی؟“ اماں اس کے سامنے کھڑی

تھی۔ سارے گھر کا جائزہ لے کر ایک نظر چند ہی دنوں میں کمزور دکھائی دینے والی بلی کی سمت دیکھا۔  
 ”گھر ہے۔“ اسے اپنی ہی آواز کسی کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

”وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ تمہارا سرفوت ہوا تو یہاں اس گھر میں کیوں..... بات کیا ہے آخر تم کچھ چھپا رہی ہو؟“

”یہی گھر ہے ان کا..... وہ تو افضل وغیرہ کے مالک کا گھر تھا سب دھوکہ تھا، جھوٹ تھا۔“ وہ سسکنے لگی۔ ارد گرد بیٹھی عورتیں سمجھ رہی تھیں کہ سر کی وفات کا دکھ رلا رہا ہے۔

”کیا مطلب..... کیا کرتا ہے افضل؟ تجھے کہا تھا ناں کہ اس کی نوکری کے بارے میں تفصیلاً پوچھ لے لیکن اس وقت سوائے اس کے کچھ اور کہاں دکھائی دے رہا تھا تجھے؟“ ماں کی آواز قدرے بلند ہوئی۔ کچھ فاصلے پر بیٹھی افضل کی اماں اور بھابی نے چونک کر اس سمت دیکھا۔

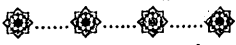
”موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلاتا ہے..... وہ اور اس کا بھائی..... فلموں میں ہیرو کے ایکشن سین کرنے والا اسٹنٹ ہے افضل، سرکس والے ہیں یہ اماں، ڈونکی کرتے ہیں جہاں کام مل جائے ادھر کارخ کر لیتے ہیں عبدالباری انگل کے ڈرائیور بھی ہیں یہ اور ان کی عورتیں.....“ وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کو روکی تو ماں نے حیرت سے ان سیلن زدہ دیواروں کو دیکھا۔

”تم نہیں جانتی بیٹی کہ تمہاری ساس اور بھادج کیا کام کرتی ہیں؟“ ساتھ بیٹھی عورت نے آنکھیں چھا کر اس کی سمت دیکھا۔

”نہیں۔“ روتی آنکھوں سے اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”تمہاری ساس تو فلموں میں ہیروئن کے پیچھے رقص کرتی تھی اور یہ تمہاری بھابی، اس کو کبھی لے کر کس کس اسٹوڈیو کے دھکے نہیں کھائے تمہاری ساس نے کہ اسے بھی ایکسٹرا کا کام مل جائے لیکن بے چاری کو نہیں ملا.....“

اور تم خوب صورت ہو تمہیں اتنے دن عبدالباری صاحب نے گھر رکھا تو اسی لیے رکھا کہ شاید وہ تمہیں کہیں کام دلوا دیں..... یہ لوگ تو اتنے عرصے سے اسی انتظار میں ہیں کہ کسی اچھی فلم میں کام مل جائے تو وارے نیارے ہو جائیں۔“ وہ تو جیسے سارے راز فاش کر رہی تھی، بلی کی آنکھوں کے اندھیرا چھانے لگا۔  
 ”بلی..... بلی۔“ ماں کی آواز سماعت سے نکل رہی اور پھر وہ ہوش و خرد سے ریگانہ ہو گئی تھی۔



”پلاؤ کی خوشبو آ رہی ہے؟“ اسماعیل نہا کر نکلا تو باورچی خانے سے نکلتی اماں کو دیکھ کر یونہی پوچھا اس کو بھوک بھی لگ رہی تھی۔

”ہاں آج تم دونوں کی چھٹی تھی تو سوچا کہ کچھ اچھا پکا لوں..... ویسے بھی پورا ہفتہ دال سبزی ہی پکتی ہے۔“ وہ تویلے سے سرگڑتا وہیں چار پائی پر بیٹھ گیا۔

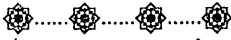
”سچ کہوں، ماں تو مجھے نہیں اچھا لگتا عزت کی کمائی کی چیزیں استعمال کرنا۔ آپ نے میرے کمرے میں وہ بیڈ شیٹ بچھائی ہے اسے ابھی اٹھا دیں..... مجھے غصہ آتا ہے میں نے نوکری کی اجازت دے دی یہی بہت ہے۔“ اس کے لہجے کی گئی سے نہیں بہت پیچھے کی یاد بازگشت کرنے لگی۔

”میری کمر ٹوٹی ہے فردوس..... مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میرے ہوتے تم کام کے لیے گھر سے باہر نکلو..... ہمت نہیں ٹوٹی ابھی میری۔“

”کیا ہوا..... کیا سوچ رہی ہیں؟“ اسماعیل نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بیٹا۔ میں تمہارے ابا سے کھانے کا پوچھ لوں۔“ وہ سر جھٹکتی اندر چلی گئیں۔ وہ سر تھا مے بیٹھے تھے کب سے یونہی دل و دماغ میں ایک شور سا برپا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے..... میں جن راہوں سے بچ کر نکل آئے تھے وہ پھر بلا رہی ہوں اندر کی پریشانی چہرے پر عیاں ہو رہی تھی مانتے پر پسینے کے قطرے بھی چمک رہے تھے۔

”چلیں کسی وقت کرتی ہوں بات دونوں سے.....  
آپ فکر نہ کریں فی الحال تو آپ سے کھانے کا پوچھنے آئی  
تھی آپ کو پریشان دیکھ کر بھول ہی گئی۔“  
”ہاں لے آؤ۔“ وہ پوچھل لہجے میں بولے۔ فردوس  
اثبات میں سر ہلاتی باہر نکل گئیں۔



”تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے۔“ اسود کی سوئی وہیں  
انگی ہوئی تھی۔  
”عالمہ جو بہت دنوں بعد آئی تھی اس کی بات سن کر پھر  
غصے میں آ گئی پھوپھو اور امی نے بھی حیرت سے اسود کی  
سمت دیکھا۔

”یہ کیا معاملہ ہے عالمہ؟“ پھوپھو کی نگاہیں اسود پر  
نکلیں۔

”کیا بتاؤں پھوپھو..... میرے اسکول میں ایک ٹیچر  
ہے پتہ نہیں اس اسود کو کیا نظر آ گیا ہے اس میں..... پاگل  
ہو رہا ہے..... کسی لوئر مڈل کلاس کی ہے، بودی سی اور وہ  
محترمہ شادی کے لیے اسے اتنی پسند آ گئی ہیں کہ میرا دماغ  
کھار رہا ہے اب۔“ عالمہ نے ریوٹ شیڈ کر میز پر رکھا اور  
جانے کے لیے کھڑی ہوئی۔

”عالمہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے یہ نادانی کے فیصلے بعد  
میں رلاتے ہیں اور جہاں تک شادی کی بات ہے تو شادی  
اپنی کلاس کے لوگوں میں ہی کرنی چاہیے۔“ پھوپھو نے  
عالمہ کی طرف داری کی تو وہ جاتے ہوئے رہی۔

”شکر ہے کہ کسی کو تو عقل ہے اس گھر میں..... پھوپھو  
میں اس کی شادی کے خلاف نہیں ہوں لیکن اس لڑکی کی  
بات یہ آج کے بعد نہیں کرے گا ورنہ میں اس لڑکی کو جواب  
سے نکال دوں گی اور ہنسی خوشی نہیں نکلاؤں گی بلکہ اتنی  
اسلٹ کرواؤں گی اس کی کہ وہ اسکول تو کیا شہر ہی  
چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی اور اس سب کی وجہ اسود  
ہوگا۔“ عالمہ کی بات سن کر اسود جھلا کر رہ گیا۔

”اور مجھے یہ سبجہ میں نہیں آ رہا عالمہ کہ تمہیں اتنا  
اعتراف کس بات پر ہے اس لڑکی کو پسند کرنے پر یا اس

”کھانا کھائیں گے اسماعیل کے ابا؟“ فردوس اپنے  
دھیان میں اندر داخل ہوئیں۔ انہیں مضطرب دیکھ کر فکر  
مندی سے ان کی طرف بڑھیں۔  
”کیا ہوا..... پریشان لگ رہے ہیں، طبیعت تو ٹھیک  
ہے ناں آپ کی؟“

”ہاں ٹھیک ہے مجھے لگتا ہے فردوس کہ اسماعیل کی  
عزت کے لیے فکر جائز ہے اس کی پریشانی بجا ہے تمہاری  
فکر بھی اپنی جگہ جائز ہے تم ایک بار عزت اور اسماعیل سے  
بات کر کے دیکھو۔“ وہ رومال سے ماتھے پر آپا پسینہ صاف  
کرنے لگے۔

”کیسی بات؟“ وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔  
”اگر عزت کے لیے کہیں باہر رشتہ دیکھیں گے تو  
طرح طرح کے مسائل ہوں گے پہلی بات تو یہ ہے کہ  
ہمارے اس گھر میں رشتہ لے کر آئے گا کون؟ اور اگر کوئی  
آ بھی گیا تو ہم چیز اور زیور کے نام پر اپنی عزت کو کچھ نہیں  
دے سکتے اس لیے میں سوچ رہا تھا کہ عزت اور اسماعیل  
ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں اس گھر کی مجبوریاں ضروریات  
سب ان کے سامنے ہے تو اگر ہم ان دونوں کو ایک  
کر دیں۔“

”آپ سے پہلے یہ خیال مجھے بھی آیا تھا“ میں نے  
باتوں باتوں میں عزت سے اس گھر کے مسائل اور اس  
کے رشتہ کے حوالے سے اپنی پریشانی کا تذکرہ بھی کیا تھا  
میرا خیال ہے کہ وہ اسماعیل کے بارے میں ایسا نہیں  
سوچتی، عزت کو گود میں لیتے ہوئے میں نے بھی یہی سوچا  
تھا کہ اس کو ساری زندگی اپنے ساتھ رکھوں گی..... اپنی  
نظروں کے سامنے اسماعیل نے نبضی عزت کو دیکھ کر مجھ  
سے پوچھا تھا۔ ”یہ کون ہے اماں؟“ تو میں نے کہا تھا یہ گڑیا  
اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بھیجی ہے۔ یہ ہمیشہ ہمارے  
ساتھ رہے گی..... تب یہی خیال میرے دل میں بھی آیا  
تھا کہ میں عزت کو اسماعیل کی دہن بناؤں گی۔“

”ہاں تو ایک مرتبہ پھر بات کرنے میں کیا حرج ہے؟  
اگر عزت نے پہلے ایسا نہیں سوچا تو اب سوچ لے گی۔“



دیکھا۔

کے غریب گھرانے سے تعلق رکھنے پر۔“

”دونوں پر۔“ عالمہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

”دیکھو اسود میرے سسرال والوں کا اسٹیٹس، میرا

اسٹیٹس تمہارے سامنے ہے۔ خود بابائے نئی نعت سے یہ

مقام اور یہ شہرت حاصل کی ہے تمہارا ایک غلط فیصلہ ہم

سب کی زندگیوں پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ وہ کون ہے؟ کس

فیملی سے لی لاٹا لگرتی ہے؟ ہم کچھ نہیں جانتے۔ بس تم

آج کے بعد اس کی بات نہیں کرو گے۔“ عالمہ نے انگلی اٹھا

کر تنبیہ کی۔

”عالمہ بالکل صحیح کہہ رہی ہے اسود اور تمہارے لیے

لڑکی میں خود دیکھوں گی۔“ پھوپھو نے عالمہ کی ہاں میں ہاں

ملائی۔

”او فار گاڈ سبک پھوپھو۔۔۔۔۔ آپ تو خاموش ہی

رہیں۔۔۔۔۔ میری زندگی کا فیصلہ میں خود کروں گا اور عالمہ

میں آئندہ تم سے اس کے بارے میں نہیں پوچھوں گا۔۔۔۔۔

تم اس کے ساتھ کچھ ایسا ویسا مت کرنا پلیز۔“ وہ بات ختم

کر کے خود ہی باہر نکل گیا۔ سارہ (عالمہ اور اسود کی امی) کو

اسود کا یوں خاموشی سے چلے جانا کھل رہا تھا۔

.....

”یہ کیا ہے؟“ وہ حسب معمول شام کی چائے لیے

چھت پر بیٹھا تھا بہت دنوں سے عزت دیکھ رہی تھی کہ وہ

کام پر نہیں جا رہا۔ عزت نے ایک لفافہ اس کی طرف

بڑھایا۔ وہ حیرت سے اس کی سمت دیکھنے لگا اس کا لہجہ

بہت دنوں سے نرم اور مہربان تھا۔

”آج دوسری خواہ کی بھی نیچر بازار جاری تھیں تو میں

نے آپ کے لیے یہ شلوار قمیص کا کپڑا منگوادیا۔۔۔۔۔ مجھے

بہت پسند ہے بد رنگ۔“ اس نے لفافہ ایک بار پھر آگے کیا

جسے اسماعیل نے مسکراتے ہوئے تمام لیا۔

”شکریہ۔۔۔۔۔ لے تو رہا ہوں لیکن کبھی سلوؤں کا

نہیں۔“ وہ چائے کا کپ رکھ کر الٹ پلٹ کر کپڑا دیکھنے

لگا۔

”کیوں؟“ عزت نے حیرت سے اس کی سمت

”تم جانتی ہو کیوں۔۔۔۔۔ مجھے تمہارا کماتا ہی پسند نہیں

ہے۔ بس تم اسے میری ضد سمجھ لیا کچھ اور تمہیں اجازت

دے دی وہی بہت ہے۔“ اب وہ چائے پینے لگا تھا۔

”یعنی دل سے راضی نہیں ہیں، آپ ناراض ہیں اب

بھی؟“ وہ بھی وہیں کھڑی ہو گئی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔“

”آپ بہت دنوں سے کام پر نہیں جا رہے کوئی مسئلہ

ہے کیا؟“ اس نے موضوع بدلا۔۔۔۔۔ ویسے بھی وہ چھت پر

اسی لیے آئی تھی تاکہ اس سے پوچھ سکے کہ وہ کام پر کیوں

نہیں جا رہا۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ چاروں ایک

دوسرے کی ناراضی مول نہیں لے سکتے تھے۔

”ہاں۔۔۔۔۔ جاب ختم ہو گئی بہت عجب آدمی تھا نوکری

ڈرائیور کی دی اور کام وہ اور بھی لیتا تھا کبھی پنکھا ٹھیک کر دے

کبھی بازار سے سودا لے آؤ بس پونہی اوپر سے کھانے پینے

کی بھی رعایت نہیں تھی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ تو اب کیا سوچا ہے؟“ وہ واقعی اس کے لیے

دکھی ہوئی اسماعیل زندگی میں جتنا آگے بڑھنا چاہتا تھا اتنی

ہی رکاوٹیں آ رہی تھیں۔

”ایک دو جگہ بات کی ہے، امید تو ہے کہ کام ہو جائے

گا۔“ وہ ہمیشہ کی طرح ہر امید تھا۔

”ان شاء اللہ۔“ اس نے کہا اور دونوں چائے پینے

لگے تھے۔

.....

زوہیب اور عالمہ کا شمالی علاقہ جات کی سیر و سیاحت کا

پروگرام بن گیا تھا اسکول سے کچھ دن کی چھٹیاں لے کر وہ

کام کے بوجھ سے ذہن کو آزاد کرنا چاہتی تھی زوہیب بھی

کافی عرصے بعد وطن واپس آیا تھا اس کے سسر بھی ان

دنوں میں نہیں تھے لیکن انہوں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا

تھا۔ عالمہ کو ان کی کوئی خاص پرواہ بھی نہیں تھی۔ اس کا ذاتی

خیال تھا کہ زوہیب کا باپ زوہیب کی ذمہ داری ہے۔۔۔۔۔

ابھی بھی ان کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر اس نے زوہیب

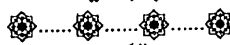
سے ضد کر کے یہ پروگرام ترتیب دے دیا تھا..... زوہیب کو ان کی اچھی خاصی فکر تھی اور اسی بات کو لے کر وہ عائلہ سے الچڑھا تھا۔

”دیکھو عائلہ جس طرح تم نے شاپنگ اور گھومنے پھرنے کا پروگرام بنا رکھا ہے دو تین لاکھ روپے آرام سے خرچ ہو جائیں گے اوپر سے بابا کی فکر الگ رہے گی مجھے۔“

”یہ تم کب سے مڈل کلاس لوگوں کی طرح حساب کتاب کرنے لگے ہو اور تم کیوں بھول جاتے ہو زوہیب کہہ ہمارے اس گھر میں ہم دونوں کماتے ہیں نہ تو کسی بھی قسم کا فضول خرچ تم کرتے ہو اور نہ میں..... ایک سال کے بعد یہ کچھ دن ہوتے ہیں آؤ ٹنگ کے اور رہ گئی بات بابا کی تو وہ تمہارا پر ایلیم ہے تم ان کے لیے کسی ملازم کا انتظام کر دو جاتے دن مکمل طور پر ان کے ساتھ رہے۔“ وہ اپنا بیگ تیار کرنے لگی۔

”دودن میں کون ملے گا عائلہ..... یار بہت ضدی ہو تم کرتا ہوں کچھ۔“ وہ موبائل پر نمبر ملانے لگا۔

”دیکھو زوہیب ان دنوں میں امی اور امی کے گھر کے مسائل خصوصاً اسو سے دور رہنا چاہتی ہوں اسکول کی روٹین بھی مجھے تھکا رہی تھی، ویسے بھی ہم لوگ لاسٹ ایئر دیئے گئے تھے۔ پورا سال ہو گیا ہم دونوں گھر سے نہیں نکلے اور زوہیب میرے کوئی بچے تو ہیں نہیں جن میں دل کو بہلا لوں سو پلیز جو کرنا ہے ایک دو دن میں کرو میں بالکل ریلیکس ہو کر جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے بات ختم کر دی۔ زوہیب موبائل لے کر باہر نکل گیا تھا۔



موسم بدل نہا تھا جاتی گرمیوں اور آتی سردیوں کے دن تھے سرشام ہی فضا میں خنکی بڑھنے لگتی تھی صحن میں لگے درخت کے پتے زرد ہو کر صحن کے فرش پر گرنے لگے تھے وہ صحن میں بچے تخت پر بیٹھی کاپیاں چیک کر رہی تھی جب اسماعیل جلالت میں سیڑھیاں اترتا نیچے آیا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا..... اس نے ایک نظر اٹھا کر

دیکھا، وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ کچھ دنوں سے نوکری ختم ہونے سے وہ بہت پریشان تھا۔ تائی امی بتا رہی تھیں کہ اب اس کے دل میں اپنا ذاتی کاروبار کرنے کا خیال آ گیا ہے اور ان دنوں اسی بھاگ دوڑ میں ہے۔

”چائے لے لو عزت۔“ تائی امی شاید عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں۔ چائے بنا کر وہیں لے آئیں، دو پیالی چائے اور بسکٹ، کام کی تھکان کی وجہ سے بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔ اس نے کاپیاں سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔

”اسماعیل کہیں گیا ہے کیا؟“ وہ دروازہ بند کر کے وہیں اس کے پاس آ بیٹھیں۔

”جی تائی امی بہت جلدی میں لگ رہے تھے کوئی فون آیا تھا شاید..... بس فون سنا اور چلے گئے۔“ اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔

”شاید کام کے سلسلے میں ہی گیا ہو کہیں..... تم بتاؤ اسکول کیسا جا رہا ہے؟“ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے آسمان کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

”اچھا جا رہا ہے تائی امی..... میڈم عائلہ تو دس دن کی چھٹی پر گئی ہیں روپے پیسے کی کمی تو ہے نہیں ان لوگوں کو ٹیچرز بتا رہی تھیں کہ ہر سال دونوں میاں بیوی گھومنے پھرنے جاتے ہیں اور میڈم عائلہ گرمیوں سردیوں کی شاپنگ لاکھوں میں کرتی ہیں۔“ وہ چائے کی چسکیاں لینے لگی۔

”بس بیٹا امیر لوگوں کی زندگی کے ڈھپ ہی نزلے ہوتے ہیں لیکن سچ بتاؤں تو سکون کا تعلق دولت سے ہرگز نہیں، ایسی عورتوں کو اگر تنگ دستی میں گزارہ کرنا پڑے ناں تو فوراً شوہر سے کنارہ کر لیں۔“ فردوس کے چہرے پر عجیب سی اداسی تھی یوں جیسے کچھ یانا گیا ہو کوئی نیاد۔

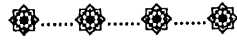
”ہوں۔“ وہ درخت پر بیٹھی چڑیوں کو دیکھنے لگی۔

”ضرورت بات اور آسائشات میں بہت بڑا اور واضح فرق ہے بیٹا لیکن المیہ یہ ہے کہ سائش کو ضرورت بننے دیر نہیں لگتی اور ضرورت کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، یہ

آسان نشان جو ضروریات بن جاتی ہیں، محبت کی قیچی ہیں اور محبت کو خوب صورتی سے کاٹ کر مردہ کر دیتی ہیں۔ جہاں محبت مر جائے وہاں نہ سکون ہوتا ہے نہ خوشی۔“ تائی امی عجیب سے انداز میں اسے کچھ سمجھا رہی تھیں، کچھ ایسی ہی باتیں اسماعیل نے بھی کی تھیں، وہ سر جھٹک کر چائے پینے لگی۔

”ایسا نہیں ہے تائی امی..... میڈم عاملہ کا شوہران سے بہت محبت کرتا ہے اور ان کی ہر فرمائش پوری کرتا ہے دونوں بہت خوش اور مطمئن ہیں۔“ اس کی بات سن کر تائی امی نے عجیب سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا یوں جیسے اس کی نادانی اور بے وقوفی پر ہنسی ہوں۔

”رات کے کھانے میں دال بھی پکائی ہے اور خاگینہ بھی..... تم کا پیوں سے فارغ ہو کر روٹیاں پکالو، میں تمہارے تایا ابو کو دیکھ لوں۔“ وہ خالی کپ لے کر اٹھ گئیں، شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔



عجیب سا جس تھا دل میں اور باہر کا موسم خنک ہو رہا تھا۔ وہ رات کے کھانے کے بعد جلدی سونے کا عادی نہیں تھا اب اس کے پاؤں دبانے کے بعد جھپٹ پڑ گیا تھا۔ ”بل گئی نوکری؟“ وہ عشاء کی نماز کے بعد اوپر آئی اسے ہر صورت میں اسماعیل کی ناراضی دور کرنا تھی۔

”ہاں بل گئی..... مالی بابا کی وساطت سے“ لوگ آگے جاتے ہیں ترتی کرتے ہیں اور میں پیچھے ہی پیچھے جا رہا ہوں..... اسی لیے سوچ رہا ہوں کہ بزنس شروع کر لوں ایک دو دوستوں سے اس سلسلے میں بات بھی کی ہے، بس تم دعا کرو۔“

”مجھے آپ سے بات کرنا ہے اسماعیل بھائی۔“ وہ سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اسماعیل کے دراز قد کے پیچھے سے جھانکتا چوڑھویں کا چاند عزت کے چہرے کو روشن کر رہا تھا۔

”کہو..... سن رہا ہوں۔“

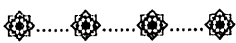
”آپ نے مجھ سے جو کچھ بھی کہا، میں نے کبھی ویسے

نہیں سوچا میں بس اس گھر کے حالات ٹھیک کرنے میں آپ کے ساتھ ہوں، مجھے آپ کی فکر ہوتی ہے..... آپ مجھے جاب کرنے سے روکتے تھے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کے پیچھے آپ کا کیا جذبہ ہے لیکن میں آپ کو اس نظر سے دیکھتی ہی نہیں، بہت عزت کرتی ہوں آپ کی، پلیز آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں، بات نہیں کرتے، میری خریدی ہوئی کوئی چیز استعمال نہیں کرتے، پلیز اسماعیل بھائی ایسے تو نہ کریں..... آپ ناراض تو نہ ہوں مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔“ وہ رو دینے کو ہوئی۔

”ایسے ہی میں بھی تمہاری بہت فکر کرتا ہوں عزت..... ہر انسان کی ایک سوچ ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ زندگی گزارتا ہے، میرے نزدیک دولت آسانشات اور اونچے خواب وہ ویلو ہیں رکھتے جو عزت چھوٹے سے گھر کا سکون اور محبت رکھتی ہے۔ ہاں پیسہ ضروری ہے لیکن ثانوی حیثیت رکھتا ہے میرے لیے..... شاید میں غلط ہوں، میری سوچ غلط ہو لیکن میری غلطی تھی جو تم پر حکم چلاتا رہا، تمہاری اپنی زندگی ہے تم اسے اپنے انداز سے گزار سکتی ہو اور میں تم سے ناراض بھی نہیں ہوں۔“ بات کے آخر میں وہ مسکرایا۔

”لیکن مجھے کیوں لگتا ہے کہ آپ ناراض ہیں۔“

”یہ تم اپنے دل سے پوچھو شاید اس کے پاس جواب ہو..... میرے پاس تو نہیں ہے جواب، میں نے کہا ناں میں ناراض نہیں ہوں۔“ وہ بات ختم کر کے نیچے کی طرف بڑھ گیا تھا۔



”مجھے نہیں رہنا تمہارے ساتھ، جھوٹے ہوتے، دھوکے باز ہو۔“ بلی افضل پرچر دھوڑی۔ وہ مجرم بنا کھڑا تھا۔

”میں نے تمہیں بتانے کی کوشش کی تھی، تم سننا ہی نہیں چاہتی تھی میں نے تمہیں اشاروں میں بھی بتایا اور صاف الفاظ میں بتانے کی کوشش بھی کی۔“ وہ سر تھا مے بیٹھ گیا، یہ محبت نے کہاں لا ہنسایا۔ وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور وار اور مجرم بن گیا تھا وہ تو نہیں آیا تھا بلی

آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں مقیم ہوں

# آنچل تجارتی

ہم بروقت ہر ماہ آپ کی دلیمرہ فراہم کریں گے

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 850 روپے

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

8000 روپے

میدل ایسٹ ایشیائی افریقہ یورپ کے لیے

6000 روپے

رقم ذیما نڈارٹ منی آرڈر منی گلاس او بیزنس یونین کے  
ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔

مقامی افراد

ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر

0316-0128216

موبائل کیش اکاؤنٹ نمبر

0300-8264242

رابطہ: طاہر احمد قریشی 0300-8264242

نئے آئی گروپ آف پبلی کیشنز

81 پی پی بی کلب آف پاکستان

اسٹیڈیم روڈ آنچل پریس کراچی 75510

فون نمبر: 922-35620771/2

naeyufaq.com

Info@naeyufaq.com

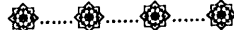
کے راستے میں اس نے تو بتانے کی کوشش بھی کی تھی، بلی نے سننے اور سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ سامنے کھڑی تھی وہ جو روز راستے میں آ جاتی تھی جوابات کرنے کا بہانہ ڈھونڈتی تھی..... محبت کا دعویٰ کر بیٹھی تھی۔ بغیر کسی حیل و حجت کے سادگی سے نکاح پر بھی تیار ہو گئی تھی، وہ سب کیا تھا۔

”کیا کوشش کی تھی تم نے؟ غلطی ہو گئی مجھ سے جو تم سے بات کی، تم سے محبت کی، تمہارے ساتھ شادی کی، مجھے کیا تھا کہ تمہاری پیاری شکل کے پیچھے کتنا گھناؤنا چہرہ ہے۔ پاگل تھی میں بے وقوف تھی۔ مجھے تو اسی دن جان جانا چاہیے تھا جس دن تمہاری ماں بھائی اور بھائی اس کوشش سے یہاں شفٹ ہو گئے تھے۔ میں نے تو اسے اور تمہارے درمیان کوئی امتیازی فرق دیکھا ہی نہیں افضل لیکن تم نے مجھے دھوکہ دیا۔“ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔ دروازے سے لگی ماں بھئی آنکھوں سے بیٹے کی بربادی کا حال دیکھ رہی تھی۔ یوں اس کے باہر نکلتے ہی پیچھے ہٹ گئی۔

”میں نے کہا تھا ناں کہ اسے بتا دینا۔“

”بتایا تھا ماں اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی تھی کہ ہم لوگ کئی نسلوں سے سرکس میں کام کرتے ہیں لیکن میں جب بھی ایسی کوئی بات اسے بتانے لگتا تھا وہ مجھے روک دیتی تھی۔“ وہ بھی رو دیا۔

”بس جو بھی ہوا..... یہ تو طے ہے کہ محبت نہیں کی اس نے تجھ سے..... بس تیری غلط فہمی تھی وہ..... محبت تو فروس کرتی ہے اکرم سے اور میری پسند بھی دنیا دیکھی ہے میں نے تجربہ ہے مجھے۔ انسان کی پرکھ ہے مجھے..... یہ بلی جیسی لڑکیاں جوانی کی چمک سے متاثر ہو کر کسی کو بھی پسند تو کر سکتی ہیں مگر غنا نہیں سکتیں۔“ وہ بات کر کے پلٹ گئیں۔ افضل شکست خوردہ قدم اٹھاتے باہر نکل گیا تھا۔



تائی امی کے کمرے کی لائٹ آن تھی، وہ جو عشاء کی نماز ادا کر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی تائی امی کو

جاگتا دیکھ کر ان کے کمرے کے دروازے میں رک گئی وہ بھی جائے نماز پر بیٹھی تھیں، اسماعیل ابھی تک نہیں آیا تھا۔  
”کیا ہوا عزت بیٹی، کوئی بات ہے کیا؟“ انہوں نے اس کی سمت دیکھا۔

”نہیں تائی امی..... آپ کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھی تو اس طرف آ گئی، آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟“  
”ہاں بیٹا، اسماعیل کا انتظار کر رہی تھی۔ نئی نوکری بھی بہت سخت ہے اس کی دیکھ لو..... گیارہ بج گئے لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا۔“

”آپ نے فون کیا؟“  
”نہیں..... میں وظیفہ پڑھ رہی تھی اس دوران بات نہیں کرتے..... بس ابھی پڑھ کر فارغ ہوئی تو گھڑی کی سمت دیکھا، تم فون کر کے پوچھو اسے، کہاں رہ گیا؟“ وہ ماں تھیں فکر مند ہو رہی تھیں۔

”جی میں ابھی پوچھتی ہوں۔“ اس نے میز پر رکھا تیا ایا فون کا اٹھا اور اسماعیل کا نمبر ملانے لگی۔ بیل جا رہی تھی لیکن وہ فون اٹھا نہیں رہا تھا اسے بھی فکر ہونے لگی۔  
”کیا ہوا..... فون نہیں اٹھا رہا کیا؟“ اس سے پہلے کہ وہ فنی میں سر ہلائی باہر موٹر سائیکل کی آواز آئی۔

”آگئے۔“ وہ دروازہ کھولنے مڑی تائی امی بھی دعائیں مصروف ہو گئیں۔

”کہاں رہ گئے تھے اسماعیل بھائی؟ اتنی دیر لگا دی آپ نے تائی امی کو فکر ہو رہی تھی۔“ وہ دروازہ کھولتے ہی فکر مندی سے بولی۔ وہ موٹر سائیکل سمیت اندر آیا۔

”ہاں دیر ہو گئی..... تمہارا فون آ رہا تھا میں نے اسی لیے کال ریسیو نہیں کی کہ گھر کے پاس تھا بالکل..... بس جہاں کام پر جا رہا ہوں وہاں کچھ مسائل ہیں اور آج تو بہت ہی مسئلہ ہو گیا جن کے لیے مجھے جا بلی ہے ان کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی، گھر میں کوئی نہیں تھا تو مجھے ہی ان کے ساتھ ہاسٹل جانا پڑا۔“ وہ موٹر سائیکل کھڑی کر کے غسل خانے میں گھس گیا، وہ اس کے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔

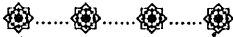
”کیا پکایا ہے؟ بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ وہ امی ابا کو سلام کر کے وہیں باورچی خانے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آؤ کو کونھی پکایا..... روٹی تازہ پکائی ہے۔“ وہ اس کے لیے کھانا رکھ کر دوسرے چولہے پر چائے کا پانی رکھتے ہوئے بولی، بھوک اتنی شدید تھی اسماعیل نے ہاٹ پاٹ میں رکھی پہلی روٹی نکال کر کھانا کھانا شروع کر دی۔

”تم نے صبح اسکول نہیں جانا کیا؟ اتنی دیر ہو گئی ہے سو جاؤ۔“ وہ اس کے آگے چائے کا کپ رکھ رہی تھی جب وہ مسکرا کر بولا۔

”جی جانا تو ہے..... آپ کا انتظار کر رہی تھی اب سونے جا رہی ہوں۔“ وہ برتن سمیٹ کر کمرے کی طرف بڑھی..... اسماعیل نے بہت دھک سے اپنی تنہائی کو محسوس کیا۔

”اگر تم ہاں کر دو عزت تو یہ گھر ہمیشہ آباد رہے..... میری فکر اور انتظار کرنے والی میرے لیے کھانا گرم کرنے والی صرف تم ہو اور تم ہی رہو۔“ وہ سوچ کر رہ گیا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا، کچھ خواہشیں حسرت بن کر دل کو دھکی کر دیتی ہیں۔



”کیسے ہوا افضل؟ بہت دن ہے تم نے چکر نہیں لگایا۔“ عبدالباری صاحب آئے تھے، پھونسی بیٹھک میں افضل اکرم اور اماں بیٹھے تھے، بجلی جو گھر چھوڑ کر جانے والی تھی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے نہ جا سکی تھی لیکن اس نے افضل سے بات چیت بند کر رکھی تھی اس سبب سمجھا آئیں تو اس نے منہ پھیر لیا تھا۔

”بس ابا کے بعد گھر سے باہر نکلنے کو جی ہی نہیں چاہتا..... گھر میں ہوتا ہوں تو ابا کی موجودگی کا احساس رہتا ہے ان کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔“

”لیکن بیٹا ایسا کب تک چلے گا..... کام تو کرنا پڑے گا ناں، حاجی صاحب کا فون آیا تھا تمہاری وجہ سے ان کی شوٹنگ رکی ہوئی ہے۔“ وہ بول رہے تھے دروازے سے لگی بجلی ان کی ساری باتیں سنتی اپنے ایک ایک کر کے شک

سے یقین میں بدلتی جا رہی تھیں۔

کر چکی تھی۔

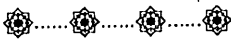
”تم غلط سمجھ رہی ہو سہیلی..... ہم نے سیٹھ صاحب سے تمہارے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں کی بلکہ فردوس بھابی بھی اب گھر سے نہیں نکلیں گی، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ افضل اس کے سامنے نے منت بھرے لہجہ میں کہا۔

”جھوٹ بول رہے ہو تم..... مجھے تمہاری کسی بات پر اب اعتبار نہیں ہے اور وہ گئی تمہاری فردوس بھابی کی بات تو اسے کہیں چانس ہی نہیں ملا اسی لیے تم لوگ مجھے مہرہ بنانا چاہتے ہو مگر یاد رکھو میں تم لوگوں جیسی بچہ نہیں ہوں۔“ اس کا غصہ اس کا سخت لہجہ ہی افضل کے دل کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

”بچہ..... کس کو کہا تم نے؟ میں نے تم سے محبت کی ہے اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ تم میری اور میرے گھر والوں کی عزت کی نہ کرو تم بھی انسان ہو اور ہم بھی اور تم نے..... محبت کی ہی نہیں۔“ افضل دھاڑا تو اماں اور فردوس بھی بہم گئیں۔

”ہاں کہا تمہیں بچہ، ہو تم لوگ بچہ سرکس میں کرتب دکھانے والے ناچنے والے بازی گر۔“ وہ زور سے دروازہ کھینچ کر باہر نکلی۔

”یاد رکھنا سہیلی تم نے میری محبت کا مذاق اڑایا ہے خون کے آنسو روگی تم ایک دن۔“ وہ بھی اس کے پیچھے دروازے تک آ کر دھاڑا۔ وہ جا چکی تھی محبت کی کہانی جو شاید محبت کی تھی ہی نہیں ختم ہو گئی تھی۔



”اور ہاں بیٹا..... وہ حاجی صاحب نئی فلم کے لیے بھی بات کر رہے تھے۔ میں نے تو فردوس کا بھی ذکر کیا لیکن کہنے لگے مشکل ہے ہاں اگر تمہاری دلہن مان جائے تو.....“ وہ بول رہے تھے اور سہیلی کے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی۔ وہ افضل کا جواب سنے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”تو اب یہ لوگ مجھے بھی اپنے کام میں شامل کرنا چاہتے ہیں یا اللہ یہ کیا غلطی کر بیٹھی میں۔“ وہ سامان پیک کرنے لگی۔

”نہیں سر..... سہیلی ہماری برادری کی نہیں ہے، وہ پہلے ہی ہمارے کام کو اچھا نہیں سمجھتی اور سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی اسے ایک باعزت اور طیب زندگی دینا چاہتا ہوں..... سوچ رہا ہوں کہ آہستہ آہستہ اس کام کو خیر باد کہہ کر صرف ڈرائیوری پر دھیان دوں، ابا کی زندگی بھی مفلوج ہو گئی اسی بچے کی وجہ سے..... ہم موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل چلا میں یا ہیرو کے ایکشن سین کریں جان تھیلی پر رکھ کر کام کرتے ہیں۔ اب فردوس بھابی بھی کام نہیں کریں گی ابا کی وفات کے ایک ہفتے بعد ہی اکرم بھائی کے ہاں بیٹا ہوا ہے اور میں نے اور اکرم بھائی نے فیصلہ کیا ہے کہ اب بھابی گھر سے نہیں نکلیں گی۔“ اس کی باتیں سن کر عبدالباری صاحب مسکرائے۔

”بہت اچھی سوچ ہے بیٹا، اللہ تمہیں کامیاب کرے..... فردوس بیٹی اور اکرم کو میری طرف سے مبارک دینا۔“ وہ اٹھ کر چلے گئے لیکن ان کے جاتے ہی سہیلی نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

”مجھے ایک منٹ نہیں رہنا یہاں..... تم لوگ مجھے بھی اپنے ساتھ اس کام میں شامل کرنے کی باتیں کر رہے تھے بلکہ جب فردوس کی دال نہیں لگی تو یقیناً تم لوگوں نے میرے لیے بات کی ہوگی، تم لوگ شاید بھول رہے ہو کہ میں کسی امیرے غیرے کی بیٹی نہیں ہوں بلکہ شہر کے سب سے امیر آدمی سیٹھ ہاشم علی کی بیٹی ہوں۔“ وہ اپنا بیگ پیک

گرم گرم پرت دار پراٹھے بناتے ہوئے دوسرے چولہے پر چائے کا پانی رکھے وہ بڑی توجہ سے ناشتہ تیار کر رہی تھی جب اسٹائیلو جینز پر چیک دار شرٹ پہنے تیار ہو کر کمرے سے نکلا وہ عموماً کام پر اتنا تیار ہو کر تو نہیں جاتا تھا عزت نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”یہ آج آپ کس سے ملنے جا رہے ہیں صبح ہی صبح اتنا تیار ہو کر؟“ دل میں پہلا سوال یہی ابھرا اور پتا نہیں کیوں

”آئیے بیٹھے۔“ اس کے لہجے میں بہت تلخی تھی، وہ ڈرتے ڈرتے پہنچ گئی۔ دماغ میں پہلا خیال یہ ہی آیا کہ شاید اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔  
”مس عزت مجھے آپ سے کچھ بات کرنا ہے۔“  
کچھ پرسنل بات۔“

”جی ہمم۔“ وہ ہکا بکا رہ گئی، ایسا کیا ہوا تھا؟  
”آپ میرے ساتھ کیسے تک چلیں۔“ میں آپ کو بتاتی ہوں۔“ اس کا لہجہ قدرے نرم ہوا۔ وہ اثبات میں سر ہلاتی اس کے پیچھے چل دی۔ کیسے میں اس وقت کوئی نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔۔ چائے کا آرڈر دے کر عائلہ نے بہت دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔

”مس عزت بات دراصل یہ ہے کہ اسود میرا بھائی ہے تھوڑا ضدی اور خود سر لیکن بہت قابل، بہت پُر اعتماد اور کامیاب بزنس مین بالکل ہمارے پاپا کی طرح۔۔۔۔۔ ہمارا ایک اسٹیشن ہے۔۔۔۔۔ ایک معیار ہے ہمارا رہن سہن سب آپ کے سامنے ہے، مجھے نہیں پتا کہ اسود کو آپ میں ایسا کیا نظر آیا لیکن اب جب ہم لوگ اس کی شادی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں تو اس نے گھر میں آپ کا نام لے کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔۔۔۔۔ آپ کے علاوہ مجھے کسی بھی لڑکی پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اسے آپ کے علاوہ کوئی اور لڑکی قبول نہیں۔۔۔۔۔ گھر میں عجیب طرح کی ٹینشن چل رہی ہے۔“ عائلہ کی باتیں سن کر اس کا دل خوف کے مارے تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔

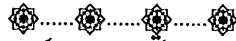
”اس کی زندگی ہے۔۔۔۔۔ وہ جانے اور اس کے مسائل لیکن آپ پلیز اپنے بارے میں کچھ انفارمیشن دے دیں مجھے۔۔۔۔۔ گھر کا ایڈریس وغیرہ اور آپ آگے ہیں کہیں؟“ عائلہ کی باتوں سے عزت کو کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب اس سے کیا چاہ رہی ہے۔ اس کا پتا تو وہ اسکول کے ریکارڈ سے بھی لے سکتی تھی۔

”جی نہیں۔۔۔۔۔ ایسا تو کچھ نہیں ہے ابھی تک اور میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ میں اپنے تایا اب اور تائی امی کی ساتھ رہتی ہوں۔۔۔۔۔ امی اور ابو کی ڈیوٹی تھوڑی ہو چکی ہے۔“ وہ روہاسی

ایک عجیب سا درد بھی محسوس ہوا، اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ جوتے برش سے صاف کرنے لگا۔  
”عزت میرا ناشتہ نہ بنانا۔۔۔۔۔ میں ایک دوست کی طرف جا رہا ہوں۔“

”آج کام سے چھٹی ہے کیا؟“ اس نے پوچھا عجیب اتفاق تھا کہ اسے بھی اسکول سے ڈیوٹی اسپرے کی وجہ سے چھٹی ملتی تھی۔

”ہاں چھٹی ہے اسی لیے دوست کی طرف جا رہا ہوں میں ناشتہ اسی کے ساتھ کروں گا۔“ وہ شیشے کے سامنے کھڑا بال ٹھیک کرنے لگا اور پھر اس کی طرف دیکھے بغیر موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے نکل گیا۔ اس کی بے اعتنائی پہلی مرتبہ عزت کو محسوس ہوئی، ایک دم دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ پھر بھی اپنا تایا اب اور تائی امی کا ناشتہ تیار کر کے کمرے میں لے آئی۔ آج بہت دنوں بعد دل چاہ رہا تھا کہ سب مل کر ناشتہ کریں لیکن اسماعیل کی غیر موجودگی بری طرح محسوس ہو رہی تھی، آخر یہ کون سا دوست تھا جس سے ملنے وہ صبح ہی صبح چلا گیا تھا۔



وہ زلزلہ تیار کر رہی تھی جب ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا تھا اسود اور عائلہ اندر داخل ہوئے دونوں کچھ اچھے ہوئے تھے۔ عائلہ جب سے واپس آئی تھی اسود سے دو درواری تھی پہلے اکثر وہ فون کر کے اسے بلا لیتی تھی لیکن اب کہیں بھی آنا جانا ہوتا تو اسکول کی گاڑی پر جاتی تھی یا پھر خود ہی ڈرائیو کر لیتی تھی آج بہت دنوں بعد اسود اسکول آیا تھا اور عائلہ کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی بات ہے۔۔۔۔۔ اس نے گزرتے ہوئے عجیب سی نظروں سے عزت کی سمت دیکھا یوں جیسے اسے کھا جائے گی۔۔۔۔۔ عائلہ کے غصے سے یوں بھی اسکول کا سارا الشاف ڈرتا تھا۔ اسود نے بھی اس کی سمت دیکھا لیکن اس کی نظروں میں غصہ نہیں تھا عزت کو عجیب سا احساس ہوا جیسے کچھ ہونے والا ہے کچھ دیر میں اسود واپس چلا گیا تھا عائلہ نے انٹرکام کے عزت کو اندر بلایا تھا۔

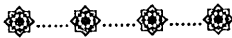
ہوئی۔

پہاڑ جیسا مسئلہ کھڑا ہوا تھا، وہ کمیٹی کا کیا کرے گی؟ جب تک اسماعیل کا کام نہیں جتا..... گھر میں مسئلہ مزید بڑھ جائیں گے۔ عالمہ اس کو سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر اٹھ گئی تھی۔ ”عزت..... میم عالمہ کہہ رہی ہیں کہ یہاں سائن کر دو۔“ مس فاطمہ نے اس کے سامنے ایک فائل لا کر رکھی۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ چونکی، فاطمہ کب آئی اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

”تمہارا ریزائن.....“ فاطمہ کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ درآئی..... اس نے بنا کچھ سوچے فائل کھول کر سائن کر دیئے اسٹاف روم سے چادر اور پرس اٹھا کر وہ آفس میں آئی، رجسٹر عالمہ کی میز پر رکھ کر وہ اللہ حافظ بکتی دفتر سے دروازے کی طرف بڑھی۔

”سنو عزت جاتے ہوئے اپنی دس دن کی سیلری لیتی جانا۔“ فاطمہ اس کے پیچھے آئی اور اب دونوں کا رخ کلرک کے آفس کی طرف تھا۔



”کیا ہوا..... کیوں رو رہی ہو؟“ وہ چھت پر بیٹھی رو رہی تھی کہ وہ اوپر آیا تھا سفید شلوار قمیص کے بازو فولڈ کیئے گریبان کا بنٹن نکلتا تھا، بال بھی کچھ الجھے ہوئے تھے یوں جیسے سو گرا بھی اٹھا ہو۔

”کچھ نہیں۔“ وہ آنسو صاف کرنے لگی۔

”کچھ تو ہوا ہے جو یوں آدھی رات کو چھت پر بیٹھی رو رہی ہو۔“ وہی اس کے لہجے کی پرانی خفگی عود کرتی تھی۔

”نہیں..... کچھ نہیں۔“ وہ میز سیوں کی طرف بڑھی۔

”صبح اسکول بھی جانا ہے اور تم اوپر بیٹھ کر رو رہی ہو..... اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ؟“ اسماعیل کو اس کی روتی شکل سے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔

”اسکول نہیں جانا.....“ جب ختم ہو گئی ہے۔“ اس نے پہلی میز پر سے مڑ کر اسے دیکھا..... وہ چھت پر کھڑا تھا اس کو حیرت ہوئی پھر مسکراہٹ ابھری۔

”تو مس عزت پلیز آپ یہ جاب چھوڑ دیں..... آپ جب تک یہاں رہیں گی اسے نظر آئی رہیں گی وہ ایسی بے ذوقانہ باتیں کرتا رہے گا۔“ عالمہ جو بات کہنا چاہتی تھی بلا آخر اس کے منہ سے نکل گئی، عزت کا ضبط جواب دے گیا اور وہ روئے گئی۔

”لیکن میم میرے گھر میں بہت مسائل ہیں، اسماعیل بھائی کی بھی جاب سیٹ نہیں ہو رہی اور.....“

”اسماعیل بھائی۔“ عالمہ نے ابرو چڑھا کر اس کی سمت دیکھا۔

”میرے تایا ابو کے بیٹے ہیں بھائی ہیں۔ ان کی پہلی جاب ختم ہو گئی ہے اور دوسری سے بھی وہ مطمئن نہیں ہیں۔“ وہ نشو سے آنسو صاف کرنے لگی، بیٹھے بٹھائے یہ اسود نامی مصیبت کہاں سے آگئی تھی۔

”کزن ہیں آپ کے..... بھائی نہیں ہیں۔“ عالمہ نے کچھ جتا یا تو وہ سمجھ نہ سکی۔

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ بھائی وہی ہوتا ہے جس نے آپ کے ابا باپ سے جنم لیا ہو کزن بھائی نہیں ہوتا..... ناخرم ہوتا ہے اور شریعت میں اس سے نکاح جائز ہے..... بس سیدھی سی بات ہے آپ کہہ دیں کہ آپ اپنے کزن سے منسوب ہیں اور یا پھر خاموشی سے جاب چھوڑ دیں۔“

عالمہ نے چائے دیکھ کر تھوڑی دیر خاموشی اختیار کی۔

”بہت مسئلہ ہو جائے گا میم..... اس سارے قصے میں میرا کیا قصور اور پھر آپ اپنے بھائی کو سمجھائیں ناں انہیں تو کوئی بھی بہت خوب صورت آپ کی کلاس کی لڑکی مل جائے گی پلیز میم۔“ وہ منت سے بولی۔

”دیکھیں عزت..... آپ پلیز میری مجبوری سمجھیں، ہاں اگر آپ کے جاب چھوڑنے کے بعد بھی وہ اپنی ضد پر قائم رہا تو میں آپ کے گھر رشتہ لے کر بھی آؤں گی اور جب تک آپ چاہیں گی جاب بھی رہے گی آپ کی۔“

عالمہ بات ختم کر کے اٹھ گئی..... عزت کے سامنے ایک

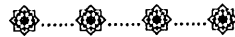


”تو میری بددعا لگ گئی۔“ وہ اس کے قریب آیا۔  
 ”آپ خوش ہو رہے ہیں؟“ وہ پھر رونے لگی اور اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

”مذاق کر رہا تھا پاگل اور جاب ختم ہو گئی تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ کوئی گورنمنٹ جاب تھوڑی تھی..... بس تمہارا شوق پورا ہو گیا بہت ہے اور ویسے بھی میرا بزنس شروع ہو گیا ہے بینک سے لون لیا ہے لیکن ماشاء اللہ جلد ہی لون بھی اتر جائے گا اور گھر کے حالات بھی بدل جائیں گے۔ میں بہت مطمئن ہوں۔“ اس نے نسلی دی۔

”آپ یہ نہیں پوچھیں گے کہ جاب ختم کیوں ہوئی؟“ وہ دوڑے سے انصاف کرنے لگی۔

”نہیں..... جو بھی ہوا اچھا ہوا تم جانتی ہو تمہارا گھر سے نکلتا مجھے پسند نہیں ہاں اس وقت میں نے اپنے اور تمہارے حوالے سے کچھ اور بھی سوچا تھا لیکن ابھی بھی کم از کم اپنے گھر کی کسی بھی عورت کو میں خوشی خوشی جاب کی اجازت تو ہرگز نہیں دوں گا پھر چاہے وہ اماں ہوں، تم ہو یا میری بیوی۔“ وہ بات کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ آنسو پھر بہنے لگے لیکن اب یہ آنسو جاب ختم ہونے کی وجہ سے نہیں تھے بلکہ اسماعیل کی اس خواب سے دستبرداری کے لیے تھے جو اس نے ان دونوں کے حوالے سے دیکھے تھے۔ ان آنسوؤں اور خوابوں کی برہادی کا سبب بھی وہ خود ہی تھی اسماعیل کی زندگی میں شاید کوئی اور اتنی گہمی آنسوؤں سے بہہ رہے تھے اور رات بھیک رہی تھی۔



”کیا جانا چاہتے ہو تم اس کے بارے میں؟“ اسود کی وہی ضد تھی ابھی بھی اس نے اماں اور عائلہ کو رشتہ دیکھنے جانے سے منع کر دیا تھا۔

”وہی جو میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اس کے بارے میں ساری معلومات لو اور تم اور امی اس کے گھر جاؤ..... تمہارے لیے یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے عائلہ لیکن تم یہ

کام کرنا ہی نہیں چاہتی زندگی مجھے گزارنی ہے تمہیں نہیں۔“ وہ چلا ہوا۔

”میں نے اس کے بارے میں سب کچھ پتا کر لیا تھا اور جو کچھ مجھے پتا چلا ہے ناں اس کے بعد تو کسی صورت یہ ممکن ہی نہیں..... اس کا نام عزت افضل ہے۔ والد کی وفات ہو چکی ہے، تانیا معذوری کی زندگی گزار رہا ہے۔ تانیا، باب اور دادا تینوں ہی سرکس میں موت کے کنوس میں موٹر سائیکل چلاتے تھے فلموں میں ہیرو کے امپیشن سین کرتے تھے۔ اسٹنٹ میں کی زندگی کیسی ہوتی ہے اس کا جواب اس کے باپ کی حادثاتی موت اور تانیا کی معذوری میں ہے۔ اس کی ماں مر گئی اور تانیا کی اور دادی بھی بہت عرصہ فلموں میں بطور ایکسٹرا کام کرتی رہیں..... چکی آبادی سے

مالحقہ محلے میں ایک پرانے سے دو منزلہ مکان میں رہتی ہے وہ..... یہی آبائی شہر ہے لیکن دس سال دوسرے شہر میں رہ کر آئے ہیں۔ تانیا کا بیٹا ہے جو لوگوں کے گھروں میں ڈرائیوری کرتا ہے اور تمہیں پتا ہے کہ یہ وہی لڑکا ہے جو میں نے بابا کی آسانی کے لیے کچھ دن کے لیے رکھا تھا۔ جب اس کے بارے میں میں نے ساری معلومات لیں تو مالی بابا سے پتا چلا کہ ان کے کسی دوست کی فیملی عزت کے رشتے کے سلسلے میں اس کے گھر گئی تھی۔“ عائلہ بول رہی تھی اور سب ساکت کھڑے تھے، کچھ فاصلے پر کھڑی پھوپھو نے لڑکھڑا کر بیڑھیوں کی ریلنگ تھام لی۔

”اس کی ماں مر گئی۔“ سماعت پر ہتھوڑے برسنے لگے تھے۔ بھابی نے مڑ کر ان کی سمت دیکھا تو وہ نظریں چرا گئیں۔

”اور دوسری بات جو شاید آخری بھی ہے وہ یہ کہ وہ اپنے اسی تایا زاد کو رزن سے منسوب ہے اور ابھی شادی کے سلسلے میں ہی اسکول سے بھی جاب چھوڑ گئی ہے..... امید ہے اب تمہارے سر سے بھوت اتر جائے گا۔“ عائلہ بات ختم کر کے اپنا پرس اٹھا کر چلی گئی اسود بھی سر جھکائے چند لمحے کھڑا رہا پھر وہ بھی باہر نکل گیا یوں جیسے ہار مان لی ہو۔

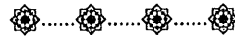
”سارہ..... وہ تمہاری بیٹی ہے؟“ بھابی کی آواز کہیں

دور سے آتی سنائی دی۔

”افضل مر گیا..... اور..... عزت..... میری بیٹی.....“  
آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

”لے جاؤ اس بچی کو اور جب بڑی ہو کر میرے بارے میں پوچھے گی ناں تو کہنا مر گئی تمہاری ماں۔“ بائیس سال پیچھے اس نے جس بچی سے جس خون سے جس رشتے سے جان چھڑائی تھی وہ ایک بار پھر اس کے عمائے آگئی تھی، لیکن جو نفرت اس وقت محسوس ہوئی تھی وہ تو وقت کے بہاؤ میں بہہ گئی تھی..... کتنے سال دوڑتا تھا افضل اور اپنی بچی کو پھر اپنے گناہ کی سزا سمجھ کر چپ سادھ لی تھی۔  
”عزت..... تمہاری عزت..... سارہ..... تمہاری بیٹی.....“ بھابی نے سہارا دے کر بٹھایا۔

”تم اسے بہو نہیں بنانا چاہتی نہ بہاؤ لیکن میں جاؤں گی اسے ملنے اسے دیکھنے..... اسے لینے..... بہت ہمت کر کے وہ بولیں تو انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔



موسم بدل رہا تھا بہت تیزی سے اسماعیل کا کاروبار بھی پھل پھول رہا تھا۔ اس کی نوکری ختم ہونے پر سوائے اسے کسی کو فاسوس نہیں تھا۔ ایک دور رشتے آئے لیکن وہی نتیجہ نکلا تائی امی نے باری باری ان دونوں کے سامنے تایا ابو کی خواہش کا اظہار بھی کیا تھا۔ پہلے وہ انکار کر دیتی تھی کہ اس نے بھی اسماعیل کے لیے ایسا نہیں سوچا تھا لیکن اس بار وہ خاموش رہی تھی سر جھکائے بیٹھی رہی تھی۔ اسے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اسماعیل بغیر کوئی جواب دینے خاموشی سے اٹھ کر چلا آ گیا تھا۔ اس کے یوں اٹھ کر چلے جانے پر عزت کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ شاید اب وہ اس کے لیے ایسا نہیں سوچتا تھا۔ شاید یہ نوکری کر کے، اس کی بات نہ مان کر اس نے واقعی اس کا دل دکھایا تھا۔ وہ اس وقت باورچی خانے میں رات کے کھانے کے برتن دھو رہی تھی تائی امی تایا ابو کے پاس کمرے میں تھیں۔ دو دن سے ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اس وقت بھی وہ چولہے پر ان کے لیے قبوہ کا پانی رکھے ساتھ ساتھ برتن دھو رہی تھی۔

جب اسماعیل آ گیا۔

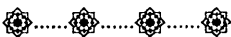
”کھل میرے ساتھ بازار چلنا..... موسم بدل رہا ہے تم اپنے اور اماں کے لیے کپڑے اور شالیں لے لینا۔“ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جی اچھا۔“ اب وہ اس کی کسی بات سے انکار نہیں کرتی تھی۔ ویسے بھی کیا دیا تھا اس ملازمت کے کچھ عرصے نے، اسماعیل کے دل سے اتر گئی تھی۔

”عزت امی اور بابا نے اس روز جو بات کی وہ میری بھی خواہش تھی لیکن اگر تم راضی نہیں تو کوئی زبردستی نہیں۔ اللہ کا کرم ہے کام اچھا چل رہا ہے دو تین سال تک میں تمہارے لیے اتنا تو جوڑ ہی لوں گا کہ تمہیں کسی اچھے گھرانے میں بیاہ سکوں..... ہاں امی اور بابا کے خدشات اور ان کی خواہش کے پیش نظر مجھے کوئی اعتراض اب بھی نہیں ہے۔“ وہ بہت سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ عزت خاموشی سے سنتی رہی۔

”وہ میری بھی خواہش تھی..... امی بابا کے خدشات اور خواہش کے پیش نظر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ اس جملے میں ہی الجھ کر رہ گئی..... یعنی اب نہ وہ خواہش تھی نہ خوشی..... بس تایا ابو اور تائی امی کی خواہش مقدم تھی۔

”بابا کی حالت دل بدن بگڑتی جا رہی ہے، بہت کمزور ہو رہے ہیں، خاموشی نظروں سے ہم دونوں کے جواب کے منتظر ہیں میں اس دن بھی خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا تھا وجہ تمہاری پسند اور مرضی تھی..... جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔“ وہ بات پوری کر کے چلا گیا اور وہ ساکت کھڑی رہی۔ شاید انجانے، نادانی اور جلد بازی میں وہ بہت بڑی خوشی کو چھل گئی تھی۔ اسماعیل کی اس کے لیے فکر اور پریشان ہونا، زمانے کی گندی نظروں سے بچا کر رکھنا..... وہ محبت ہی تو تھی۔ وہ صحیح تھا، وہ دو تین مہینے کے لیے گھر سے نکلی تھی اور اسود کی نظروں میں آ گئی تھی..... عائکہ اور سارے اسٹاف کی نظروں میں مشکوک ٹھہری تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو خاموشی سے پھسلنے لگے تھے۔



ماں اور اسود اور عالم کی پھوپھی ہوں۔“ ان کا یہ تعارف مزید حیران کرنے کے لیے کافی تھا۔  
 ”کون ہے عزت؟“ عقب سے تائی امی کی آواز آئی۔

”تائی امی..... یہ..... آنٹی.....“ الفاظ حلق میں پھنس گئے تھے۔ فردوس نے دروازے کی سمت دیکھا۔ وقت کے ساتھ دونوں طرف تبدیلی تو آئی تھی لیکن وقت کی لکیروں کے پیچھے چھپے نقوش ایک دوسرے کو پچھاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

”بہلی.....!“ فردوس کے لبوں نے جنبش کی۔ عزت نے مڑ کر دیکھا۔ تائی امی کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔

”فردوس بھابی۔“ وہ وقدم آگے بڑھیں۔

”یہ کون ہیں تائی امی؟“ عزت کے دل کو عجیب سی الجھن ہو رہی تھی دل ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

• ”عزت میں نے کہا ناں تم سے کہ میں تمہاری ماں ہوں اور تمہیں لینے آئی ہوں۔“ وہ دوبارہ بولیں۔ عزت نے تڑپ کر تائی امی کی سمت دیکھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں تائی امی؟“  
 ”دیکھ بہلی تمہیں جو بھی بات کرنا ہے ناں اندر آ کر بیٹھ کر کرو اور عزت بیٹی تم مہمانوں کے لیے چائے لآؤ۔“

فردوس نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ عجیب ذہنی الجھن میں گرفتاران کے لیے چائے بنانے لگی۔ وہ بچپن سے یہی سنتی آئی تھی کہ اس کی ماں مرچکی ہے، بچپن بابا اور تایا ابو کے گاؤں میں گزر رہا تھا پھر بابا کی شدید بیماری میں بار بار لاہور آنا جانا رہتا تھا پھر سب لاہور منتقل ہو گئے۔ بابا جانبر نہ ہو سکے جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی اور وہ فوت ہو گئے تھے۔ تب سے تایا ابو تائی امی ہی سب کچھ تھے۔ وہ چائے لے کر اندر گئی تو عجیب سا منظر تھا..... تائی امی بھی رو رہی تھیں اور وہ عورت بھی جو خود کو اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

”میں پھر آؤں گی اور اب جب بھی آئی عزت کو ساتھ

موسم مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ تایا ابو کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ان کا دل بہت کمزور ہو چکا ہے انہیں خوش اور مطمئن رکھیں، کوئی فکر پریشانی والی بات ان کے سامنے نہ کریں..... تائی امی ان کے پاس بیٹھ کر بلند آواز میں قرآن شریف پڑھتی تھی۔ اسماعیل نے ان کے کمرے میں لی وی بھی لا کر رکھ دیا تھا۔ وہ ان دنوں تایا ابو کی خواہش پر ہر پہلو سے غور کر رہی تھی لیکن اسماعیل کی بے اعتنائی دل میں اندیشہ بھی جگا دیتی تھی۔ اس وقت بھی وہ رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب سے جاب ختم ہوئی تھی اور تایا ابو بیمار ہوئے تھے۔ کچن کا زیادہ کام وہ خود ہی کرتی تھی، تایا ابو کا پرہیزی کھانا، ان کی دوائیوں کا خیال رکھنا سب اس کے لیے بہت اہم ہو گیا تھا۔ شام ہو رہی تھی دھوپ نارنجی اور پھیکی ہو کر دیوایوں پر چڑھائی تھی، کھن میں کھانے کی گرم خوشبو پھیلی ہوئی تھی، گلی میں گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا لیکن سوائے گاڑی کے کوئی نظر نہ آیا تھا ابھی وہ چلی ہی تھی کہ دروازہ زور سے بجا۔

”کون ہو سکتا ہے اس وقت؟“ بڑبڑاہٹ کے انداز میں بولتی وہ دروازے تک آئی۔ آنے والی دونوں خواتین کے چہروں سے وہ ناواقف تھی۔ شاید تائی امی نے پھر کسی رشتے والی کو کہا ہو۔

”تم عزت ہو؟“ نہ سلام نہ دعا..... پہلا سوال ہی حیران کن تھا۔

”جی..... لیکن آپ کون؟“ وہ نظروں میں الجھن لیے انہیں دیکھنے لگی، ان کی نظروں میں عجیب سے رنگ تھے جنہیں وہ سمجھ نہ سکی۔

”میں تمہاری ماں ہوں۔“ اس کے گرد ایک دھماکہ سا ہوا اور وہ بے یقین سی انہیں دیکھنے لگی۔

”آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے؟“ شاید آپ غلط ایڈریس پتہ گئی ہیں۔“ وہ دروازہ بند کرنے لگی جب انہوں نے دروازے کو ہاتھ سے روک کر اندر قدم رکھا۔

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی عزت..... میں تمہاری

لے کر ہی جاؤں گی۔“ وہ چائے پیئے بغیر ہی اٹھ گئیں۔  
اسے ساتھ لپٹا کر بوسہ دیا۔ عزت کو ایک عجیب سی مانوس سی  
خوشبو محسوس ہوئی لیکن اگلے ہی لمحے وہ ان سے الگ ہو کر  
تائی امی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ چلی گئیں تب تائی امی  
اسے ساتھ لپٹائے روتی رہیں۔

”یہ سب کیا ہے تائی امی؟“ وہ ابھی تک حیران تھی  
آنکھوں میں آنسو ٹھہرے تھے۔

”بتائی ہوں..... سب بتائی ہوں۔“ وہ صوفے پر  
ڈھسے گئیں۔ وہ بھاگ کر ان کے لیے پانی لائی۔

”یہ سارہ کھٹی..... بجلی..... تمہاری ماں۔“ وہ پانی کا  
گلاس تھاے یوں ہانپنے لگیں جیسے صدیوں چلنے کے بعد کی  
تھکن ہو۔

”مجھے اسی دن کا خوف رہتا تھا۔“ وہ بڑبڑا ہٹ کے  
انداز میں بولی اور رونے لگیں۔

”لیکن تائی امی.....“  
”کوئی سوال نہ کرنا عزت..... بس خاموشی سے سننا  
اور پھر جو فیصلہ تم کرو گی، ہمیں وہ منظور ہوگا۔“ وہ ان کے  
قدموں میں بیٹھ گئی۔

”میں تمہارے بابا اور تمہارے تایا ابو کی رشتہ دار تھی  
تمہاری دادی رشتہ لے کر آئیں اور ہماری شادی ہو گئی، ہم  
لوگ ایک ہی برادری کے تھے، ہم لوگوں کا پیشہ بھی ایک ہی  
تھا۔ میرے بابا بھی سرکس میں کام کرتے تھے۔ ہماری اپنی  
ہی ایک دنیا تھی۔ افضل میرا دیور بہت خوب صورت  
شخصیت کا مالک تھا وہ اکثر اس کام سے چڑتا تھا۔  
ہمارے ایک محسن عبدالباری صاحب جن کے گھر کی  
ڈرائیوری افضل کرتا تھا بہت نیک سیرت انسان تھے۔ ان  
کے بہت سے فلمی ڈائریکٹر اور پروڈیوسرز سے رابطے تھے۔  
ان کی عالی شان کوٹھی اکثر فلموں کی شوٹنگ کے لیے بھی  
استعمال ہوتی تھی۔ انہی کے توسط سے اماں کو بھی کام مل  
گیا..... کسی فلم میں ملازمہ بن گئی کسی فلم میں نرس کسی  
میں سہیلی کی ماں، بس ایک سلسلہ چل نکلا..... افضل کو یعنی  
تمہارے بابا کو بھی اس دور کے مشہور ہیرو کے اسٹنٹ

مین کا کام مل گیا۔ اس کے سیٹھ صاحب نے اسے اور اکرم  
کو موٹر سائیکل لے دی اب دونوں بھائی مختلف جگہوں پر  
ایکشن سین کے لیے جانے لگے لیکن یہ بات بہت سے  
لوگوں کو نہیں معلوم تھی کہ ہم لوگ آہستہ آہستہ فلموں میں کام  
ڈھونڈ رہے ہیں۔ تمہاری دادی اور بابا نے میرے لیے بھی  
ایک دو جگہ بات کی لیکن میرے فربہ بی مائل وجود اور گہری  
رنگت کی وجہ سے کہیں بات بن نہ سکی پھر جلد ہی اسماعیل  
میری گود میں آ گیا..... ابھی اسماعیل کی پیدائش نہیں ہوئی  
تھی کہ بجلی یعنی تمہاری ماں افضل کو راستے میں ٹکرانے  
لگی..... افضل اکثر ہی صبح جلدی نکل جاتا تھا اکرم بھی  
جاتے تھے کیونکہ سیٹھ صاحب کی ڈرائیوری بھی یہ دونوں  
بھائی باری پاری کرتے تھے۔ سیٹھ صاحب نے ان کی  
ڈیوٹی لگا رکھی تھی کہ آتے ہوئے بیکری سے ناشتے کا سامان  
لے آ کر ڈرائی بیکری کے باہر تمہاری ماں کی گاڑی بھی آتی  
تھی شاید عمر کے اس دور کا تقاضا تھا یا پھر کیا تھا کہ اسے  
افضل پسند آ گیا۔ وہ بہانے بہانے سے افضل سے ٹکرانے  
لگی، اس سے بات کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگی، اکرم  
چونکہ ساتھ ہوتے تھے مجھے بتانے لگے میں نے اماں سے  
بھی ذکر کر دیا پھر افضل نے خود بھی اماں کو سب بتا دیا اماں  
نے اسے سمجھایا کہ بجلی کو سب سچ بتا دو افضل نے بتانے  
کی کوشش کی یہاں تک بتایا کہ وہ کوئی بہت بڑا افسر نہیں  
ہے جیسا کہ وہ اسے سمجھ رہی ہے لیکن اس وقت وہ کچھ بھی  
سمجھنا نہیں چاہتی تھی، پھر افضل نے سیٹھ صاحب سے ذکر  
کیا اور انہوں نے افضل کو یہی مشورہ دیا کہ اگر وہ محبت کرتی  
ہے تو حقیقت جان کر بھی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑے گی  
محبت اور شادی کی اس راہ پر پہلا قدم بجلی نے ہی اٹھایا تھا۔  
سیٹھ صاحب کے کہنے پر ہی شادی کا تمام انتظام ان کی  
کوٹھی پر ہی کیا گیا تھا ہم لوگ رشتہ لے کر گئے تو بجلی کی ماں  
نے بھی افضل کے کام کے سلسلے میں کوئی سوال جواب نہ  
کیا، ہم لوگ سیٹھ صاحب کی کار میں گئے اور ان لوگوں کو  
بھی کوٹھی پر دعوت میں بلایا تو وہ لوگ یہی سمجھے کہ یہ سب  
ہمارا اصل رہن سہن ہے افضل اور اماں نے ایک بار پھر

اصل بات بتانے کی کوشش کی لیکن سیٹھ صاحب نے یہ کہہ کر خاموش کروادیا کہ جلد بازی سے کام نہ لو حالات بدل جائیں گے اور پھر تم سے رشتہ بنانے اور رابطہ استوار کرنے کی پہلی بجلی نے کی ہے تم نے نہیں۔ ہم لوگ تو کچھ دن رہ کر واپس آ گئے افضل اور بجلی وہیں رہنے لگے..... ابابھتی تمہارے دادا بہت بیمار رہنے لگے ایکشن مین کی زندگی میں بہت سے حادثات ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک حادثہ اباب کے ساتھ بھی ہوا وہ بستر سے جا لگے..... ان کی وفات پر افضل اور بجلی آئے تب بجلی ہماری ساری حقیقت جان کر ہم سے اور اس گھر اور افضل سے نفرت کرنے لگی..... افضل نے بہت سمجھانے کی کوشش کی، محبت کے واسطے دیے لیکن اس نے ایک نسنی، میری گود میں اسماعیل آ گیا، انہی دنوں سیٹھ صاحب ہمارے گھر آئے اور کام کے سلسلے میں اماں اور افضل سے بات کرنے لگے تو بجلی کوئی غلط فہمی ہوئی اور وہ افضل سے ہر رشتہ ختم کر کے چلی گئی تھی۔ افضل نے بہت روکا، اس کے گھر کے چکر لگائے، اماں کو لے کر گیا ان لوگوں سے معافی مانگی لیکن اس کی ایک ہی ضد تھی کہ اسے اب افضل کے ساتھ نہیں رہنا، تمہاری پیدائش پر اس نے افضل کو اسپتال بلایا اور تمہیں اس کے حوالے کر دیا اور کہا کہ لے جاؤ اس بچی کو اور جب بڑی ہو کر میرے پارے میں پونچھ گے ناں تو کہنا مرگئی تمہاری ماں افضل تمہیں گھر لے آیا اس رات وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا..... اس کے رونے کی آوازیں کمرے تک آتی رہیں، میں نے تمہیں گود میں لے کر سینے سے لگا لیا تھا، تمہیں سچ میں اپنی بیٹی یاں لیا، اماں سے افضل کا دکھ دیکھا نہ گیا اور وہ دنیا سے چلی گئیں۔ بجلی نے خلع کا دعویٰ کر دیا تھا افضل نے بغیر کوئی سوال جواب کیے اسے زندگی سے نکال دیا تھا ہم لوگ یہ شہر اور یہ کام چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں گے بھالی میں اپنی بیٹی کو ایک عزت والی زندگی دینا چاہتا ہوں، اس کی ماں نے مجھے گالی دی ہے بھالی کہ ہم اس سے کام کروانا چاہتے تھے۔ ہم بچ لوگ ہیں، میں اپنی بیٹی کو ایک باعزت زندگی دوں گا۔ اسے دنیا سے بچا کر رکھوں گا۔ ہم

لوگ محنت مزدوری کر لیں گے لیکن اب اس شہر میں نہیں رہیں گے، ایک رات جب وہ اپنے دکھ پر جی بھر کر رو چکا تو اس نے ایک فیصلہ کر لیا اور ہم لوگ اس کے ساتھ تھے سو خاموشی سے وہاں سے سب کچھ ختم کر کے چلے آئے اماں ابوالا مکان بیچا اور دوسرے شہر جا کر دونوں بھائیوں نے ٹیکسی خریدی اور سر چھپانے کو ایک چھوٹا سا گھر لے لیا۔ افضل بیمار رہنے لگا، ٹیکسی چلانی مشکل ہونے لگی پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے ایک بار پھر اسی شہر کا رخ کیا لیکن اب فرق یہ تھا کہ اس گھر کی عورتوں کے لیے گھر کے اندر ایک باعزت زندگی تھی۔ افضل ایک سین کے دوران حادثے کا شکار ہوا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا، گھر کی گاڑی چلانا تمہارے تایا ابو کے لیے مشکل ہونے لگی۔ میں نے ساتھ دینا چاہا تو انہوں نے سختی سے منع کر دیا پھر وہ بھی ایک سین کے دوران بلندی سے گرے اور بستر کے ہو کر رہ گئے تب اسماعیل نے پڑھائی چھوڑ کر ڈرائیوری شروع کر دی تاکہ اس گھر کا نظام چلتا رہے تمہاری تعلیم میں کوئی رکاوٹ نہ آئے اسماعیل یہ ساری باتیں جانتا تھا اسی لیے وہ تمہارے حوالے سے بہت محتاط تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زندگی میں بھی تمہاری ماں یا تم اس بات کا طعنہ دو کہ ہم نے تمہیں کمانے کے لیے گھر سے باہر نکالا..... تمہاری عزت ہمارے لیے سب سے قیمتی تھی..... میں، تمہارے تایا ابو اور میرے بیٹے اسماعیل نے اپنی زندگی کا مقصد ہی تمہاری عزت کی حفاظت، تمہاری تعلیم تمہاری پرورش بنالیا..... بجلی سے کبھی واسطہ ہی نہ ہوا لیکن میرے دل میں ہر روز یہ ڈر رہتا تھا کہ کہیں وہ کسی دن تمہاری حق دار بن کر نہ آ جائے..... حالات ایسے بھی ہوئے کہ تمہاری خواہشیں پوری کرنے کے لیے تمہارے تایا ابو ایک بار پھر سیٹھ صاحب سے رابطہ کرنے کی سوچنے لگے کہ اگر ان کے توسط سے اسماعیل کو کوئی بڑا کام مل جائے تو حالات بدل جائیں گے ہم تمہیں باعزت طریقے سے بیاہ کر فارغ کر دیں لیکن میں نے انہیں منع کر دیا کہ جس کام کو ہم لوگوں نے چھوڑ کر ایک نئی زندگی شروع کی تھی جس کی وجہ

ایک سیاق کی کسی بھی خط میں قسم ہوں



ایم بروقت ہر ماہ آپ کی دلچسپ ہفت روزہ

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ  
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے ہر کونے میں 600 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے

6000 روپے

میڈل ایسٹ ایشیائی افریقہ یورپ کے لیے

5000 روپے

رقم پر مبنی ڈرافٹ مبنی آرڈر مبنی گرامسٹریٹ مبنی بینک کے  
ذریعے بھیجی جاسکتی ہیں۔ مقامی افراد

ایری پیسہ اکاؤنٹ نمبر

0316-0128216

موبائل کیش اکاؤنٹ نمبر

0300-8264242

راہنہ: طاہر احمد رسی 0300-8264242

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز

81 فیمبر پریس ہائی ٹیپ اف پاکستان

اسٹیڈیم روڈ انچل پریس کراچی 75510

فون نمبر: 2/20771-35620922+

naeyufaq.com

Info@naeyufaq.com

سے افضل کی اور تمہاری زندگی برباد ہوئی اب ہم دوبارہ وہ کام نہیں کریں گے..... تمہارے تایا ابو اور میری بہت خواہش تھی کہ تم ہمارے اسماعیل کی زندگی کا حصہ بن جاؤ..... ہمیشہ ہمارے ساتھ رہو لیکن شاید یہ ممکن نہیں تھا۔ تم جانا چاہتو اپنی ماں کی ساتھ جاسکتی ہو زندگی تمہاری ہے بیٹا..... وہ دوبارہ آنے کا کہہ رہی ہے، اس گھر میں تو اسماعیل کا ساتھ یا پھر ہم جیسے ہی کوئی سفید پوش لوگ تمہارا مقدر بنیں گے اور وہاں..... وہاں شاید تمہارا مستقبل بہت شاندار ہو، تمہارے سارے خواب پورے ہوں، ہم نے اتنے سال تمہیں افضل کی امانت اس کی سوچی گئی ذمہ داری سمجھ کر سنبھال نہیں رکھا بلکہ اپنی بیٹی، اس گھر کی رحمت سمجھ کر سینے سے لگائے رکھا۔ اسماعیل کی آنکھوں میں تمہارے لیے جو رنگ ہیں وہ میں اس کی کم عمری سے دیکھ رہی ہوں، وہ جانتا تھا کہ تم اس کی کزن ہو، اس کے بچا کی بیٹی، وقت کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ مزید پختہ ہوتا گیا لیکن میں اسے سمجھا لوں گی، ہمیں تمہارا ہر فیصلہ بخوشی قبول ہے۔ وہ ایک لمبی سانس بھر کر اٹھ گئیں اور عزت کی بت کی طرح وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔

کھنٹی کب سے بچ رہی تھی، وہ بت بنی بیٹھی تھی نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ آنسو ایک تسلسل اور خاموشی سے بہہ رہے تھے۔ تانی امی نے شاید مغرب کی نماز کی نیت باندھ لی تھی یا پھر عشاء کی..... ایک نظر کھڑکی سے باہر گہرے ہوتے اندھیرے او آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھا اور ہمت کر کے اٹھ کر دروازے کی چٹائی گرائی۔ سارے دن کا تھا کہ ماندہ اسماعیل سامنے کھڑا تھا..... ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا اور وہیں رک گیا۔ اس کے چہرے پر دکھ ہی دکھ لم تھا۔ اسماعیل نے دروازہ بند کر کے ایک نظر خاموش صحن کی طرف ڈالی اور پھر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ ”امی نے پھر کسی رشتے والے کو بلایا تھا کیا؟“ اس کی آنکھوں میں جھانکا، ایک مدت سے اسماعیل اس کا دکھ اپنے سینے میں محسوس کرتا تھا وہ نفی میں سر ہلا کر وہیں کھڑی

رہی، عجیب سی خاموشی تھی۔ سرد ہوا کا جھونکا چہرے سے  
نکرا پاتا تو اس نے جھرجھری لی۔  
”کچھ ہوا ہے کیا عزت؟“ وہ سوالیہ نظروں سے اس کا  
چہرہ پڑھنے لگا۔

”آج تمہاری چاچی آئی تھی اسماعیل..... عزت کی  
ماں.....“ صحن میں بلب جلانے آئی فردوس نے اس کے  
سوال کا جواب دیا تو اسماعیل کے چہرے کی رکیں تن گئی۔  
”کیوں..... کیوں آئی تھیں وہ یہاں؟ اور اسے اس  
گھر کا ایڈریس کس نے دیا؟ اسے کیا پتا چلا کہ ہم لوگ  
یہاں رہتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں نفرت اور خوف  
دونوں ہی رنگ جھلک رہے تھے۔  
”چچاں عزت نے نوکری کی تھی ناں..... وہ اسکول  
بلی کے بچی کا ہی ہے۔“ وہ وہیں برآمدے کی سیڑھی پر  
بیٹھ گیا۔

”اسی لیے..... اسی دن کے لیے میں منع کرتا تھا لیکن  
کسی نے میری ایک نہیں سنی اور آپ نے امی آپ نے  
بھی یہ کہہ کر خاموش کروادیا کہ عزت کی خواہشیں ہے اور  
خواب ہیں..... ایسے کون سے خواب تھے امی جو اتنے  
سالوں میں ہم پورے نہیں کر سکے، خود سے بڑھ کر عزت  
کی خواہشوں اس کی خوشیوں کا خیال رکھا۔ اسکول میں  
ایسی کیا بات ہوگئی کہ بات گھر کے ایڈریس اور ذاتی  
معلومات تک آپہنچی۔“ وہ ایک بار پھر عزت کے سامنے  
آ کھڑا ہوا۔

وہ سارا غصہ اور ناراضی جو بھلائے بیٹھا تھا ایک دم  
سے غالب آ گئی۔ عزت نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ اتنی  
اہم تھی اتنی قیمتی تھی اس کی نظر میں کہ وہ اس کے لیے اتنا  
پریشان ہو رہا تھا۔

”کہا ہوا تھا اسکول میں، جو ایک دم سے تمہاری نوکری  
بھی ختم ہوگئی اور وہ عورت اس گھر تک آپہنچی۔“ اس کی  
آنکھوں میں تہر برس رہا۔  
”وہ.....“ اس کی سانس اکٹنے لگی یوں جیسے ابھی سینے  
میں دھڑکن بدل ختم جائے گا۔

”تائی امی..... میرا کوئی قصور نہیں۔“ وہ رونے لگی  
انہوں نے حیرت سے پہلے اسے اور پھر اسماعیل کی سمت  
دیکھا تو کیا واقعی کوئی بات ہوئی تھی؟ اس کے آنسو ایک  
تواتر سے بہہ رہے تھے۔

”وہ..... مجھے..... میم عائلہ نے خود نکالا تھا اسکول  
سے..... زبردستی استعفیٰ لیا تھا۔“ نظریں جھک گئیں  
اسماعیل کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس کی اس کا شک صحیح تھا۔  
”کیوں..... ایسا کہا ہوا تھا؟“

”وہ..... ان کا بھائی اسکول آتا تھا، میم اور ان کے  
میاں شمالی علاقہ جات کی سیر کو گئے تو اس کا اسکول آنا جانا  
بڑھ گیا پھر پتا نہیں کیا ہوا؟ مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں  
تھا..... اس نے میم سے ہمارے گھر رشتہ لے کر آنے کی  
بات کی وہ پہلے تو تائی رہیں پھر ہمارے بارے میں ساری  
معلومات لیں۔“

”اوہ میرے خدایا۔“ اسماعیل نے بائیں ہاتھ کا مکا بنا  
کر دائیں ہاتھ کی پٹیلی مارا۔

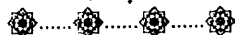
”امی..... اس کی میڈم کے گھر ہی کچھ عرصہ ڈرائیوری  
کی سے میں نے..... ایک رات جب دیر ہوئی تھی تو اس  
کے سر کو ہسپتال لے کر گیا تھا، بھونپنے کو سیر سپاٹوں سے  
فرصت نہیں تھی اور یہ سب جو ہوا یا اسی نوکری کی وجہ سے ہوا  
اسی لیے میں خلاف تھا اور عزت ایک بات تم کان دل اور  
دماغ کھول کر سن لو..... ہمارا ہمارے بزرگوں کا ماضی جو  
بھی تھا وہ گزر گیا..... ہم لوگ بازی کرتے تھے ناشاد کھانے

والے، سرکس میں موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل  
چلانے والے لیکن ہم لوگ جو بھی تھے وہ وقت گزر گیا.....  
تمہاری ماں کے اس گھر کو چھوڑنے تمہیں اپنانے سے  
انکار کرنے اور چاہو گا گھر اجڑنے نے ہمیں ایک نئی راہ  
دکھائی..... عزت کی زندگی اور دو وقت کی حلال کی روٹی  
ہماری زندگی کا مقصد بن گیا۔ چوری یا ڈاکہ تو پہلے بھی نہیں  
ڈالتے تھے لیکن تمہاری ماں نے جو گالی دی اس پیشے کو لے  
کر ساری زندگی اس کے سامنے سے بھی تمہیں دور رکھا۔  
ابو، امی اور خود میری زندگی کا مقصد ہی یہ بن گیا کہ تمہیں حق

حلال کی باعزت زندگی دیں..... جس روز تم نے نوکری کی ضد کی میرے اور امی کے درمیان بہت بحث ہوئی تھی جب امی نے تمہاری خواہشات کا ذکر کیا تب میں نے سوچا کہ آخر تم ایک اونچے خاندان کی نوادہ جیسے ماں کی نفرت نے ہم جیسوں کے ہاں رہنے پر مجبور کر دیا تو میں خاموش رہا اب فیصلہ تمہارا ہے..... تم چاہو تو اپنی ماں کے ساتھ جاسکتی ہو وہ تمہارا کزن جو تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تم چاہو تو اس کے ساتھ نیا رشتہ بھی بنا سکتی ہو لیکن اتنا یاد رکھنا عزت..... تمہاری ماں خود چاچو کی زندگی میں آئی، محبت کا بھوت اتر تو سانس گھٹنے لگی..... یہاں تک کہ اپنی اولاد کو بھی چھوڑ گئی، چاچو نے ایک ہی وصیت کی کہ میری عزت کی حفاظت اور اس کا خیال رکھنا..... ہماری طرف سے تمہیں کوئی زبردستی نہیں روکے گا میں تو شاید حق اسی دن کھو چکا تھا جس دن تم نے من مانی کر کے گھر سے باہر قدم نکالا تھا..... کچھ حکم مرد مصلحت کے تحت بھی چلاتے ہیں عزت لیکن عورت انہیں ظالم اور تنگ نظر سمجھ کر آگے بڑھ جاتی ہے..... بہر حال زندگی تمہاری ہے، فیصلہ اور مرضی بھی تمہاری ہونی چاہیے۔“ وہ بات کر کے پلٹ گیا، عجیب شکست خوردہ قدم اٹھاتا وہ کہیں سے بھی پہلے والا اسماعیل نہیں لگ رہا تھا تائی امی بھی جا چکی تھیں اور وہ وہیں فرش پر ڈھسے گئی۔

”یہ کیا ہو گیا..... یہ گھر..... اس گھر کے محبت کرنے والے لوگ اس شخص کی محبت، سکون سب میرے ہاتھ سے پھسل گیا اور من مانی کب کی تھی میں نے..... بس ذرا سا ساتھ دینا چاہا تھا..... ہاں تب محبت نہیں تھی۔“ وہ روتے ہوئے خود پر ہی منکشف ہو گئی تھی۔

”تو کیا اسماعیل سے محبت ہو گئی ہے مجھے؟“ خود سے کیا سوال بہت مزہ گاڑ گیا تھا وہ تو ایک دم سے بیگانہ ہو رہا تھا سارے اختیار سے سوپ کر چلا گیا تھا۔



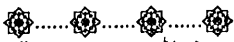
وہ باورچی خانے کی کرسی پر بیٹھا چائے میں پراٹھا بھگو کر کھا رہا تھا سفید رنگ کی شلوار ٹیص میں دھلا دھلا یاچہرہ

کشاہدہ پیشانی اور سرخ ہوتی آنکھیں دیکھ کر عزت کا دل عجیب انداز میں دھڑکا..... جی چاہ رہا تھا رو کر اس سے معافی مانگ لے اور کہہ دے کہ اسے نہیں جانا کہیں لیکن وہ اسے میسر نظر انداز کرتا ناشتہ کرتا رہا یوں جیسے اس وقت زندگی کا سب سے ضروری کام یہی ہو۔ تائی امی بھی ناشتہ بنانے میں مصروف تھیں۔

”دوپہر کے کھانے پر انتظار نہ کیجیے گا امی..... آج کچھ کام زیادہ ہے رات کو بھی شاید دیر ہو جائے..... ابا کی دوائیاں لیتا آؤں گا۔“ وہ چائے کا کپ خالی کر کے اٹھ گیا، گھڑی باندھتے ہوئے تائی امی سے بات کی اور اسے بالکل نظر انداز کرتا پہلو سے نکل کر چلا گیا..... کیا تھا اگر وہ کہہ دیتا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی عزت..... دل تھم سا گیا..... جب وہ اس کا ساتھ مانگ رہا تھا تب کیوں دل نے اس کی بات نہیں سمجھی..... آنسو آنکھوں سے بہنے کو بے تاب ہوئے۔

”آ جاؤ عزت ناشتہ کر لو بیٹی۔“ تائی امی کا رندھا ہوا لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ ساری رات روتی رہی ہیں۔

”جی۔“ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے بیٹھ گئی تھی۔



وہ صحن میں یونہی بیٹھی درخت پر شور مچاتی چڑیوں کو دیکھ رہی تھی جب گلی میں گاڑی رکنے کی آواز آئی، دل انجانے سے خوف سے دھڑکا..... انہوں نے کہا تھا کہ وہ پھر آئیں گی، دروازہ بجنے لگا وہ تائی امی کے کمرے کی طرف بھاگی۔

”تائی امی..... باہر دروازہ بج رہا ہے۔“

”ہاں تو دیکھو ناں کون ہے؟ میں آ رہی ہوں۔“ انہوں نے تاپا ابو کے اوپر لمبل ٹھیک کیا اور اس کے پیچھے ہی باہر آئیں..... سائرہ آئی تھیں عزت کو دیکھتے ہی اس کو خود سے لپٹا لیا تھا۔

”میں تمہیں لینے آئی ہوں بیٹی۔“ اس نے گھبرا کر فردوس کی سمت دیکھا تو وہ نظریں جھکائے کھڑی تھیں۔

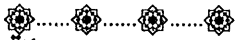
”کہاں؟ میں آپ کو نہیں جانتی۔“ وہ تائی امی کے



ساتھ آ کر کھڑی ہوئی۔

میرا بیٹا کسی کا ملازم نہیں ہے اب اور نہ ہی میں نے اسماعیل کی اور تمہاری بیٹی کی معافی کی ہے، تم اسے لے جاؤ۔“ وہ بات کر کے پلٹ گئیں یوں جیسے امانت اس کے مالک کے سپرد کر کے فارغ ہو گئی ہوں..... کمرے کی کھڑکی سے یہ منظر دیکھتے اکرم علی نے بھی بیٹھی آنگھوں کو صاف کیا اور کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ عزت ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

”چلیں بیٹی۔“ سارہ نے اسے ساتھ لگا لیا اور وہ گھسٹی چلی گئی۔



اسماعیل کی رات بارہ بجے واپسی ہوئی تھی، اماں نے دروازہ کھولا تو وہ تھکے ماندے قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا تھا۔ ”بہت دیر ہو گئی اماں..... دراصل آج ایک ذیل ہونی تھی اللہ کا شکر ہے میرا کام چل نکلا ہے..... ہم نے جو مال تیار کروایا تھا وہ پارٹی کو پسند آیا ہے اور بہت بڑے پرافٹ کی امید ہے..... جیسے ہی بے منٹ ہوئی ابا کو بھی کسی اتھھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا اور اپنی ماں کو بھی بازار لے کر جاؤں گا۔“ وہ فردوس کو ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ان کی خاموشی اور آنکھوں کی سرخی دیکھ کر وہ چونکا۔

”کیا ہوا امی..... کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ اس نے گھبرا کر ابا کی چارباکی کی سمت دیکھا، کھلی کھڑکی سے سکون سے سوئے ابا دکھائی دے رہے تھے۔

”کیا ہوا امی..... کچھ تو بتائیں..... عزت کہاں ہے؟“ ایک بار اس کے کمرے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا جہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

”اس کی ماں اسے لے گئی..... میری ساری زندگی کی محبت منہ دھکتی رہ گئی، وہ امانت تھی اس کی میرے پاس میں ماں کو کیسے منع کر سکتی تھی بیٹا۔“ وہ سسکتی لگیں..... ایک دھکا سادل کو لگا کیا تھا جو عزت ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتی۔

”اور عزت..... اس نے کچھ نہیں کہا؟“ لہجے کا بوجھل پن چھپاتے ہوئے وہ باورچی خانے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تم میری بیٹی ہو عزت..... مانا کہ اس وقت افضل کے جھوٹے دھوکہ دہی اور جھگڑوں کی وجہ سے میں غصے میں تھی اور اسی غصے، نفرت اور انتقام میں نے تمہیں بھی خود سے دور کر دیا تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا..... ان لوگوں کے پرانے گھر گئی تو پتا چلا کہ یہ لوگ وہ گھر بیچ کر شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں عبدالباری سیٹھ کے گھر گئی تو وہاں بھی تالا تھا، جہاں سرکس اور تماشے والے دیکھتی وہاں رک جاتی..... تمہیں تلاش کرتی، افضل کو ڈھونڈتی لیکن نہ تم ملی نہ ان لوگوں کے بارے میں کچھ خبر ہوئی میں نے صبر کر لیا یہ سوچ کر کہ اپنی اولاد کو ٹھکانے کی سرائی رہی ہے مجھے..... ہر بات تمہیں یاد اور تمہارا تصور کر کے کنٹرا روئی ہوں میں..... افضل سے الگ ہو کر گھر میں نے بھی نہیں بسایا تمہاری محبت دل میں ایسی بسی کہ میں نے اپنی خوشیاں ایک طرف رکھ دیں، جب عائلہ اور اسود جھگڑ رہے تھے اور عائلہ تمہارے بارے میں بتا رہی تھی تب میں سمجھ گئی کہ یہ تو تم ہو میری بیٹی..... میری عزت..... اور اللہ نے مجھے تم سے ملانے کے لیے ہی اسود اور عائلہ کو وسیلہ بنایا..... اپنی ماں پر ترس کھاؤ بیٹی۔“ وہ ہاتھ باندھے رو رہی تھیں، اس نے تائی امی کی سمت دیکھا دل کی عجیب حالت تھی۔

”تم ہی اسے کچھ سمجھاؤ فردوس..... عائلہ بتا رہی تھی کہ تم نے اپنے بیٹے سے اس کی معافی کر دی..... میں تو سن کر ہی لرز گئی تھی..... یہاں اس گھر کے درو دیوار سے لپٹی غربت اور حسرتیں بتا رہی ہیں کہ یہ یہاں کبھی خوش نہیں رہے گی، افضل نے میری زندگی بربادی، میں نے اس کو تو معاف کر دیا لیکن اپنی بیٹی کی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گی تم لوگوں کو اور ویسے بھی تمہارا بیٹا کیا دے سکتا ہے اسے وہ تو خود عائلہ کے گھر ملازم ہے.....“ ان کے لہجے کی رعوت پلٹ آئی تھی..... پچھتاوا اور اولاد کی محبت اپنی جگہ تھی لیکن فطرت اپنی جگہ فردوس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

”یہ تمہاری بیٹی ہے بہلی..... تم اسے لے جا سکتی ہو مگر

”نہیں..... وہ کیا کہتی..... اس کی ماں نے کچھ بولنے کی مہلت ہی نہیں دی..... وہ کچھ سنایا جو وہ بہت سال پہلے غصے میں افضل کو سنا کر گئی تھی۔ آج لہجہ نرم تھا لیکن بائیں وہی تھیں..... ہم کیسے روک سکتے تھے بیٹا، عزت اس کی اولاد ہے، اگر ہم لوگوں کی کوئی حیثیت ہونی اس کی نظر میں تو آ جائے گی۔“ وہ اس کے لیے کھانا گرم کرنے لگیں۔

”نہیں امی کھانا نہیں کھاؤں گا۔ کاش اس وقت آپ بھی اس ملازمت کی مخالفت کرتیں..... ایک ماں کی طرح اسے روک لیتیں تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“ وہ پانی پی کر اٹھ گیا۔

”جو ہونا ہوتا ہے ناں بیٹا وہ ہو کر رہتا ہے اور میں ماں بن کر ہی پاتی رہی اتنے سال..... سینے سے لگا کر کھا لیکن اس کی ماں زندہ ہے..... اس کی اصل ماں۔“ وہ بتی بچا کر اندر چلی گئیں اور اسماعیل وہیں بیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ زندگی میں کبھی ہمت نہیں ہاری تھی، کبھی کسی شکوے کو دل میں پنپنے نہیں دیا تھا، ماضی سے جڑی حقیقتیں اس کے نزدیک گزرا ہوا وقت تھا جو بس بیت چکا تھا۔ حال اور مستقبل ہاتھ میں تھا وہ سر جھکائے نئی ہی دیر یونہی بیٹھا رہا..... وہ بھی اس محبت سے دستبردار ہوئی نہیں سکتا تھا جو اسے عزت سے تھی۔

وہ صبح معمول سے کچھ ہٹ کر تھی۔ اپنے گھر کی بے فکری کی نیند سے اٹھنے کے بجائے وہ سوچتی ہوئی روئی ہوئی آنکھوں سے ساری رات اندھیرے کمرے میں جاگتی رہی تھی، اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے، اپنا گھر چھوڑنے پر، اپنی ماں کے ملنے پر یا پھر ان سب باتوں پر جو حالات کی وجہ سے ہو رہے تھے۔ آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ دروازہ ہلکی سی دستک سے کھلا اور سائرہ نے اندر آ کر بلب روشن کیا۔

”آ جاؤ بیٹا ناشتے پر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

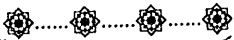
”جی ابھی آئی۔“ وہ کسی رو بوٹ کی طرح اٹھ کر واش

روم میں چلی گئی۔ فی الحال تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، تانی امی نے اسے جانے کے لیے کہہ دیا، اسماعیل نے بھی کہہ دیا کہ جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ، بوجھ بن گئی تھی کیا ان سب پر عجیب سوچوں کو لیے باہر آئی تو سب ناشتے پر موجود تھے عالمہ نہیں تھی، اسود کی آنکھوں میں عجیب سے رنگ تھے..... اس نے مزید الجھ کر نظریں جھکا لیں..... رنگ برنگ کھانوں سے میز سجی ہوئی تھی..... اسے تانی امی کے ہاتھ کے پراٹھے یاد آئے تو بھوک مر گئی۔

”کھاؤ بیٹا۔“ سائرہ نے سلاٹس اور املیٹ اس کے سامنے کیا۔

”جی۔“ وہ سر جھکائے ناشتہ کرنے لگی۔

”دیکھو بیٹا آرام سے بیٹھو، اب یہی تمہارا گھر ہے۔“ سائرہ کی اس بات پر اسود کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوئی۔



ایک ہفتہ گزر گیا تھا، خاموشی اور ویرانی سی تھی جو عزت کے جانے کے بعد ہر ہل محسوس ہوتی تھی۔ بزنس کی مصروفیات کی وجہ سے وہ گھر پر بہت کم رہنے لگا تھا..... ابا کا علاج باقاعدگی سے جاری تھا، وہ کافی بہتر ہو گئے تھے اب وہ فردوس کے ہاتھ پر معقول رقم رکھنے لگا تھا، گھر کی ضرورت کی بیشتر اشیاء بھی لا کر دی تھیں..... دن پھر نے والے تھے لیکن دل میں اداسی کے موسم نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔ انہی سوچوں میں گھر آیا تو امی کے پاس محلے کی ایک خاتون آئی پیچھی تھیں وہ سلام کر کے چھت پر چلا گیا۔ مالی بابا کی کال آ رہی تھی، جن کی وجہ سے وہ عزت کی کزن کے گھر اس کے سر کے لیے کچھ عرصہ ملازمت کرتا رہا تھا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ کیسے ہوا اسماعیل بیٹا؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔ خیریت آپ ٹھیک ہیں؟“

”ہاں بیٹا میں تو ٹھیک ہوں مگر وہ بزرگ ہیں ناں.....“

میڈم جی کے سر صاحب..... ان کی طبیعت نامسا ز ہے

تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں، اپنے بیٹے کے سامنے بھی تمہاری بہت تعریف کی انہوں نے..... بچے چارے بہت کمزور ہو چکے ہیں، ضد کرنے لگے تو میں نے سوچا کہ تمہیں فون کر کے بتا دوں۔“ مائی بابا کی بات سن کر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

”سن رہے ہو بیٹا۔“  
”جی..... جی..... کوشش کروں گا..... ان کی عیادت کے لیے۔“

”ہاں بیٹا ضرور..... ویسے بھی ان کے بیٹے کو تم سے کوئی بات بھی کرنی ہے۔“ انہوں نے فون بند کر دیا اور وہ نیچے یا تو فردوس کی اکیلی بیٹھی تھیں۔

”خالہ کیوں آئی تھیں امی؟“ وہ چار بابائی پر بٹھ گیا۔  
”تمہارے لیے رشتہ لے کر آئی تھی اگلی جلی میں رہتے

ہیں وہ لوگ..... لڑکی کا باپ کریمانے کی دکان چلاتا ہے اور ماں کپڑے سلانی کرتی ہے چار بیٹیاں ہیں ان کی..... بڑی دو شادی شدہ ہیں یہ تیسرے نمبر پر ہے خود بھی کسی اچھے شریف گھرانے کی تلاش میں تھے..... خالدہ نے ہمارے گھر کا ذکر کیا تو کہنے لگی کہ سوچا پہلے پوچھ لوں کہیں عزت اور اسماعیل کا رشتہ تو نہیں کر رکھا اگر نہیں تو وہاں بات چلاؤں۔“ وہ اٹھ کر باروچی خانے میں چلی گئیں، چائے کا پانی رکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگیں۔

”تو پھر آپ نے کیا کہا؟“

”سب کچھ سچ بتا دیا..... اپنا ماضی، اپنی ساری حقیقت، عزت اور اس کی ماں کا تمام واقعہ..... بیٹا پہلے ہی ہم لوگوں پر دھوکہ دہی اور جھوٹ کا الزام لگ چکا ہے اب اور نہیں اور ویسے بھی یہ رشتے ساری عمر کے ہوتے ہیں..... کچھ چھپانا یا غلط بیانی کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔“ وہ ٹرے میں دو کپ رکھتے ہوئے بولیں۔

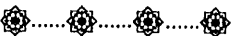
”امی لیکن میں نے عزت کے علاوہ کبھی کسی اور کے بارے میں ایسا سوچا ہی نہیں۔“

”اور اس نے تمہارے بارے میں کبھی ایسا نہیں سوچا دیکھو بیٹا..... اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں سارے

گھر کے معاملات اکیلی دیکھ سکوں..... عزت تھی تو بہت سہارا تھا مجھے اور دوسری بات یہ کہ وہ اس کی ماں ہے..... انسان سکھاتا سائنات کا بہت جلدی عادی ہو جاتا ہے وہ بھی ہو جائے گی شاید اسے یہاں گزارے اتنے سال یاد بھی نہ آئیں اس کی ماں اسے ہمارے گھر آکر آنے بھی دے تو شادی کے لیے اپنی بیٹی کے لیے تمہارا انتخاب کبھی نہیں کرے گی بس تم سوچ لو خالدہ ان لوگوں سے ساری بات کر دے گی اگر انہیں ہمارے ماضی کی نسبت اور حالات پر کوئی اعتراض نہ ہو تو تم بھی ہاں کر دینا بیٹا۔“ وہ چائے لے کر اس کے پاس آ بیٹھیں۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے ناں امی کہ عزت خود سے کوئی فیصلہ کرے اور آ جائے واپس۔“ ایک امید سی تھی وہ مسکرا دیں۔

”ایسا ہی ایک فیصلہ اس کی ماں نے بھی کیا تھا..... بوہی راہ چلتے افضل کو پسند کیا اور محبت کر لی، اس کی حقیقت کھلنے پر واپس بھی چلی گئی۔ مپاں بیوی کا ساتھ عمر بھر کا ہوتا ہے بیٹا..... دکھ اور سکھ کے ساتھ، برے وقت میں اگر کوئی رشتہ بے حد قریب ہوتا ہے تو وہ بیوی کا اور اگر بیوی ہی ساتھ چھوڑ کر چلی جائے تو کہاں کی محبت؟ عزت نے تو پھر اتنے سال یہاں اس گھر میں گزارے ہیں..... اس گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف ہے وہ..... ہاں اگر دل نے راہ دکھادی تو شاید دماغ بھی سوچنے پر مجبور ہو جائے لیکن پھر وہی ڈر کہ دل نے راہ تو اس کی ماں کو بھی دکھائی تھی۔“ وہ سچ پر تلخ باتیں تھیں..... اسماعیل نے چائے کا کپ اٹھایا اور کمرے میں چلا آیا۔ وہ فی الحال اس موضوع سے گترا ہوا تھا۔



”قسمت بھی خوب ساتھ دے رہی ہے تمہارا..... پھوپھی اسے سینے سے لگاے گھر لائیں اور امی آپ بھی چلی گئیں ان کے ساتھ..... ایک آنکھ نہیں بھائی یہ لڑکی مجھے، میں نے تو اسے نوکری بھی، بہت مجبوری میں دی تھی پہلی نظر میں ہی مجھے نوکری کے لیے بھی پسند نہیں آئی

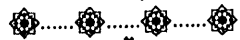
تھی..... اور آپ لوگ اسے گھر کی بیٹی بنا کر لے آئے اور خیر سے بہو بنانے کا ارادہ بھی کر لیا ہوگا۔“ عالمکہ کی آواز اندر کمرے تک آ رہی تھی۔

”دیکھو بیٹیاں میں تو مصلحت کے تحت گئی تھی آدھی جائیداد تمہاری پھوپھو کے نام ہے، مانا کہ یہ لڑکی مجھے بھی پسند نہیں لیکن اسود کی شادی کہیں تو کرنا ہی ہے ناں تو پھر اس عزت سے کر کے تمہاری پھوپھو کا حصہ بھی بچا لیتے ہیں ناں..... جب تک اس کی بیٹی نہیں ملی تھی مجھے کوئی خوف نہیں تھا لیکن ایک بات تو طے ہے اگر عزت اس کے ساتھ یہاں نہ بھی آئی تب بھی وہ اپنے حصے کی جائیداد اپنی بیٹی کو دے دیتی..... پہلے کی بات اور بھی اگر وہ نہ ملتی تو یوں بھی سب کچھ تم دونوں کا ہی تھا لیکن اب اپنی بیٹی کے ہوتے ہوئے وہ کسی صورت اپنا حصہ تم دونوں کو نہیں دے گی..... اسود کی خوشی میں ہمارا فائدہ بھی ہے۔“ ان کی بات سن کر اسود نے آنکھوں سے اسے بات سمجھنے کا اشارہ کیا۔

”اور وہ بھی یقیناً اسی لالچ میں آئی ہوگی..... اس کے ان غریب رشتہ داروں نے اسی لالچ میں بھیج دیا ہوگا۔“ وہ اٹھ کر بیگ کندھے سے لٹکائے باہر کی طرف بڑی عزت کے دل کو کچوکا لگا..... وہ کبھی بھی تانی امی اور اسماعیل پر اتنا گھٹیا الزام برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

”اب جا کہاں رہی ہو..... سوچو کہ تمہاری پھوپھو اور عزت سے رشتے کی بات کب کریں۔“

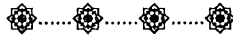
”ابھی تو میں جا رہی ہوں..... سر صاحب بہت بیمار ہیں اور اس عزت میڈم کے اس کزن کو بلانے کی ضد کر رہے ہیں عجیب جادوگر خاندان ہے..... لوگوں کو اپنے بس میں کرنا آتا ہے انہیں۔“ اس سے پہلے کہ عالمکہ کمرے سے نکلتی عزت وہاں سے ہٹ گئی تھی۔



”وہ ایک الگ ہی دنیا تھی بیٹے..... ہم لوگ شاید کئی نسلوں سے یہی کام کر رہے تھے بڑے بڑے فلمی ستاروں کو اپنے سامنے فلم اسٹوڈیو آتے جاتے دیکھتے..... کبھی کوئی کزدار ایک آدھ سین کے لیے چاہیے ہوتا تو چھوٹا سا

آڈیشن لے کر کام بھی کروا لیا جاتا، تمہارے ابا اور چاچو تو سرکس میں ہی کام کرتے تھے، عبدالباری صاحب کے کہنے پر فلموں میں ایکشن سین بھی کرنے لگے، ہوائی روزی تھی ہم اپنی اسی دنیا میں خوش تھے۔ میرے لیے بہت کوشش کی تمہاری دادی نے..... لمبی لمبی گاڑیوں میں بیٹھی فلموں کی ہیر و خیر دیکھ کر بے چاری کئی بار دوڑتی ہوئی ان تک گئی مگر ہر بار نا کام ہی لوٹی پھر افضل کی زندگی میں جب بلی آئی ناں اور اس کو اس کا پیشہ گالی بنا کر منہ پر مار گئی تب اس نگر کی کو بالکل چھوڑنے کا ارادہ کر لیا..... ہاں ایک بات ہے جب تمہاری خوشخبری ملی مجھے تو تمہاری دادی کہا کرتی تھیں کہ تمہارے چہرے پر ممتا کا نور چھلکنے لگا ہے تمہیں اب ایک حلال اور باعزت زندگی گزارنی ہے، اب تم ایک ماں ہو کوئی فالتو کردار نہیں اور اللہ گواہ ہے تمہاری دادی تمہارے دادا بابا اور چاچو نے مجھے گھر میں بٹھا کر باعزت طریقے سے کھلایا اور میں تو پھر اسی برادری، اسی خاندان کی تھی جب ان لوگوں نے مجھے گھر بٹھا کر عزت کی روٹی کھلائی تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بلی سے وہ ایسا کوئی کام کروائے شاید تمہارے چاچو سے یہ غلطی ہوئی کہ وہ کھل کر اسے اپنی حقیقت نہ بتا سکے اور اس وہم اور خوش گمانی میں ہو کہ محبت میں وہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑے گی لیکن جو ہو ابہت برا ہوا۔ میں تمہارے ساتھ وہ ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتی جو اپنی آنکھوں کے سامنے افضل کے ساتھ ہوتا دیکھا۔ اس کے غریب دل کی کرچیاں آنکھوں میں چبھتی دکھائی دیتی تھیں..... راہ چلتے محبت کا دعویٰ کرنے والی لڑکی نے گھر اور دل آباد کر کے خود اپنے ہی ہاتھوں پر برباد کر دیئے تھے..... دھوکے میں تو افضل مارا گیا تھا..... اب تمہارے بارے میں جب یہ سب سوچتی ہوں تو دل لرز جاتا ہے..... بلی کی ایک بے وقوفی نے تین زندگیاں خراب کیں اور اب اس کا یوں آ جانا اور عزت کو لے جانا کہیں تمہاری زندگی بھی خراب نہ کر دے۔ تم کوشش کرو بیٹا کہ عزت کا خیال دل سے نکال دو، جو نصیب میں ہوگی، اسے ہمارے ماضی سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔“ فردوس کی بات

پر اسماعیل نے باپ کی سمت دیکھا، انہوں نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر باہر نکل گیا اور کچھ خیال دل سے نکالنے کا مطلب ایسے ہی ہوتا ہے جیسے سینے سے دل ہی نکال دینا تھا۔



مالی بابا کا پھر فون آیا تھا۔ وہ عیادت کے لیے چلا آیا۔ زوہیب اسے دیکھتے ہی اس کی طرف آیا۔

”آؤ اسماعیل یار بابا کب سے تمہیں یاد کر رہے ہیں، ہماری غیر موجودگی میں تم نے بابا کا جس طرح خیال رکھا وہ تو تمہارا ذکر کر کے خوش ہوتے ہیں..... بہت شکریہ یار اور مہربانی ہوگی اگر تم انہیں دوائی بھی کھلا دو..... اب تو بچن کا طرح ضد کر رہے ہیں۔“ زوہیب کی بات پر وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

”اسماعیل..... یار مجھے تم سے ایک اور بات بھی کرنا تھی۔“

”جی کہیے۔“

”یار..... میں نے کبھی عائکہ کے اور اس کے گھر والوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کی..... جیسے عائکہ من مانی کرنے والی اپنی ضد پراڑ جانے والی عورت ہے اسی طرح اس کا بھائی اسود بھی بہت عجیب مزاج کا آدمی ہے۔ عائکہ نے مجھے بتایا تھا کہ اسود اس کی اسکول ٹیچر کے بارے میں بار بار ایک ہی بات کر کے پریشان کر رہا ہے..... عائکہ نے جب تمام تفصیل بتائی تو عزت نہ صرف عائکہ اور اسود کی کزن نکل آئی بلکہ مجھے تب ہی پتا چلا کہ وہ تمہاری بھی کزن ہے..... یار ایک بات دوست سمجھ کر کر رہا ہوں..... تمہارا خلوص اور تمہاری نیک نیتی دیکھ کر اس گھر میں عزت کی والدہ کی جو حیثیت ہے وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، بظاہر انہیں ایک مقام دے کر گھر میں فالتو سامان کی طرح رکھا ہوا ہے اگر وہ اتنی ہی اہم ہوتیں تو ان کے معیار کے مطابق کہیں گھر بسا دیتے..... بہر حال اب عزت کو وہ اپنی محبت میں لے تو آئی ہیں لیکن اسود عائکہ اور آئی کا خیال ہے کہ عزت اور اسود کی شادی کر کے وہ عزت کے حصے کی

جائیداد کو گھر میں ہی رکھ سکتے ہیں، میں تم سے یہ ساری بات صرف اس لیے کر رہا ہوں اسماعیل کہ میں اسود کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں وہ جنونی شخص ہے..... جب کسی بھی چیز کا جنون سوار ہو جائے تو ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور جب جنون اتر جاتا ہے تو وہی چیز نظروں میں کھٹکتی لگتی ہے..... عائکہ تو شاید صرف اپنی محرومی کی وجہ سے میرے ساتھ گزارا کر رہی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں نے اس کی محبت میں اپنی ذات کی بھی لٹی کر دی ہے۔ اس کی ہر جائزہ جائز بات صرف اس لیے مان لیتا ہوں کہ کہیں وہ اولاد کی کمی کی وجہ سے مزید دھمی نہ ہو جائے، کیا یہ ممکن نہیں کہ تم اپنی کزن کو یہاں سے لے جاؤ..... اسود سے شادی کر کے تو اس کی زندگی برباد ہو جائے گی۔“ زوہیب کی باتیں سن کر اسماعیل حیران رہ گیا شاید زوہیب خود بھی بھرا بیٹھا تھا..... ان کے مزاج سے واقف تھا اور اسے خبردار کر رہا تھا۔

”آپ یہ باتیں مجھے بتا رہے ہیں تو شاید کوئی فرق نہیں پڑے گا..... عزت جب سے یہاں آئی ہے ہم سے کوئی رابطہ نہیں کی..... اس کی اپنی زندگی ہے اور فیصلہ بھی یقیناً اس کا اپنا ہوگا۔“ اسماعیل نے سر جھٹکا۔

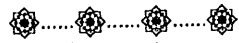
”وہ میری بہن جیسی ہے اسماعیل اگر کبھی سامنا ہوا تو ایک بار سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔“ زوہیب کی بات پر وہ اثبات میں سر ہلاتا اس کے ساتھ اندر بڑھ گیا۔ انکل اسے دیکھ کر خوش ہو گئے، دوائی بھی لی اور ڈھیروں باتیں بھی کیں۔ اس کے کاروبار کا سن کر مبارک دی وہ غمو دگی میں گئے تو اسماعیل اٹھ گیا۔ زوہیب سے مل کر وہ باہر نکل رہا تھا جب عائکہ کے ساتھ عزت اور یقیناً اس کی والدہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس سے نظریں ملیں وہ خوش تو نہیں لگ رہی تھی۔

”اسماعیل بھائی۔“ وہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھی۔ وہ اس سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا، موٹر سائیکل اشارت کر کے نکل گیا۔

”تو بہ ہے یہ زوہیب کے ابو بھی ناں..... اٹھ یہ پرانا

ڈرا بیور بھی بیٹا بنالیا، ہر ایرے غیرے کو اٹھا کر گھر بلا لیتے ہیں۔“ عائلہ کے لہجے میں جو نفرت تھی عزت کو اسماعیل کی توہین محسوس ہوئی وہ وہیں رک گئی۔ وہ لوگ عائلہ کے سر کی عبادت کے لیے آئی تھے۔ سارہ عزت کو بھی ساتھ لے آئی تھیں۔

”بہت ناراض لگتا ہے تمہارا کزن تم سے، ملا بھی نہیں سلام بھی نہیں کیا۔“ عائلہ طنز پر انداز میں اس کی سمت دیکھتی اندر بڑھ گئی، ہاں اسماعیل واقعی ناراض تھا۔ اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ سوچ کر رہ گئی تھی۔



ایک خط آیا تھا وہ لے کر اندرا ملک کے کمرے میں آ گیا۔ ”ابا یہ کسی عالیہ عبدالباری کا خط آیا ہے۔۔۔۔۔ کون ہیں؟“ وہ خط کھولنے لگا، ابا کے چہرے پر ایک چمک سی ابھری۔ فردوس بھی وہیں آ گئیں، عبدالباری صاحب کی کوئی زینہ اولاد نہیں تھی، بس ایک بیٹی ہی تھی وہ بھی ملک سے باہر۔

”عالیہ۔۔۔۔۔ عبدالباری صاحب کی بیٹی ہیں اکلوتی بیٹی ہیں اور عمر میں تم سے بہت بڑی ہیں۔۔۔۔۔ شادی کر کے ولایت چلی گئی تھیں۔ یہ ان کا ہی خط آیا ہے لیکن دے کر کون گیا؟“

”کوئی دکان دار تھا ابا کہہ رہا تھا کہ ڈاکیا پوچھ رہا تھا۔“

”ہاں کچھ سال پہلے میں نے عالیہ بہن کو خط لکھ کر افضل کی موت کے بارے میں بتایا تھا۔“

”کیا لکھا ہے خط میں؟“ فردوس کو تجسس ہوا۔

”سب کو سلام دعا۔۔۔۔۔ چاچو کی موت پر دکھ کا اظہار کیا ہے اور رابطہ نہ کرنے پر معذرت کی ہے لکھا ہے کہ وہ خود بہت بیمار ہیں۔۔۔۔۔ بابا کے علاج کے لیے پیسوں کا پوچھا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو ضرور بتائیں۔ اپنا فون نمبر لکھا ہے اور پوچھا ہے کہ اگر بیٹے کا رشتہ ہمیں نہیں کیا تو آپہیں اپنی بیٹی کے لیے ایک اچھے لڑکے کی تلاش ہے۔“ اس کی آواز پست ہوئی۔۔۔۔۔ اس نے سوالیہ نظروں سے باپ کی سمت دیکھا۔

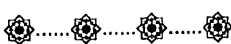
”ابا کہیں آپ نے خود ہی تو۔۔۔۔۔“

”ارے نہیں بیٹا۔۔۔۔۔ میں نے کہا تھا ناں تم سے کہ جو نصیب میں ہوگا اور جسے ہمارے ماضی سے کوئی غرض نہیں ہوگی عالیہ بہن تو اچھی طرح سے واقف تھی ہمارے کام سے۔۔۔۔۔ خود ان کے والد اس کام سے منسلک تھے۔ افضل کو تو بیٹا مانتے تھے سیٹھ صاحب۔۔۔۔۔ تم سوچ لو اگر دل مانے تو میں ان سے اس سلسلے میں بات آگے بڑھاؤں کون دیتا ہے اپنی بیٹی یوں خود کہہ کر۔۔۔۔۔ عزت دی ہے عالیہ بہن نے ہمیں۔“ فردوس بھی خوش تھیں۔ اسماعیل کے دماغ میں زوہیب کی باتیں بھی بازگشت کر رہی تھیں اور اب یہ خط وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”وہ جو کوئی بھی ہے یہاں آ کر تو نہیں رہے گی کبھی۔۔۔۔۔ آپ دونوں کو کس کے سہارے چھوڑ کر جاؤں گا۔۔۔۔۔ یہ خیال بھی دوبارہ دل میں نہ لایئے گا۔“ اس نے سرفنی میں ہلا دیا۔

”اللہ مالک ہے بیٹا لیکن تمہاری اپنی بھی تو کوئی زندگی ہے ناں۔“ فردوس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”میری زندگی آپ، ابا اور عزت سے جڑی ہوئی ہے امی۔۔۔۔۔ آپ لوگوں سے الگ ہو کر زندگی زندگی ہی نہیں لگتی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ میرے لیے پریشان ہیں لیکن آپ لوگ فی الحال اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں مجھ سے، عزت کے لیے رشتہ دیکھتی تھیں آپ کیا ہوا؟ ہمیں بات بنی میرے لیے بات چلائی محلے میں۔۔۔۔۔ ان لوگوں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔۔۔۔۔ امی مجھے شروع سے لگتا تھا کہ اس گھر کا سکون تلاش کرنے کے لیے ہمیں کہیں باہر نہیں جانا پڑے گا شاید میں غلط تھا لیکن ابھی وقت کو بھی وقت دیں۔۔۔۔۔ حالات جس طرح بگڑے ہیں سدھر بھی تو سکتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ عالیہ ان کی کو شکر یہ کا خط لکھ کر کوئی مناسب جواب دے دیں کہ ان کی دل آزاری نہ ہو۔“ وہ بات کر کے اٹھ گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے تھے۔

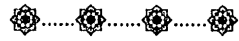


یہ ایک بہت بڑا گھر تھا جس کے وسیع لان کی بیرونی دیواریں کاسنی پھولوں کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ وہ یونہی غائب دماغی سے بیٹھیں ان پھولوں کو دیکھ رہی تھی جب اسودا گیا۔ کھکارنے کی آواز پر اس نے گردن اٹھا کر دیکھا اور دو پٹا ٹھیک کرتی اندر جانے کے لیے پلٹ گئی۔  
 ”رکوعزت۔“  
 ”جی کہیے۔“

”تم جانتی ہو کہ گھر میں ہماری منگنی کی بات ہو رہی ہے تم مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی لگی تھی میں نے عاقلہ سے تمہارے سلسلے میں بات کی..... شروع شروع میں کچھ مسائل ہوئے لیکن شاید میری طلب گچی تھی کہ تم سے نہ صرف نصیب مل گئے بلکہ تم اپنی ہی نکل آئی..... اب گھر میں جو بات چل رہی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اس میں دل سے سوائے میرے اور پھوپھو کے کوئی خوش نہیں..... امی اور عاقلہ تو بس کسی مصلحت کے تحت خاموش ہو گئی ہیں اور وہ مصلحت کیا ہے؟ شاید تم جان چکی ہو مادہ پرستی کا دور ہے آج کل رشتے بھی دولت کے لالچ میں بننے ہیں۔ تم بہت خاموش ہو کچھ ہو گئی نہیں؟“ اس نے سرفی میں ہلایا۔  
 ”دیکھو عزت..... میں بہت آزاد خیال اور زمانے کے ساتھ چلنے والا انسان ہوں محبت ایک الگ چیز ہے اور ساتھ زندگی گزارنا بالکل الگ..... میں نے تمہیں پسند کیا یہ بات میرے دل میں تھی اور میرے گھر والوں کو علم تھا لیکن جب ہمارا رشتہ بن جائے گا تو میرے دوستوں کو اور میرے کونیکڑ کو یہاں تک میرے رشتہ داروں کو تمہارے بارے میں پتا چل جائے گا..... تم میرے ساتھ ہو گئی، تمہیں میرے گھر کے اور شوٹل اسٹینس کے مطابق اپنے آپ کو بدلنا ہوگا، میرے ساتھ کھڑی عزت میری بیوی لگے نہ کہ ملازمت۔“ اسود کی بات پر اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا..... وہ اب تک اسود کو بہت سنجیدہ لے رہی تھی۔ اس سے شادی اور اپنی مرضی کے بارے میں خود سے کئی بار سوال کر چکی تھی لیکن یہ کسی محبت تھی، اندر سے تو وہ بھی مادہ پرست ہی نکلا تھا۔ جن سے محبت کی جانی ہے ان میں ہر

عیب بھی بہتر لگتا ہے۔  
 ”اور ہاں..... مجھے پتا ہے کہ تمہیں جاب کا بھی شوق ہے۔ جب عاقلہ نے تمہیں جاب سے نکالا تھا تو تم بہت روٹی تھی یہ بات مجھے اسکول کی بانی ٹیچر سے بھی پتا چلی کہ تم نے جاب کے لیے گھر والوں کو ناراض بھی کیا تھا اور تمہارا شوق بھی تھا جاب کرنا، میری طرف سے تمہیں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی، یہ سب زمانے کی گندگی نہیں بلکہ انسان کی اپنی منفی سوچ کی عکاسی ہوتی ہے جب وہ عورت پر بیچارہ روک ٹوک کرتا ہے۔“ اسود نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پتا نہیں کیوں عزت کو بہت برا لگا..... وہ بھی اور اس کی باتیں بھی کتنا عرصہ اسما عیل کے گھر رہی تھی وہ اس سے محبت بھی کرتا تھا لیکن کبھی اس نے چھووا تک نہیں تھا۔ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ پیچھے ہوئی۔  
 ”لیکن مجھے بہت اچھا لگتا ہے جب کوئی مرد اپنی عورت کی حفاظت کے لیے اسے زمانے کی نظروں سے اور اونچ نیچ سے بچانا چاہتا ہے..... جب وہ ساری ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لے کر صرف عورت کی عزت کا تحفظ چاہتا ہے اور رہی بات کہ یہ سب زمانے کی گندگی ہے وہ تو میں نے ابھی دیکھی..... کس رشتے کی حیثیت سے آپ اتنے بے تکلف ہو رہے تھے۔“ وہ غم اور غصے سے بولی۔ اسود کو قلعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ برامان جائے گی۔  
 ”جواب میرا شوق کبھی بھی نہیں رہا..... میری بے وقوفی تھی کہ میں نے گھر سے باہر قدم نکالا..... عورت کی آزادی اگر صرف شوقی ملازمت تک ہے تو ایسی آزادی آپ کی کلاس کی عورتوں کو مبارک..... مجھے وہی آزادی پسند ہے جو مجھے گھر کی چار دیواری میں ملے یا جہاں مجھے اپنی ذات کی توہین محسوس نہ ہو، مجھے کسی کے لیے اپنا آپ بدلنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بات ختم کر کے اندر چل گئی۔ وہ اس کے پیچھے جانے کے بجائے وہیں کھڑا رہا..... وہ پتا نہیں عزت سے کیوں متاثر ہوا تھا، پتا نہیں اسے اس میں کیا پسند آیا تھا جس جذبہ کو وہ محبت کا نام دے رہا تھا..... وہ محبت تھی کہ نہیں، وہ کوئی جنونی کیفیت تھی جو ان اور نر

گئی تھی۔



”کہاں جارہی ہو تم عزت؟“ سائرہ نے اسے چادر اوڑھتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

”اپنے گھر جارہی ہوں جہاں میں نے پیدائش سے لے کر اب تک کا وقت گزارا، مجھے یہاں آ کر نہ سکون مل رہا ہے نہ خوشی اور مجھے اسود سے شادی بھی نہیں کرنی اور آپ کے بغیر میں نے اتنے سال گزار لیے باقی کی زندگی بھی گزار لوں گی، مجھے آپ کی گود میں وہ سکون نہیں ملا جو تانی امی کی گود میں سر رکھ کر ملتا ہے..... آپ پلیز دوبارہ مت آئیے گا مجھے لینے نہ ہی ملنے کی کوشش کیجیے گا، آپ میری ماں ہیں اس لیے میں آپ سے بالکل لائق بھی نہیں رہ سکتی تھی کبھار فون کر کے حال چال پوچھ لیا کروں گی آپ کا، دوسری بات یہ کہ آپ اپنے حصے کی جائیداد اسود اور عائکہ میم کے نام کر دیں مجھے آپ لوگوں سے کچھ بھی نہیں چاہیے، اس روز میں آپ کے ساتھ خاموشی سے آگئی تانی امی نے بھی شاید اسی لیے آنے دیا کہ میں یہاں آ کر دیکھ سکوں کہ یہاں میرا دل لگتا ہے کہ نہیں شاید لگ جاتا لیکن آپ جن لوگوں سے میرا رشتہ جوڑنے جارہی تھیں ان کی اصلیت مجھ پر کھلتی چلی گئی میرا دل نہیں لگ رہا یہاں، چند دن خود پر جبر کر کے گزارے ہیں میں نے ساری زندگی کیسے گزار سکتی ہوں۔“ وہ انہیں بھی سناتی چلی گئی۔

”آپ سے بے وفائی نہیں کی تھی میرے بابا نے اور حقیقت بھی بتانی چاہی تھی لیکن تب آپ کے سر پر جنوں سوار تھا جب وہ اترا تو میرے بابا بھی دھوکے باز لگے اور میری محبت بھی آپ کے قدم نہ روک سکی اتنی نفرت ہوگئی تھی میرے بابا سے کہ مجھے بھی اٹھا کر نکال دیا اپنی گود اور اپنی زندگی سے جس عورت نے اتنے سال مجھے ماں بن کر پالا، اپنے سینہ سے لگا کر رکھا میرے لیے وہی ماں ہے اور اپنے پیچھے کی طرف سے بھی پریشان نہ ہوں آپ کا خون ہے وہ بھی جنونی ہے اس کے سر سے بھی محبت کا بھوت اتر

جائے گا جیسے آپ کو میرے بابا حقیر اور خود سے کم تر لگنے لگے تھے اسے بھی میں ابھی سے کم تر لگنے لگی ہوں ایک بار پھر کہہ رہی ہوں دوبارہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کیجیے گا۔“ وہ ان پر آخری نظر ڈال کر باہر نکل گئی، زندگی میں کچھ واقعات و حادثات صرف اس لیے بھی ہوتے ہیں کہ انسان ان لوگوں کی قدر کر سکے جن کے ساتھ رہتے ہوئے ان کی محبت، فکر اور توجہ کی وہ کوئی پروا نہیں کرتا، وہ محبت جو اسماعیل کے دل میں اس کے لیے تھی اس نے اس محبت اور فکر کی پروا نہیں کی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اسے یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔

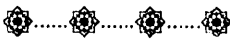
”کہاں جارہی ہو عزت۔“ زوہیب شاید عائکہ کو لینے آیا تھا۔ اسے یوں آنسو بہاتے باہر کی سمت جاتا دیکھ کر ٹھنکا۔

”زوہیب بھائی آپ مجھے میرے گھر تک چھوڑ دیں گے پلیز۔“ اس نے منت بھرے انداز میں کہا۔

”شیور..... آؤ تم۔“ زوہیب نے اسے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر آئی عائکہ نے اس منظر کو شکی نظروں سے دیکھا اور غصے سے واپس اندر کی سمت بڑھ گئی۔

”یہ عزت کا زوہیب کے ساتھ کہاں جانا ضروری تھا؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولتی پھوپو کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

”راہ چلتے لوگوں سے راہ و رسم بڑھانا خوب سکھایا ہے آپ نے اپنی بیٹی کو، زوہیب ہی ملا تھا اسے.....“ عائکہ نے اپنا غصہ نکالنے کے لیے اپنی سگی پھوپو کو وہ گالی دی جو عزت کی کبھی گئی باتوں سے کئی زیادہ کاٹ دار تھی۔ وہ خاموشی سے کسی پتھر کے بت کی طرح بیٹھی رہ گئی تھیں۔



چراغ دل جلا دیا

یاد کے جھروکے میں

وفا کا تیل ڈال کر..... ہتھیلیوں کی باڑ سے

زمانے سے چھپا دیا

چراغ دل جلا دیا



ہوں..... یہ گھر اور اس گھر میں رہنے والا ایک مخلص شخص  
 یہی تمہاری اصل منزل ہے، تمہیں یہاں سے جانا ہی نہیں  
 چاہیے تھا لیکن جو ہوا بہتر ہوا، کچھ لوگوں کی اصرار کھل گئی  
 کچھ لوگوں کی کھول محبت سامنے آ گئی اور ایک بات اور یاد  
 رکھنا مرد کو اچھا لگتا ہے جب وہ کچھ سمجھائے تو عورت سمجھ  
 جائے..... میری بد نصیبی کہ میری بیوی نے آج تک میری  
 کوئی بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ زوہیب نے گاڑی  
 روکی اور اسے بڑے بھائی کی طرح سمجھایا تو وہ اثبات میں  
 سر ہلاتی اتر گئی۔

”شکر یہ نہ ہوہیب بھائی۔“ دروازہ بجاتے ہوئے وہ  
 خوش بھی تھی اور غمگین بھی۔

”کون ہے؟“ اندر سے تائی امی کی آواز آئی۔

”میں ہوں تائی امی..... عزت۔“

”عزت.....!“ ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ وہ اسے

حیرت سے دیکھ رہی تھیں، ایک امید سی تو تھی کہ وہ واپس  
 آئے گی لیکن اتنی جلدی آجائے گی اس کی امید نا تھی۔

”عزت میری بچی۔“ انہوں نے اسے ساتھ لگا لیا۔

ان کے ساتھ لپٹ کر وہ متا کی اس خوشبو کو محسوس کرتی رہی  
 جوان سے دور ہونے اور اپنی حقیقی ماں کے قریب ہونے پر  
 محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان سے گلے لگ کر رونے لگی  
 یوں جیسے سالوں بعد مل رہی ہو۔

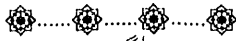
”آ جاؤ بیٹا..... اندر آ جاؤ۔“ وہ اسے ساتھ لگائے اندر

لے آئیں..... اتنے دنوں بعد اپنے گھر کا سکون دل کے

اندر ٹھنک بن کر اتر رہا تھا، تائی ابو نے بھی سر پر ہاتھ رکھا۔

دل میں اب اسماعیل کا سامنا کرنے اور اس کی ناراضی

دیکھنے کا خوف تھا۔



”اچھا ہو گیا کہ خود چلی گئی اور جاتے جاتے بتا گئی کہ

اسے نہ اسود سے شادی کرنی ہے ناں پھوپھو کے حصے سے

کوئی دلچسپی ہے لیکن اس نے اسود کو یونہی انکار نہیں کیا

ہوگا۔ زوہیب کے آگے پیچھے کب سے گھوم رہی تھی

مجھے نظر ہی نہیں آیا، اسے ایک آخری بار اس کی اوقات تو یاد

کٹ گئی شب بھر بھی

آگئی صبح وصل بھی

آندھیاں بے وفائی کی

نہ بچھائیں نہ مٹا سکیں

تیری مشعل راہ بنادیا

چراغ دل جلا دیا

وہ جو ایک دعویٰ تھا عشق کا

وہ نہ عشق تھا نہ ہی پیار تھا

جس آپ سمجھتے تھے زندگی

کسی راہ کا غبار تھا

وہ جو کل بھی، جو خواب تھا

وہی چاہ تھی اصل خیال تھا

جسے ملے بغیر چلے گئے

اسے راہ نما بنا لیا

چراغ دل جلا دیا

تیرے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکرایا تو فردوس نے

بخور اسماعیل کو دیکھا۔

”تو تمہاری طرف سے انکار ہی سمجھوں میں۔“

”میں بہت کوشش کے باوجود عزت کو بھلا ہی نہیں

سکا، اسے دل سے نکال ہی نہیں سکا، دل ایک چراغ کی

طرح جل رہا ہے اور اس چراغ کی لو سے جو روشنی پھیل

رہی ہے اس میں صرف عزت کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔“ وہ

خود کلامی کے انداز میں بولا تو فردوس نے اس کے آگے

کھانا رکھا اور وہیں بیٹھ گئیں۔

”تم سوچ لو اسماعیل تمہارے ابا کی حالت ٹھیک

نہیں..... وہ تمہیں آباد دیکھنا چاہتے ہیں تم ایک بار جا کر

خود اس سے بات کر لو اگر اس نے پھر بھی انکار کر دیا تو یہ

تمہارا نصیب۔“ وہ بات کر کے اٹھ گئیں، سردی بڑھ گئی تھی

وہ کھانا کھانے لگا۔ عجیب سی اداسی تھی عجیب سی خاموشی

جیسے کچھ ہونے والا ہو، کچھ بہت عجیب سا۔



”عزت ایک بھائی کی حیثیت سے مشورہ دے رہا

کردانی بہت ضروری ہے..... اس کا وہ کزن بھی اسے منہ نہیں لگائے گا اب۔“ عالمہ غصے سے بھری بارہنگی تھی..... سب کی نظریں اسود پر تھیں۔

”شاید عالمہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے..... اکثر ہم کسی کو دیکھ کر یونہی بغیر کسی وجہ کے اس سے متاثر ہو جاتے ہیں لیکن نہ دل ملتے ہیں نہ خیالات، پھوپھو سے بھی تو یہی غلطی ہوئی تھی ناں یونہی کسی بھی راہ چلتے تو ہم زندگی کا سانس ہی تو نہیں بنا سکتے ناں۔“ وہ بہت پست آواز میں بولتا وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ وہ طعنہ اور گالی تھی جو عزت اور افضل کے حوالے سے ماضی کے راز کھلنے کے بعد کئی بار سننے تھے اور اب شاید ہمیشہ سننے تھے۔ وہ جیسے ڈھسے سی گئیں۔

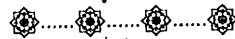


عشاء کی اذان ہوتے ہی دروازے پر موٹر سائیکل کی آواز آئی، تائی امی نے جان پوچھ کر جائے نماز سنبھال لی تھی۔ وہ جو وضو کرنے جا رہی تھی پوچھل ہوتے دل کے ساتھ دروازے کی سمت بڑھی۔ اسماعیل نے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی کر کے دروازہ بند کیا اور اس کی سمت دیکھے بغیر اندر کی طرف قدم بڑھا گئے۔

”امی..... امی کہاں ہیں آپ؟“ وہ ان کے کمرے کی طرف بڑھا..... اسی لمحے کی خوف سے سانسیں بند ہو رہی تھیں اس کی ناراضی بجا تھی۔

”ابھی اذان ہو رہی ہے آج اتنی جلدی نماز شروع کر دی۔“ وہ ابابا کے پاس بیٹھ گیا..... انہوں نے اشارے سے اسے عزت کی واپسی کے بارے میں بتایا تو اس نے مسکرا کر اشارات میں سر ہلا دیا۔

”امی مجھے کھانا دے دیں نماز پڑھ کر۔“ وہ انہیں کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ عزت سمجھ گئی کہ وہ اس سے بہت ناراض ہے۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔



دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک سے آنکھ کھلی تھی..... رات یوں بھی بہت دیر تک اس کو نیند نہیں آئی تھی، صحن میں عجیب سا ہنگامہ تھا اس نے کسمندی سے

آنکھیں کھولیں، صبح کے نونج رہے تھے پتا نہیں کسی نے جگایا نہیں تھا یا وہی اتنی بے سدھ سوئی تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر دوپٹا اوڑھا صحن سے آنے والی آوازیں مزید بلند ہونے لگیں، دروازہ کھولنے پر عجیب منظر دکھائی دیا، تائی امی اور اسماعیل کھڑے تھے بیرونی دروازے سے کچھا گے عالمہ اور زوہیب بھائی کھڑے تھے عالمہ مسلسل کچھ بول رہی تھی۔ خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ باہر نکلی۔

”میں بہت دیر سے آپ کا لحاظ کر رہا ہوں۔“ اسماعیل نے انگلی اٹھا کر عالمہ کو مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے ناچھی سے پوچھا۔

”مجھ سے پوچھتی ہو کیا ہوا؟ ہو کیا تم، کوئی میری نظر سے دیکھے تو انتہائی معمولی اور بد صورت لڑکی جسے کوئی دوسری نظر دیکھنا بھی نہ چاہے لیکن کچھ تو ہے تم میں ایسا کہ پہلے میرے بھائی کو اپنے تعاقب میں لگایا اور اب میرے شوہر کو۔“ عالمہ کسی شیرنی کی طرح دھاڑی تو عزت کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اتنا بڑا الزام۔

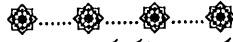
”عالمہ تم اپنے ہوش و حواس میں بالکل نہیں ہو غصے نے تمہیں پاگل کر دیا ہے۔“ زوہیب اسے شانوں سے تھاپے واپسی کے لیے مڑا لیکن وہ اس کے قبو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

”اچھی طرح سے پورے ہوش و حواس میں ہوں میں اور سب دیکھ رہی ہوں آپ کے بابا تو پہلے ہی ان دونوں کے گن گاتے رہتے ہیں اور آپ شاید وہ ساری محرمیاں دور کرنے کے لیے جو میری ذات سے منسلک ہیں اس کی طرف بڑھے ہیں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے آپ کو اس کے ساتھ گاڑی میں آتے..... آخر کوئی تو بات چیت رہی ہوگی ناں جو یوں بے جھجک آپ کے ساتھ آ گئی اور شکر کہ اسو کی آنکھوں سے وہ محبت کی پٹی اتر گئی لیکن زوہیب میں اسے اپنا گھر خراب کرنے ہرگز نہیں دوں گی، بداری کی اولاد تمہارے کرنا خوب جانتی ہے۔“ عالمہ نفسیاتی مریضہ لگ رہی تھی۔

”بس..... بہت ہو گیا۔ زوہیب اسے لے جاؤ یہاں

سے اور علاج کرواؤ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے۔“ اسماعیل نے آگے بڑھ کر باہر کا دروازہ کھول دیا۔ زوہیب تقریباً اسے گھینٹتے ہوئے لے گیا اور وہ چمکا کر گری گئی تھی۔

”عزت میری بچی۔“ تائی امی گہرا کرا سے سنہالنے آگے بڑھی تھیں، بندھوتی آنکھوں سے اس نے اسماعیل کا متفکر چہرہ دیکھا تھا۔



چراغ دل کو ذرا سنہال کر رکھنا

چلے گی آج شام ہوا ادا سی کی

بچ ہوا کا جھونکا بیرونی کھڑکی سے اندر آیا تو ایک کپکی لے کر لمبل اوڑھا اور ذرا سی آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لیا۔ صاف ستھرا کمرہ، کھڑکی سے آتی بچ ہوا میں صحن میں کھلے گلابوں کی مہک رچی تھی۔ میز پر پانی کا گلاس رکھا تھا۔ صحن میں مکمل خاموشی تھی دروازے سے دھلا دھلایا صحن دکھائی دے رہا تھا اور صحن کے دوسری طرف بنے برآمدے اور باورچی خانے کے چوہے پر رکھا پریش کر اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ تائی امی سارے کام نبٹا چکی ہیں دماغ مکمل بیدار ہوا تو صبح کا سارا منظر یاد آ گیا۔

”اوہ..... میرے اللہ۔“ ایک بار پھر سر تکیے سے ٹکا دیا۔

”اٹھ گئی میری بیٹی۔“ تائی امی چائے لے کر آئیں۔

”اٹھو چائے پی لو۔“ صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تم نے.....

اٹھو میری بیٹی شاباش۔“ انہوں نے اس کا تکیہ درست کیا اور وہیں اس کے پاس بیٹھ گئیں، تکیے سے سہارا لے کر بیٹھتے ہوئے اس نے چائے کا کپ تھما۔

”چمکا دیا گیا تھا نہیں..... محلے کا ڈاکٹر چیک کر کے گیا ہے کہنے لگا کہ معمولی کمزوری ہے..... اسماعیل دوای دے کر گیا ہے تم چائے پی لو پھر میں دوای دیتی ہوں۔“

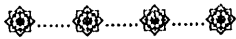
”تائی امی..... اسماعیل کہاں ہیں؟“ اس کے یوں پوچھنے پر وہ چونکیں..... اس کی ناراضی پہلے ہی پریشان کر رہی تھی اس پر صبح ہونے والی ساری باتیں..... وہ کیا سوچتا ہوگا؟ اس نے چائے میز پر رکھ دی۔

”کام پر گیا ہے۔“

”تائی امی آپ نے ایک مرتبہ مجھ سے اپنی اور تائی ابوکی ایک خواہش کا اظہار کیا تھا..... آپ نے کہا تھا کہ اگر میں اور اسماعیل..... مجھے آپ کی ہر خواہش پہنچا رہی ہے تائی امی..... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے دیکھ لیا اس گھر سے باہر کی دنیا کتنی بری ہے مجھے یہیں رہنا ہے اسی گھر میں ہمیشہ۔“ وہ ان کے ہاتھ تھمتے روتے ہوئے بولی۔

”عزت..... میری بچی۔“ انہوں نے تڑپ کر اسے ساتھ لگایا۔

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا تائی امی..... زوہیب بھائی صرف مجھے چھوڑنے آئے تھے..... عائد کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور..... تائی امی میں وہی کروں گی جو آپ لوگ کہیں گے بس آپ اسماعیل سے کہیں ناں وہ مجھ سے ناراض نہ ہو، مجھ پر شک نہ کرے میں نے تو بس اس گھر کی خوشحالی کے لیے ملازمت کی تھی۔ بہت سی عورتیں کام کرتی ہیں یقیناً سب کے ساتھ تو برائیاں ہوتا ہوگا لیکن میرے ساتھ ایسا اس لیے ہوا کہ مجھے اچھے اور برے کی تمیز آ جائے آپ لوگ مجھے سمجھانا چاہتے تھے اور ہمارے ماضی سے جڑی وہ ساری باتیں جو میں نہیں جانتی تھی شاید اسی لیے اسماعیل اور آپ مجھے گھر سے باہر نکلنے سے روکتے تھے مجھے معاف کر دیں تائی امی آپ اسماعیل سے کہیں ناں کہ میں ان سے نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں مجھے آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہنا ہے ہمیشہ۔“ وہ ان سے لپٹ کر اور بھی زور سے روتی رہی اور وہ اسے سینے سے لگا لے خود بھی سسکتی رہیں۔



نیم تاریک چھت پر اس کا سفید لباس اس کے وجود کے وہاں ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ بہت خاموشی سے اس کے عقب میں آ کھڑی ہوئی۔ ایک عجیب سی الجھن تھی اس سے بات کرنے سے ڈر لگ رہا تھا۔

”امی نے کہا کہ تم نکاح کے لیے تیار ہو۔“ اس کی بوجھل آواز نے خاموشی کو توڑا گویا وہ اس کی آمد سے باخبر تھا

جو باوہ خاموش ہی رہی۔

”شاید امی نے تمہیں بتایا ہو کہ میرے لیے باہر سے بھی رشتہ آیا ہے کوئی پرانے واقف کار ہیں..... امی اباکے جاننے والے جانتی ہوں ناں تم..... پرانے واقف کار یعنی سرکس والے۔“ عجیب طنز یہ لوجہ تھا۔

”اور آپ نے کیا جواب دیا؟“

”کیوں..... امی نے تمہیں نہیں بتایا؟“ وہ اس کو بخور دیکھنے لگا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی شرمندہ اور افسردہ سی۔

”نہیں..... نہیں بتایا..... لیکن آپ مجھ سے ناراض ہیں میری بے وقوفی کا انجام بہت غلط ہوا لیکن آپ خود بتائیں کہ اگر اس گھر کی خوشیوں کی خاطر ایک قدم اٹھایا تھا تو اس میں غلط کیا تھا؟ ہاں اس نوکری کی کڑیاں میری ماں اور ہمارے بزرگوں کے ماضی سے جا ملیں..... مجھے ایک نصیحت ہوگئی کہ باہر کی دنیا میں سب اچھا نہیں ہے اور خاص طور پر ہم جیسے لوگوں کے لیے۔“ وہ باقاعدہ رونے لگی۔

”میں سب جانتا تھا عزت..... چاچو کی کہانی اور اپنے بڑوں کے کام سے متعلق تقریباً ہر بات لیکن تم سے چھپا کر رکھا، ہم لوگوں کا مقصد تمہیں ایک باعزت اور محفوظ زندگی دینا تھا، میں کوشش تو کر رہا تھا پر قسمت میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور مجھے ہمیشہ سے اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ عورتوں سے کام کروانے کی جو گالی چاچو کو ان کی بیوی نے دی وہ زندگی میں کبھی بھی مجھے بھی سنی پڑے اسی لیے مجھے تمہارا گھر سے ٹکنا پسند نہیں تھا اگر تم میرا ہاتھ تھام لیتی تو زندگی پرسکون ہو جاتی، قسمت بدل جاتی..... لیکن امی نے کہا تمہارے خواب ہیں اور میں کون ہوتا ہوں تم سے تمہارے خواب چھیننے والا بس پھر خاموش ہو گیا جب زوہیب کے والد اکیلے ہوئے عائکہ اور زوہیب سیر سپاٹے کے لیے گئے تو میں وہاں ان کے گھر آنے جانے لگا ایک دو دفعہ اسود سے آنا سامنا بھی ہوا..... وہ اچھا

انسان نہیں تھا عائکہ اور زوہیب کے گھر کے فرد کی وجہ سے تو میں اسے جان ہی گیا تھا..... تمہارا ان کے ہاں ملازمت کرنا ہی میرے لیے فکر کا باعث تھا اور تم..... تم چلی گئیں..... تمہارے لیے میں کبھی اتنا اہم تھا کہ تم میری کبھی کسی بھی بات کا مان رکھو؟“ وہ سینے پر ہاتھ باندھے ناراض کھڑا تھا۔ پہلی بار کھل کر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔

”کیا رشتہ ہے ہمارا..... صرف کزن کا۔“ اس نے بولنے کے لیے لب کھولے کہ اس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”یہ کزن تو تیار تھا ناں محرم بننے کو..... تم ہی تھی جس نے کہا تھا کہ کبھی ایسا سوچا نہیں۔“ اس کا غصہ اب لہجے میں عود کر آیا تھا۔

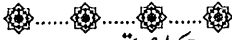
”اگر اس وقت تم میری بات مان جاتی تو یہ اپنی ماں کو کہہ کر انکار کر سکتی تھی کہ جب تک اسماعیل سے نہ پوچھ لوں اس گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی۔“

”تب تائی امی بھی تو خاموش رہی تھی ناں..... روک لیتیں نہ جانے دیتیں مجھے۔“ شکوہ زبان سے پھرایا تو وہ دو قدم آگے بڑھا۔

”وہ تمہاری ماں سے کیا کہتیں کہ میں نہیں جانے دوں گی..... ماں اور تائی میں ماں کا حکم ماننا ضروری ہے..... تمہیں جانے سے نہیں روک سکتی تھیں..... ہاں ماں اور شوہر میں شوہر کا حکم ماننا ضروری ہے عورت کے لیے۔“ وہ کچھ جتا رہا تھا۔

”اچھا اب بس کر دیں ناں، معافی مانگ رہی ہوں اپنی غلطی پر پچھتا بھی رہی ہوں..... اس اسود کو تو میں ایسا جواب دے کر آئی ہوں کہ ساری زندگی اب سوچے گا بھی نہیں..... یہ آپ کا ساتھ میری مجبوری نہیں ہے اسماعیل..... زندگی میں یہ سب جو ہوا شاید یہاں سے جانا، اس محبت کی شدت، اس کے وجود کا احساس دلانے کے لیے ہوا جو مجھے اس گھر سے تائب اور تائی امی سے اور آپ سے ہے۔“ وہ روائی میں کہہ گئی..... وہ سرشاری سے مسکرا دیا۔

اس کو دیکھ رہا تھا۔ کتنے انمول رنگ عزت کے چہرے پر آ کر ظہر گئے تھے۔



بڑی روشن اور بچیلی صبح تھی۔ وہ ناشتہ بناتے ہوئے بار بار اپنے مہندی والے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ رات اس کا اور اسماعیل کا نکاح ہوا تھا اور وہ اپنے کمرے سے رخصت ہو کر اسماعیل کے کمرے میں منتقل ہو گئی تھی۔ محلے کے کچھ لوگ اور اسماعیل کے چند دوست اور ان کے گھر والے رات کھانے پر مدعو تھے۔ تانکی امی اور تانیا ابو کی دعاؤں میں وہ رخصت ہوئی تھی۔ بس تھوڑی دیر کے لیے وہ اس گھر سے اور اس گھر کے کینوں سے دور ہوئی تھی اور یہ دوری اسے ان لوگوں کے مزید قریب لانے کا باعث بنی تھی۔ اسماعیل کے سامنے پراٹھا اور چائے رکھتے ہوئے وہ وہیں اس کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

”آج سے پہلے بھی صبح کا وقت مجھے اتنا روشن اور خوب صورت نہیں لگا۔“ وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ صاف ستھرے خوب صورت چہرے پر شریک مسکراہٹ بکھر گئی۔

”اور آج سے پہلے مجھے بھی آپ کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنا کبھی اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔“

”حالانکہ ہم بچپن سے ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے پیتے رہے ہیں۔“ وہ ہنس دیا۔

”آپ ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں اسماعیل اور یہ بات بھی میں نے آج سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی۔“ وہ نوالہ توڑتے ہوئے ہنس دیا۔

”کیونکہ اب رشتے کی نوعیت بدل گئی ہے ناں اس لیے اور مجھے اسی خوشی اسی سکون کی خواہش تھی۔“ اس نے عزت کے حنائی ہاتھ تھام لیے۔

”وعدہ کرو عزت..... تم زندگی میں کبھی بھی مجھ سے الگ ہو کر کچھ نہیں سوچو گی۔“

”ایک بار آپ سے الگ ہو کر سوچ لیا اور نتیجہ بھی بھگت لیا اور آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں بھی آپ سے

”کیا کہا تم نے پھر سے کہنا..... محبت اور وہ بھی مجھ سے.....“ آنسو اس کی آنکھوں سے تواتر سے بہہ رہے تھے وہ اشکات میں سر ہلانے لگی۔

”ہوئی..... اچانک یا پھر پتا نہیں کب سے تھی..... بس مجھے پتا بہت دیر سے چلا..... بس ہوئی اور اب مجھے کہیں نہیں جانا اس گھر کو چھوڑ کر اور نہ آپ کو چھوڑ کر۔“ وہ آنسو صاف کرنے لگی..... اسماعیل کے چہرے پر سکون اور اطمینان بکھرنے لگا۔

”اور اگر کوئی لینے گیا وہاں سے تو.....“

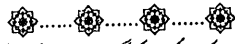
”آپ نے ابھی کہا تھا کہ شوہر کا حکم ماننا ضروری ہے کہہ دوں گی کہ میرے شوہر کی اجازت نہیں ہے۔“ اس کے منہ سے سن کر اتنا اچھا لگا کہ وہ ہنستا چلا گیا۔

”زندگی میں کچھ حادثات و واقعات ہمیں ایک دوسرے کی قدر دلانے اور محبت کی پرکھ کرنے کے لیے ہوتے ہیں..... مجھے لگتا ہے کہ چاچو کی زندگی میں محبت کا خانہ خالی ہی رہا۔ ہم زندگی میں عمر کے کسی کمزور لمحے یا وقتی جذبے کی گرفت میں آ کر کوئی فیصلہ کر لیں اور اسے نبھانہ سکیں تو یہ محبت تو نہیں..... جب ابو بونخط آیا اور میرے لیے رشتے کا ذکر ہوا تو مجھے لگا کہ یہ حصہ جسے زندگی میں محبت کے لیے وقف کیا جاتا ہے یہ تو بس تمہارے نام کے سوا کچھ بھی نہیں..... دل میں بس تمہارے نام کا چراغ جل رہا ہے اور جلتا رہے گا ساری زندگی۔“ اس نے صدق دل سے کہا۔ عزت کو اس کے کہہ ایک ایک لفظ پر یقین تھا۔

”تمہاری خوشی اور ضرورت کا خیال رکھوں گا اس کے لیے اگر مجھے موت کے کنویں میں موٹر سائیکل بھی چلانا پڑے تو چلاؤں گا۔“ وہ مسکرائے لگی۔

”اس دن جب زدہیب بھائی مجھے چھوڑنے آئے تھے تو انہوں نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ عزت ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے مشورہ دے رہا ہوں یہ گھر اور اس گھر میں رہنے والا شخص یہی تمہاری منزل ہے اور آپ کو پتا ہے اسماعیل..... یہ بات بالکل سچ ہے بس میں راستہ بھول گئی تھی۔“ وہ سر جھکائے اعتراف کر رہی تھی اور وہ بنور

الگ ہو سکتی ہوں بے شک تائی امی نے مجھے ماں بن کر پالا ہے لیکن میری زندگی میں میرے اپنے ماں باپ کے وجود کی جو کمی تھی وہ بہر حال رہی..... اب اگر زندگی میں پہلی بار بالکل اپنا ذاتی رشتہ ملا ہے تو میں اس سے الگ کیوں ہو جاؤں..... میرے پاس آپ ہی ہیں اسماعیل اور آپ کا ہونا میرے لیے بہت قیمتی احساس ہے۔“ وہ نظریں جھگائے اپنی محبت کا اعتراف کر رہی تھی۔ اسماعیل کھل کر مسکرا دیا۔ اس چھوٹے بے گھر میں ایک مدت کے بعد محبت نے کھل کر سانس لی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے دیکھتے اکرم علی اور فردوس نے اپنے رب کا شکر ادا کیا تھا۔ افضل سے کیا ہوا وعدہ وفا ہو گیا تھا زندگی خوب صورت اور مکمل تھی۔



رات ساڑھ کی وفات ہو گئی..... جنازہ اٹھنے تک وہ وہاں رہی ایک نظر آدھے ادھورے رشتوں کو دیکھا اور پھر اسماعیل کے ساتھ واپس اپنی جنت میں آ گئی۔ چراغ دل کی لوجھلانے کے لیے صرف وفا محبت اور خلوص کا تیل درکار ہوتا ہے۔ محبت میں احساس برتری نہیں ہوتی۔ محبت تو وہاں بھی ہوتی ہے جہاں کھانے کے لیے پیٹ بھرونی نہیں ہوتی۔

سارہ نے اسماعیل کا اور اس کے گھر کا بھی مذاق اڑایا تھا اور عزت کو بھی وہاں سے نکلنے کا مشورہ دیا تھا لیکن عزت وقت پر سمجھ گئی تھی کہ سکون اور محبت ہی زندگی کا حسن ہے اور اسماعیل کا ساتھ اور اس کا گھر عزت کے لیے زمین پر جنت کی طرح ہے۔ اسے ہر حال میں اپنے شوہر کا فرماں بردار رہنا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس نے اسماعیل کا ہاتھ تھاما..... ایک بازو میں حارث کو اٹھائے دوسرے بازو کو عزت کے شانے پر پھیلانے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے اسے اپنے ہونے اور تحفظ کا احساس دلا گیا تھا۔

عزت کی زندگی واقعی مکمل اور بہت خوب صورت تھی۔



نصفے حارث کو تائی امی کی گود میں دے کر وہ کھانا پکانے کی تیاری کر رہی تھی جب دروازہ بجا..... سامنے عاتکہ کا ڈرائیور کھڑا تھا۔

”وہ جی..... سارہ بی بی بہت بیمار ہیں ہسپتال میں داخل ہیں آپ کو یاد کر رہی ہیں“ آپ چلیں جی میں آپ کو لیتے آیا ہوں۔“

”آپ جاپیئے..... میں ان سے ملنے آ جاؤں گی“ میرے شوہر گھر پر نہیں ہیں اور ان کی اجازت کے بغیر میں نہیں جاسکتی۔“ وہ اثبات میں سر ہلاتا چلا گیا۔ شام اسماعیل کے ساتھ گود میں حارث کو اٹھائے جب وہ سارہ سے ملنے آئی۔ اسود کے ساتھ ایک لڑکی کھڑی تھی جس کا حلیہ بتاتا رہا تھا کہ وہ بیرون ملک سے آئی ہے، باتوں باتوں میں پتا چلا کہ عاتکہ کو طلاق ہو گئی..... اس کے سر کی وفات کے بعد وہ ہیب سب وائٹڈ اپ کر کے واپس چلا گیا سارہ کے جیسے کی جائیداد اسود اور عاتکہ نے اپنے نام ٹرانسفر کروالی تھی۔

”ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا عزت، مجھے تکبر کی سزا بہت بری ملی، تمہارے باپ کا اس کے گھر کا اس کے پیسے کا مذاق اڑایا میں نے اس کی محبت کا مذاق اڑایا ہو سکے

# لاج

رفاقت جاوید

ہم جہاں ہیں وہاں ان دنوں عشق کا سلسلہ مختلف ہے  
کاروبار جنوں عام تو ہے مگر اک ذرا مختلف ہے  
سب کے سب اپنے کاندھوں سے غیروں کا سر جوڑنے میں لگے ہیں  
ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہاں کا خدا مختلف ہے

”اف کتنی مشکل سے ڈھونڈتی ہوئی تمہارے گھر تک پہنچی  
ہوں۔“ طیبہ اس کو دیکھتے ہوئی بولی۔ ”میری اچانک آمد پر میرا  
میکہ اور سرسالی والے بہت پریشان ہوئے کہ کہیں میاں بیوی  
کے رشتے میں گر پڑو تو نہیں ہوگئی۔“ وہ اس سے گلے ملتے ہوئے  
بولی۔

”تم نے یہ باتی شکل کس کے دکھ میں بنا رکھی ہے؟“ زونا  
خاموشی سے اپنے ہاتھ ایک دوسرے سے بھی کی طرح رگڑتے  
ہوئے بولی۔

”یار..... بیٹھ تو جاؤ مدت ہی ہوگئی تم سے بچھڑے  
ہوئے۔ دیکھو کہ میری محبت اور لگاؤ کا مشکل وقت میں تم ہی  
یاد آئی اور تم نے اس کی لاج رکھ لی۔“

”زونی بیگم..... میں نے تم پر احسان نہیں کیا۔ اسنے طویل  
عرصے بعد تم نے مجھے یاد فرمایا تو میں کیسے نہ آئی۔ یہ بتاؤ سنا تھا  
کہ تم نے پسندو پہاڑ کی شادی کر لی ہے۔ ردوئی چلی گئی تھی۔  
مجھے بے حد سلی تھی کہ غالباً تمہاری ازدواجی زندگی خوشگوار ہوگئی  
کیا وہ سب غلط تھا جو سن کر میں مطمئن و خوش رہی اس دن  
ڈاکٹر علاقے میں یہ گھر اور تمہاری یہ حالت میری سوچ سے  
برعکس ہے۔ مجھے یہ نہ ہو کہ تو ملو۔ ذرا میں بھی دیکھوں  
کہ جو فائز پر فوقیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔“ وہ  
طنز پر لہجے میں بولی۔

وقت سرد سحر کا تھا۔ موسم بہار گزر جانے کے بعد مئی کے  
مہینے میں اس حسین و دلنشین شہر میں گرمی نے ہلکی سی دستک دی  
تھی۔ موٹیے کی باڑ پرستاروں کی مانند تھیں کھلیاں ہرے  
بھرے پتوں سے سر نکال کر ہلکی سی خوشبو پھیلائے اور دل  
لبھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ رات کی رانی کی کھلیاں رات بھر  
بھین بھین مہک بکھیرنے کے بعد اب سونے کی تیاری میں  
تھیں۔ اللہ کی شان کہ کتنی ہی قسم کے پھولوں کے لیے شب بھر  
جاگنا اور دن بھر سونے کا اہتمام کیا تھا۔ جنوری کی کہرا لودھینہ  
میں سویٹ پیز کے رنگ برنگے پھول اس موسم کی اہمیت کا  
احساس دلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ سفید اودھے  
آسمانی گلابی اور جانی رنگ جب جو بن براتے ہیں تو اس  
اور ماپوس دل بھی مسکرا اٹھتے ہیں اور رب کی تخلیقات پر غور و خوض  
کرنا تشکر کے زمرے میں آ جاتا ہے۔

گرمی کی شدت میں جو بنی دھوپ نے شدت پکڑی  
موٹیے کی کلیوں نے دھیرے دھیرے شرمیلی سی مسکراہٹ  
بکھیری اور پھر اس پر جون آ گیا۔ زونا سر جھکا کے منہ لٹکائے  
گہری سوچوں میں غرق اپنی جنت میں کبھی باغیچے میں تو کبھی  
گھر کے اندرونی حصے میں گھوم رہی تھی۔ بلا آخر ماپوس ہو کر وہ  
پلٹ گئی۔ جو بنی کمرے کا دروازہ کھولا تو چونک کر رہ گئی۔ طیبہ کو  
دیکھ کر وہ حیران ہوئی اور اگلے ہی لمحے عرش سے فرش پر اتر آئی۔

اندیشی تو میری سمجھ سے ہی بالا تر ہے۔ تم نے کوئی ملحد ضرور کیا ہے جو یہاں چوہے کی طرح چھپی بیٹھی ہو۔ اپنے شوہر کے دیدار تو کرا دو یا ذرا میں بھی تو دیکوں۔“ طیبہ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

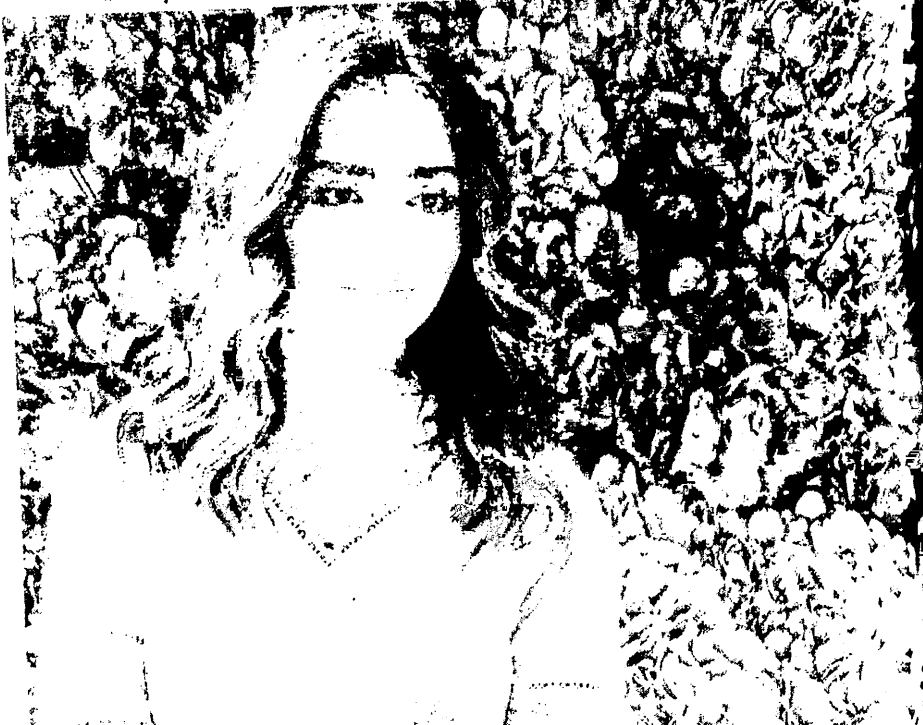
”طیبہ یہ ہے..... دل سے نکل کر ہاتھوں میں آ گیا ہے۔“ زونا نے طلاق نامداس کے سامنے رکھ دیا۔

”اب سمجھی کہ معاملہ کیا ہے؟ ارے میں تو اس زونی سے ملنے آئی تھی جو مسکراہٹوں کی شہزادی اور شرارتوں کی ملکہ تھی۔ تم وہ تو نہیں ہو۔ اس لیے میں چلتی ہوں۔“ طیبہ نے بے اختیارانہ انداز میں کہا۔

”جو تم بھی مجھے چھوڑ دو۔ دنیا نام ہی اسی کا ہے۔ تمہارا قصور نہیں، میں بھی اسی دنیا کی باکسی ہوں۔ جہاں گرے ہوئے کو سینے سے لگانے کے بجائے اسے چل دیا جاتا ہے۔ تم بھی مجھے پاؤں تلے روندھ کر گزر جاؤ طیبہ۔ مجھے حیرت نہیں ہوگی۔ اب تم سمجھ گئی ہوگی کہ میں نے اپنی تمام ولیگیں تمام رشتہ داروں سے منہ کیوں موڑ لیا؟ کیونکہ سب خود غرض اور مطلبی ہیں سر پر ہمدردانہ ہاتھ پھیر کر تمام دکھ اگلوا لیتے ہیں اور پھر بلیٹ مرد بیٹنا تو

”وہ اب تمہیں خوابوں میں ملے گا یا اگلی دنیا میں۔ کیونکہ محبت کا نشہ اترتے ہی اسے ایک سال کے اندر ہی اپنی ضرورت اور میری کم مائیگی کا احساس ہونے لگا تو اس نے مختلف بہانے بنائے پھر اس نے مجھ میں نفوس نکالنے شروع کیے بچے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ جو سراسر مجھے چھوڑنے کا ایک رستہ تھا۔ میں اس کو جائز خواہش سمجھتی رہی اور وہ مجھے با مجھ عورت کہہ کر پکارنے لگا۔ ایک عورت کے لیے اس سے بڑی گالی اور بیاہو سکتی ہے۔ جبکہ میں ان حالات میں بچہ نہیں چاہتی تھی۔ ذہنی طور پر اب سیٹ رہنے لگی تھی۔ ہر قسمی سے پاگل کے لقب نے گھر کو جنگ کا کھڑا بنا دیا تھا۔ جو پیسہ میں اپنے ساتھ لائی تھی وہ بھی اس نے ہتھ لیا تھا۔ وہ کسی صورت میں نوکری کرنا ہی نہیں چاہتا تھا؟ تمام رات اپنے دوستوں میں اور دن سوکر گزارنے وہ عیاشی کا نام دینے والا مرد نکلا۔ میں نے ہی اسے بچانے میں غلطی کی۔“ وہ روہا سی ہوئی۔

”زونی ابھی تو اسے گھر موجود ہونا چاہیے پھر کہاں ہے وہ؟ جسے تم نے پسند کیا تھا۔ تمہارے والدین کیسے آمادہ ہوئے ہوں گے۔ بہت حیران ہوں تمہاری عقل پر اور انکل کی ناعاقبت





در کنار جہاں بھر میں ڈھنڈورا پٹولیا اور جی بھر کر رسواؤ ذلیل کیا، یہی ان کی جلالت ہے شکر ہے کہ مجھے اس حقیقت کا ادراک تو ہوا۔ طیبہ تم ہی دفع ہو جاؤ میں ہی غلطی کر رہی جو خوش فہمی کا شکار رہی کہ تم میری مدد کرو گی کہ تم میری دوست نہیں بہن ہو۔ اگر بہن تمہارے جیسی ہوتی ہے تو میں تمہاری بھلی..... تمہیں تکلیف دینے کی معذرت خواہ ہوں۔ وہ پلٹیں چھپکا کر بولتی رہی۔

”مجھے تمہارا آنا کچھ اچھا نہیں لگا طیبہ مجھے تمہا چھوڑ دو یا۔ تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتی آخر میری نادانی کی سزا مجھے ہی بھگتنی ہے ناں۔ مجھے ہر حال میں اس دنیا میں سروائیو تو کرنا ہے۔ خواہ وہ دوسروں کے سہارے کیونکر ڈھونڈتی رہوں اور پھر تم پر اس قدر مان کہ تم میری حالت زار دیکھ کر ہی تڑپ جاؤ گی۔ تم تو طنز کے نشتر چلانے لگی ہو تم نے تو یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ میں اس نقطہ پر بند کیسے ہوئی۔ تم سے اس ملاقات کے بعد اب میں دنیا کو اب کسی نظر سے دیکھوں گی جس کے یہ قابل ہے۔ میں نے اپنی خوب جگہ ہنسائی کرائی اب تو دل چھلانی ہو گیا ہے۔ اس کا مداوا کرنا پڑے گا وقت کے ساتھ وہ بھی ہو جائے گا طیبہ لیو می آ لون پلزی۔ تاکہ میں اس مفقوت کے ماحول سے باہر نکلنے کا سوچ سکوں۔ یاد رکھو کہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ یہ وقت بھی بہت جلد گئے گا۔“

”کیسی عجیب باتیں کر رہی ہو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں زونی، مجھے تمہارے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ کیونکہ میری یہاں کسی سے ابھی تک ملاقات ہی نہیں ہوئی یا۔ سب میری طرح اپنے اپنے جھمبیلوں میں اٹھے ہوئے ہیں اگر تم مجھ سے رابطہ نہ کرتی تو تم سے ملاقات ہی نہ ممکن ہوتی۔ تم نے مجھے یہاں بلا کر بہت اچھا کیا۔“ وہ اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

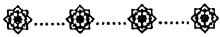
”کاش میں تمہیں نہ بلاتی۔ کسی کی نظر میں تو باعزت رہتی۔“ وہ سر جھکائے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

”تم یہاں سے چلی جاؤ طیبہ تمہارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں۔ میں نے جو گناہ کبیرہ کیا ہے تم اس کے سائے سے بھی دور رہو۔“ وہ سسکیاں لیتے ہوئے مشکل بولی۔

”پگلی کہیں کی۔ ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا ہے تم سے۔ لو میرج گناہ ہرگز نہیں۔ رب نے پسند کی شادی کا حق ہمیں سونپ رکھا ہے۔“ وہ اسے گلے لگا کر بولی۔

”ہم ہی والدین کے اصولوں پر چلتے رہے۔ تم نے جو بھی کیا بہت خوب کیا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے آج کل ہر لڑکی اور لڑکے کی شادی ان کی پسند کو مدنظر رکھ کر کی جا رہی ہے۔ میں نے بھی ماما کو اپنی پسند بتائی تھی، گھر میں قیامت ہی کھڑی ہو گئی تھی۔ تو پھر میں کیا کرتی؟ عبادت سے شادی کرنا میری مجبوری تھی۔“ یہ کہہ کر وہ ماضی کے ان لمحوں میں کھو گئی جو اس کے اپنے تھے۔ طیبہ نے اسے کریدنا چاہا لیکن اسے پرسکون اور فسون میں دیکھ کر بچپن میں چلی گئی اور اچانک بناتے ہوئے زونی کی حالت پر غور کرنے لگی تھی۔



”یہ جو ایک خاندان ہوتا ہے ناں ایک دوسرے کی بہت اعلیٰ مثال ہے۔ ایک ہی شہر میں ایک دوسرے سے بڑا اور ایک دوسرے میں گمن دوست خاصی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ جن کے تمام غم دکھ اور درد مشترک ہوتے ہیں۔ ناقابل تلافی گھٹائے اور خسارے کے باوجود ان کے حوصلے بلند رہتے ہیں۔ چروں کی بشارت بحال رہتی ہے اور طمانیت کے احساس میں ہلکورے لیتے ہوئے ان کے درد غم دور کہیں جا چھپتے ہیں۔“

زونی نے چائے کا سپ لے کر حسرت واپس سے بھر پور لہجے میں کہا۔ اس کا قلب وزہن پھر سے تنہائی، کم مائیگی اور ناامیدی میں جکڑنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرنے والی لکیریں اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کرنے لگیں تو طیبہ نے اس کے قریب ہو کر آہستگی سے پوچھا۔

”زونی..... میں تمہارے ماضی کے کسی لمحے کو نہیں جانتی۔ بے خبر ہوں، اس بے خبر لڑائی ہوئی کانوں کو چھو گئی کہ تم نے فارس کے بچانے کسی اور لڑکے سے شادی کی ہے تم ہی مجھے بتا دو۔ تاکہ مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے۔ تم سے ایسا کون سا گناہ سرزد ہوا ہے کہ جس کی خلش نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔ میں کسی دوست سے تمام کہانی معلوم کر سکتی ہوں لیکن اس میں آدھے جھوٹ اور آدھے سچ کی آمیزش ہوگی، میری پیاری دوست مجھے سب کچھ بتا کر اپنا دل ہلکا کر دو تاکہ ہم دونوں پیچھے مڑ کر دیکھنے اور پچھتاؤں کے بجائے آگے قدم بڑھا سکیں۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ دو ذہن تو کمال کی قوت رکھتے ہیں۔ اس کی شرط یہی ہے کہ قلب وزہن کو ہر قسم کے کرب اور درد و خوف سے پاک صاف کر دو ورنہ اس گندے غلیظ گھر میں گل سر کر مر جاؤ گی۔ کسی کا کچھ نہیں

گزرے گا۔“ وہ دیکھی لہجے میں بولی۔

وقت ہوں اور ایک زندہ لاش مجھ سے مل کر کیا کرو گی لاش کو کب تک سمجھاؤ گی۔“ وہ مری مری آواز میں بولی۔

”اسی کوڈرپریشن کہتے ہیں زونی۔ خبردار جو تم نے کم ہمتی کی بات کی۔ سب سے پہلے تمہیں سائیکالٹرسٹ کے پاس لے کر جاؤں گی۔“ طیبہ نے اس کا ہاتھ اپنی زور سے دبایا جیسے اپنی ہمت وقت اس میں منتقل کر رہی ہو۔

”میں ٹھیک ہوں طیبہ، مجھے کہیں نہیں جانا۔“ زونی نے اپنے خوب صورت ماضی کی بھیاں تک کہانی اسے سنانے کے لیے انداز میں خود اعتمادی کو شامل کرنے کی کوشش کی اور دل میں سرگوشی کرنے لگی۔

”بد نصیب و نامراد تمہیں کیا بتائے اور کیا بھول جائے۔“  
 ”بولو زونی..... کہاں گئی تمہاری خود اعتمادی؟ بے باکی اور ہوشیاری؟ تم تو ایک عام عورت کی طرح ڈھسے گئی، تم ایک عام عورت نہیں ہو سکتیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نے اپنی آشفتمند ہمت کو بحال نہ کیا تو تمہیں ان گلیوں کی دھول سننے میں چند لمحے ہی لگیں گے۔ آج کل طلاق بہت عام ہو گئی ہے کیونکہ آج کی عورت عام نہیں رہی۔ خاص مقام پر کھڑی ہے جو اپنے حقوق کی شناسائی رکھتی ہے۔ میری جان تم خود کو پہچانو اور اپنی ذات کے اس خول سے باہر نکل کر دیکھو کہ تم کس خاندان سے ہو اور تم خود کیا ہو؟ پڑھی لکھی، باشعور اور نشیب و فراز سے گزر کر بھی میں لندن بن کر آج میرے سامنے کھڑی ہو۔ یہ ہو تم۔ جو ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کر سکتی ہے۔“ وہ اس کے حوصلے و ہمت کو بڑھانے کی غرض سے مستحکم لہجے میں بولی۔

”ہاں مگر کیسے؟“ وہ ملامت سے بولی۔  
 ”اس سے پہلے کہ تمہیں اس گھر کو چھوڑنے کا حکم نامہ موصول ہو اور والدین کے گھر چلی جاؤ، کیا تم نے انہیں اپنے حالات سے آگاہ کر دیا؟“ اس نے کریدنے کے انداز میں پوچھا۔

”نہیں۔ جرات نہیں ہوئی کیونکہ میں نے انہیں بہت ذلیل و رسوا کیا تھا۔ عباد کو ان پر فوقیت دینے کا انجام خوش آئند ہونا ناممکن تھا کیونکہ میں نے اپنے والدین کے آئینوں پر اپنا عمل تعمیر کرنا چاہا تھا جس کی بنیاد ہی چلتے اچلتے پانیوں پر رکھی جائے تو وہاں کامیابی لا حاصل ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا ہی سانحہ ہوا ہے طیبہ تمہیں کیا بتاؤں؟“  
 ”زونی..... کیسا سانحہ؟“

”طیبہ..... میری بھی یہی تجزیہ ہے اپنے بارے میں۔ یہ گھر بھی مجھ سے چھن جائے گا کیونکہ کرائے پر حاصل کی گئی قیام گاہ پر نہ عورت کا حق ہوتا ہے نہ ہی مرد کا۔ میں نے ذاتی گھر کے بارے میں بھی سوچا ہی نہیں تھا۔ ہم بہت پیار سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ چھ مہینے کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ پھر چند دن جو آزمائش کے تھے چھ مہینوں پر بھاری ثابت ہوئے اور آج میں تنہا ہوئی۔ اسے مجھ پر رحم و رحمت ہی نہ آیا کہ اس کی خاطر میں نے اپنی حسین دنیا تیاگ دی تھی۔ تم تو مجھ سے بہتر نکلی۔ تم نے پڑھائی کو فوقیت دینے کے بجائے ماں باپ کے فیصلے کو معتبر سمجھا اور آج دو بچوں کی ماں ہو اور ایک شخص و مرنی شوہر کی وفادار بیوی..... کاش میں بھی ایسا ہی کرتی۔ فارس کے بندھے ہاتھ دیکھ کر اسے اپنا لیتی۔ اب تو مجھے اس کی قدر و قیمت کا احساس ہو رہا ہے لیکن میرے ہاتھوں سے وقت کے وہ نجات نکل گئے جن پر میرا اختیار تھا۔ آج کے لمحات تو میرا ساتھ دینے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ جان لیوا لمحات میری زندگی کے اندھیروں اور آہوں میں ہمیشہ کے لیے بس چلے ہیں طیبہ..... اب تو اس گھناؤبہ تاریکی میں میں کیسے کھوئی ہوں۔ جہاں امید کی کوئی کرن پھوٹی نظر نہیں آتی، کوئی راہ بھائی نہیں دیتی۔“ وہ انفرادی سے بولی تو طیبہ پر شرمگاہ سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”زونی..... حوصلہ رکھو۔ اب پچھتانے سے تو مسئلہ حل ہونے سے رہا۔ کاش تم نے تعلیم کو کبھی کھیل نہ سمجھا ہوتا۔ عورت آج کے لیے خود کو تیار کرتی ہے میری مانو تو طلاق کو اختتامیریس مت لو کہڈپریشن کی انتہا ہو جائے۔“  
 ”مجھے اور کچھ نہیں سنا طیبہ۔“ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بے بسی سے بولی۔

”چھوڑو فلسفیانہ باتیں۔“  
 ”اوکے کچھ نہیں کہوں گی یہ تو سچ ہے کہ فلسفے مسائل حل نہیں کرتے بلکہ مسائل کو الجھا دیتے ہیں۔“ طیبہ نے کہا۔  
 ”جب اپنے پیاروں کو اس حالت میں دیکھنا پڑتا ہے تو پھر دیکھتو کون کے شوہر سے کھول دیتے ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ سے اپنی لاچارگی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ محبت اور اپنائیت ہی تو ہوتی ہے۔ برا مت مٹاؤ۔“  
 ”طیبہ..... مجھے جینے کا کوئی حق نہیں رہا میں ایک گزرا ہوا

”میں فرار ہو کر سیدیہ کورٹ چلی گئی اور فوراً نکاح کر لیا۔  
 اف میرے والدین پر کیا گزری ہوگی؟ اس وقت محبت کے  
 نشے میں اس کا اندازہ ہی نہ ہو پایا تھا۔ اب سوچتی ہوں کہ میں  
 نے ان پر بہت بڑا ظلم کر دیا تھا جس کی پاداش میں آج اس  
 حال کو پہنچی ہوں۔“ وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ نہ پرس میں ایک  
 ٹمک رہا نہ دماغ میں سوچنے کی صلاحیت رہی۔ عباد کیا چھوٹا  
 زندگی ہی رو گھٹئی۔

”زونی..... عباد تمہاری زندگی میں کیسے آیا؟ تمہاری شادی  
 تو خالہ کے بیٹے فاراس سے ہو رہی تھی۔ میں نے تو یہی سنا تھا  
 پھر لو میری ج کی خبریں میرے کانوں تک پہنچیں تو میں نے اس  
 سے آگے جانے کی کوشش ہی نہیں کی کہ تم اپنی محبت سے  
 خریدے ہوئے شوہر کے ساتھ خوش ہو تو میں بھی مطمئن ہو گئی  
 پر یہ فرار ہونا اور کورٹ میرج کرنے کی اجازت ہمارا معاشرہ بھی  
 نہیں دیتا، کیا تمہاری عقل گھاس چرے نہ چلی گئی تھی۔ بہت  
 افسوس ہوا یہ سن کہ خیر اب اس کا حل سوچنے کی ضرورت ہے۔  
 تمہیں تنبیہ کرنے کا کیا فائدہ؟ وقت تو تمہاری ہاتھ سے نکل  
 گیا۔ اس وقت تمہیں اپنی خاندانی روایات اور نظام کے مابین  
 فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے۔“ طیبہ نے آہ بھر کر اس کی سوگوار  
 شکل کی طرف دیکھا۔

”لیکن بچی یہ محبت وہ بہت کوئی شے نہیں ہوتی۔ سورج کی  
 مانند دھاتی چلی جاتی ہے اور جب تک نہیں ہونے دیتی اور جب خبر  
 ہوتی ہے تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس دکھ و کرب  
 سے نکل آؤ یا تمہاری یہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی۔ کیا  
 اب بھی اسی کی پوجا کر رہی ہو جو اس قدر سوگوار اور پچھتاؤں کی  
 دنیا کی باقی، مٹی کی ہو۔“

”مجھ سے ایسے عجیب سوالات مت پوچھو۔ میرے پاس  
 جوابات ہوتے تو یہ شادی ہرگز نہ کرتی۔ اگر کر رہی لی تھی تو چند  
 دنوں بعد ہی والدین کو ممانعتی۔ میں نے تو ایک سال گزاریا اور  
 ان کی مٹی بھی محسوس نہ کی کیونکہ مجھے عباد پر ہوسرا، اعتماد اور یقین  
 تھا۔ حالانکہ وہ شراب پیتا تھا اور مجھے بھی کہتا تھا لیکن میں نے  
 اپنی ماں کی تربیت کا پاس رکھتے ہوئے ہمیشہ انکار کیا بلکہ عباد  
 سے جھگڑ بڑی تھی حالانکہ اس کی شخصیت سے میں اس قدر متاثر  
 تھی کہ مجھے بعض اوقات شراب میں جاذبیت محسوس ہونے لگتی  
 لیکن اب شکر کرتی ہوں کہ میں اس علت سے دور رہی۔  
 ہمارے خاندان کے اصول بہت اعلیٰ ہیں۔ طیبہ جس گھر میں

میرے بابا صبح اٹھتے ہی اپنی ماں کے پاؤں چھوئے کو عبادت کا  
 نام دیا کرتے تھے اور اپنے بابا کا دیدار کر کے ان کی دعاؤں سے  
 جھولی بھرا کرتے تھے۔ اسی گھر میں مجھ جیسا شیطان بھی مقیم تھا  
 جس کی بدبو سے گھر کا ماحول اثر انداز ہونے لگا تھا۔ عباد متوسط  
 گھر آنے کا پروردہ تھا لیکن اس کی شخصیت بے مثال تھی۔ بابا کو  
 اپنی فیکٹری کے لیے منیجر کی ضرورت تھی، میں نے ہی اس کا  
 انٹرویو لیا اور فوراً اسے پاس کر دیا۔ بابا نے بھی اعتراض نہ کیا  
 کیونکہ عباد جادوئی زبان اور ہر لفظ با معنی بولتے ہوئے بے پناہ  
 خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ بابا جانی کو ایسے ہی منیجر کی  
 ضرورت تھی۔“ وہ الٹ الٹ کر بولتی رہی۔

”افسوس زونی کہ تم نے تو خود پر ہی نہیں دوسروں پر بھی ظلم  
 ڈھایا ہے۔ اف اپنے ہی ملازم کے ساتھ بھاگ گئی، حیف  
 ہے، تعلیم اور بے جا آزادی نے تمہیں یہ سبق سکھایا کہ والدین  
 کی عزت سے کھیل کر خود کو بھی بے وقعت کر دو کیا عورت اس  
 آزادی کی بات کرتی ہے؟ مرد سے برابری کرنے میں بھی یہی  
 آزادی سامنے آتی ہے۔ تمہیں اب کیا سمجھاؤں کہ عورت کی  
 عزت بہت نازک ہوتی ہے۔ مرد اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے  
 منہ لگایا جائے، تم نے تو قانون کی تمام حدیں عبور کر دیں۔ کم از کم  
 کم اس فقیر کو اپنا نہ سے پہلے والدین کو توڑی کر لیا ہوتا۔“

”ہاں طیبہ..... تم سچ کہتی ہو۔ اب میں بھی ہوں کہ مجھ  
 جیسی معصوم لڑکی کو محبت کے جال میں پھنسانا قطعاً مشکل  
 نہیں۔ دو بول محبت کے زندگی کو با آسانی داغ دار کر سکتے  
 ہیں۔“ وہ کسی گہرے کونئیں سے بول رہی تھی۔ طیبہ کچھ توقف  
 کے بعد بولی۔

”اف تم نے اپنی زندگی کو احقانہ پن کی وجہ سے معیوب بنا  
 لیا۔ تمہیں اس پر فریفتہ ہونے کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ تمہارے  
 لیول سے بے حد نیچے تھا۔ اب تو جو بھی ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ بولو  
 کہ اب کیا کیا جائے عباد سے میں رابطہ کروں کیا؟ مجھے محسوس  
 ہو رہا ہے کہ اس کی دعا بازی کے باوجود وہ آج بھی تمہارے دل  
 میں سرایت کر رہا ہے زونی، تم تو سدا کی نادان اور دوسروں پر  
 عمل اعتماد کرنے والی لڑکی ہو لیکن میں تمہیں اس قدر راق اور  
 بے وقوف نہیں سمجھتی تھی کہ تم محل سے نکل کر اس چھوٹے سے گھر  
 کا انتخاب کرو گی۔“ زونی کی آنکھوں سے پھر آنسو رواں  
 ہو گئے۔ اس نے طیبہ کو تمام راز دارانہ باتیں بتانا شروع  
 کر دیں۔

ہونے پر بھاری مہر ثبت کرنا کیا کمال کا کام ہے۔ ہم اس مزے کو اوداغ کیونکر کہیں۔ میری جان تم بے فکر رہو۔ بس یوں سمجھو کہ ہم نے اس دن نکاح نامے پر دستخط کر دیئے تھے جب آدم اور حوا سے غلطی ہوئی تھی۔“

”میں نے اس کی بات سن کر خاموشی اختیار کر لی تھی کیونکہ اس کی باتیں مجھے بہت مقدم لگا کرتی تھیں۔ اب سوچتی ہوں کہ میں خود کو کیسے معاف کر سکتی ہوں؟ جس نے والدین کے اعتماد و بھروسے کے پرچے اڑا دیئے جبکہ مجھ پر مکمل بھروسہ اور اعتماد کرتے ہوئے انہوں نے مجھے بے شمار حقوق سونپ رکھے تھے۔ میں ان کا ناجائز استعمال کر کے گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں خسارے اور گھٹائے کے سودے میں تنہائی کی جانب قدم اٹھاتی رہی اور پھر کھائی میں جا گری۔ اب اس کی تلافی کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اپنی زندگی کو ایسے بے دوا اور دھوکے باز پر قربان کرنے کے بجائے ہوش میں کیسے آ جاؤں۔“ وہ آ زردگی اور اسروگی سے بولی۔

”زونی..... وقت بہت بڑا سیچا ہے اور اس مہم کا ہر وقت استعمال ہر غلطی اور گناہ کی تلافی کر دیتا ہے۔ ہمت پکڑو یا رہ۔ تعلیم یافتہ ہو کوئی نوکری کرو اور اپنی نئی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرو۔ فارس ابھی بھی تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔“ وہ مخلصانہ لہجے میں بولی۔

”بہت ہی سلجھا ہوا لڑکا تھا“ تم نے اسے دھتکار کر ایک انجان فریبی بھوکے کو اپنے لیے کیسے منتخب کر لیا۔ اب کھڑی ہو جاؤ۔“

”طیبہ مجھ میں ہمت ہی نہیں رہی کہ زندگی کی گاڑی چلا سکوں گی؟ اس نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچانی اور میرے جذبات سے ایسے کھیلتا رہا جیسے ایک بچہ اپنے نئے اور قیمتی کھلونے سے ہر وقت کھیلنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ طیبہ اس نے مجھے اس بھری دنیا میں تنہا کر دیا۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی، کیا کروں؟ تم بتاؤ کہ میرا قصور کیا تھا کہ مجھے نادانی اور معصومیت کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی؟ یہ تو میرے تصور کے آس پاس بھی نہ تھا۔ آخر رو دھو کر میری منت سماجت کے بعد عباد مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے ماما سے بات کی تو انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ پاپا نے مجھے قتل کر دیئے کی دھمکی

”طیبہ امیر باپ کی اکلوتی اولاد تو اس معاشرے کا ناسور ہے جس کی زندہ مثال میں ہوں۔ عباد نے شاطرانہ طریقہ سے مجھے اپنے اعتماد میں لیا تھا۔ مجھے تو خبر ہی نہ ہوئی کہ میں کس جانب بہتی جا رہی ہوں۔ معاملہ یہاں سے گزربڑ ہونے لگا تھا۔ جب میں شاپنگ کے لیے اس کے ساتھ جانے لگی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے مجھ میں گہرا اخلا تھا۔ جس کو عباد نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ اپنی موجودگی سے اس خلا کو کم کرنے لگا تھا۔ وہ مجھ پر جان پھڑکتا اور بھی میری کسی خواہش کی نفی نہیں کرتا تھا۔ شاپنگ کے بعد ہم نے ہرنے ریسٹورنٹ میں کھانا شروع کر دیا۔ جو مزاج مجھے اس کی قربت میں آتا تھا۔ وہ سہیلیوں کی قربت میں کہاں؟ پھر ہم نے فلمیں دیکھنی شروع کر دیں، سنیما ہال کے بعد اس نے اپنے اس کرائے کے گھر میں میری ہی رُم سے پلازما خرید کر رکھ دیا تھا۔ وہ جونہی آفس سے چھٹی کرتا تو میں بھی اسی کے ساتھ چل پڑتی تھی اور پھر اس کے گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا اور اس کے ہاتھ کی تیار شدہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے فلم سے محظوظ ہونے لگی۔ عباد کی کسی حرکت اور گفتگو میں شیطانیت کی ہلکی سی جھلک بھی ہوتی تو میں اس سے دور ہو جاتی۔ مجھے اس کی رفاقت میں ہلکا سا بھی خوف اندیشہ اور وہم کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ میں تو اس کے ساتھ خود کو محفوظ سمجھا کرتی تھی۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور ماما، بابا سے پردہ داری ہونے لگی جب جھوٹ کی دنیا آباد ہوئی تو ایک مخصوص شام عباد نے فلم چلائی اور خود چائے کے لوازمات لینے باہر نکل گیا۔ فلم کیا تھی؟ شیطانیت کی انتہا تھی۔ حالانکہ میں اسے بند کرنا چاہ رہی تھی لیکن شمس و اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ میں بے بکا نہ مناظر دیکھتے ہوئے اپنی ذات کے خول سے باہر نکل آئی، آنسوؤں کے پھڑکی اپنی ذات کے گنبد میں واپس نہ جا سکی مجھے اپنا مکمل نما گھر جہنم لگنے لگا اور یہ ایک کمرے کا گھر میری کل کائنات بن گیا جہاں مجھ پر محبتیں پھجوا د کرنے والا عباد تھا۔ میرے لیے عباد ایک معمولی انسان نہیں تھا۔ وہ میرا سیچا اور مربی ہونے کے ساتھ اب میرے گناہ کا شریک بھی تھا اور میری محبت میں وہ خاص الخاص بن گیا تھا۔ ایک دن میں نے اسے شادی کرنے کا مشورہ دیا تو وہ ایک دم چوڑکا۔“

”پگل شادی تو محبت کی فینچی ہے۔ ہم دونوں پہ غلطی ہرگز نہیں کریں گے۔ ہماری محبت ابدی اور بے مثال ہونی چاہیے۔ یہ جو چوری چھپے ملنا اور زندگی کے چند لمحوں سے لطف اندوز

تھی اور وہ اس میں کامیاب ہو گیا۔ وہ تو اسی خوش فہمی میں مارا گیا کہ مجھ سے نکاح کے بعد تمام حالات سدھر جائیں گے اور اسے گھر داماد بننے کا شرف حاصل ہو جائے گا۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ اکلوتی بیٹی کو والدین ایسے بھول جائیں گے جیسے وہ ان کی آغوش میں کبھی کبھی ہی نہ تھی۔“ اب زونی چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔

”اسے مجھ سے نہیں دولت سے پیار تھا۔ میں اس کی اداکاری سے مار کھا گئی۔ یہ بات تو مجھے اب سمجھ میں آئی ہے ورنہ وہ ایسی عورت کا غلام ہرگز نہ بنتا۔ میرے پاس واپس آنا اب میں کیا کروں؟ مجھ سے زندہ رہنے کا حق اس نے چھین لیا ہے طیبہ۔“

”زونی..... تمہارا ایک ہی علاج میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ تم اپنے گھر واپس چلی جاؤ۔ میری بات مان لو ورنہ تمہاری جلیسی بکھری اُٹھتی اور تمہا عورت کو روندنے دن رات نوچتے رہیں گے۔ اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو، پکے ماں باپ کے سامنے جاتے ہی تمہارا خوف، ندامت اور انادافن ہو جائے گی، تم ہمت پکڑو۔ وہ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر معاف کر دیں گے آخراں کی اولاد، بونم، بچے غلطیاں کریں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انہیں دنیا کے میں تنہا چھوڑ کر تماشائی بن جائیں۔“

”ان کی نفرت، نفارت کا سامنا کیسے کروں گی طیبہ؟“ وہ سرکوفی میں ہلانے لگی۔ ”وہ مجھے معاف نہیں کریں گے۔“

”ویسے تم نے معمولی سے مسئلے کا بے فکر بنا لیا ہے۔ ویری بیڈ۔ تم ناز و غم میں ملنے والی محسوس ہو رہی اور وہ نالی کا کیڑا تمہیں کاٹ کر راستہ بدل گیا، ویسے زبردستی کا تعلق اب میں تمہیں جو بھی مشورہ دوں گی تمہیں ماننا پڑے گا۔ کاش اس بلند زکا مجھے پہلے علم ہو جاتا۔“

”بالکل درست کہہ رہی ہو اگر تم یہاں ہوتی تو یہ سانحہ کبھی رونما نہ ہوتا۔ تم کیا کیوں کہ میں تنہا ہو گئی اور میں تمہارا بدل ڈھونڈنے لگی تھی۔ میں اب بھی ہوں کہ ناخرم سے دور رہنا کیوں ضروری ہے؟ دوڑوں جنس جو نبی شیر و شکر ہوئے وہاں گڑبڑ ہو کر ہی رہتی ہے۔“ وہ پھر سستا سو بہانے لگی۔

”زونی میں سوچ رہی ہوں کہ یہاں تک نوبت پہنچی نہیں چاہیے تھی آ کر تمہاری طرف سے ڈھیل ہوئی تو اسے آگے بڑھنے کی جرات ہوئی تھی۔ اس معاملے میں مرد بہت ڈرپوک

دی۔ دوسری طرف عباد میرے والدین سے رشتہ مانگنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ آئینٹس کا تھا اور میں شادی کرنے پر بضد تھی۔ میں سب کچھ لٹانے کے بعد فارس کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ یہ گناہ مجھے ہر گناہ سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اسے کورٹ میرج کے لیے رضا مندر کر لیا اور ہم نے کورٹ میرج کرنے کے بعد فوراً اپنا خوب صورت پرسکون شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر گمان زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب اس کی محبت کا نشہ اترا اور ہم میں جھگڑاں کا بازار گرم رہنے لگا تو نوکری کے بہانے مجھے نسل کشی دے کر دوسری اپنے دوست کے پاس چلا گیا۔ میں اس کی نوکری کا انتظار کرتی رہی اور اس کے پاس رہنے کا اظہار کر کے ایک نابل از دواجی زندگی کی بنیاد رکھنے پر زور دیتی رہی پھر ایک دن مجھے اس کے دوست نے فون پر اطلاع دی کہ اس نے ایک انڈین ڈانس سے شادی کر لی ہے۔ اس دھماکے خیز خبر کو سن کر میں ابھی متنبہ ہی نہیں تھی کہ اس نے طلاق نامہ بھیج کر ہمیشہ کے لیے مجھ سے تعلق توڑ لیا یہ ہے میری عمر تاک کہانی۔ طیبہ میں دیکھنے میں کتنی صحت مند لگتی ہوں ناں مگر میں اندر سے بالکل کھوکھلی ہو گئی ہوں۔ جب باطن میں احساس زیاں سما یا ہو تو پھر ہمت ہی کہاں رہتی ہے؟ سب کچھ جواب دے جاتا ہے اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر گردن کو بھگونے لگے تھے۔

”زونی..... ہمت تو کرنی پڑے گی۔ اب اپنی حماقتوں کا ماتم کرنا چھوڑ دو۔ والدین کی نافرمانی کی سزا تو زمین یوس کر دیتی ہے کاش تم نے مجھ سے مشورہ ہی کر لیا ہوتا۔“ طیبہ نے نرمی سے کہا۔

”یہ تمہاری تقدیر کی لوح پر ذلالت کندہ کی گئی تھی اسے اللہ کا حکم سمجھ کر سر تسلیم خم کرو اور صابر و شاکر ہو جاؤ۔“

”میری ہمت و حوصلہ تو اس لیے بکھر گیا ہے کہ اس نے شادی کر لی ہے اب اسے میری روٹی سوکھی محبت کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے لیے میں بالکل ناکارہ ہو گئی ہوں طیبہ یہ ایسا دکھ ہے کہ تم نہیں سمجھو گی۔ یوں سمجھو کہ یہ دکھ شوہر کے مرنے سے ہزاروں لاکھوں گنا بڑھ کر ہے۔ اس نے مجھے دھوکہ دفریب دیا۔ مجھے اپنے آئینے میں اتارنے کے لیے اس نے کیسے کیسے حسین روپ اپنانے، افسوس کہ خول کے اندر چھپا ہوا عباد ہی تھا۔ اسے تو کسی آوارہ اور پیسہ کمانے والی بیوی کی طلب

واقع ہوا ہے کیونکہ وہ اپنی غیرت و مردانگی کی دجھیاں اڑتے ہوئے دیکھ ہی نہیں سکتا، کہیں تو تمہاری طرف سے پہل ہوئی ہوگی اب تمام قصور اس کے سر پر مت تھوپو یار۔ وہ فہمائش انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم نے بالکل ٹھیک کہا مجھ میں کمزوری تو تھی مجھ پر اس کی شوخ و شنگ باتیں اور شریر حرکتیں جب غلبہ پاتی تھیں تو میں کمزور پڑ جاتی تھی اور پھر اس کے ہاتھوں کٹ پٹیل بن کرنا چنے لگتی تھی۔ دراصل میری زندگی میں اس قدر تنہائی اور اکیلا پن تھا کہ میں ہر وقت رونق گہما گہمی اور قہر کی جھجکوں میں رہا کرتی تھی۔ یاد کرو کہ میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہی چلی ریتی تھی، ماما کی اپنی مصروف اور سوشل لائف تھی بابا دولت بدھانے کے چکروں میں مہینوں ملک سے غائب رہا کرتے تھے تو بولو کہ پھر میں کیا کرتی؟ تم کینیڈا چلی گئی تو میں عباد کے قریب ہوتی چلی گئی جبکہ میری نیت میں فتوہ تھا نہ ہی میرے ارادے خطرناک تھے لیکن اس کی کمپنی میں اٹھنے بیٹھنے سے مجھے اس سے پیار تو ہو گیا تھا۔ وہ بھی میری ضرورت اور معصومیت کو بھانپ چکا تھا، اس کا سلوک و رویہ ایسا تھا کہ وہ مجھے ہر رشتے سے مقدس لگنے لگا تھا۔ وہ عموماً مجھے ڈرپوک کہہ کر پیش دلا لیا کرتا تھا کہ میں نہ تو کسی سے محبت کر سکتی ہوں نہ ہی اپنے لیے چوں سا بھی ڈھونڈ سکتی ہوں، یہ سن کر میرے جذبات میں طغیانی آ جاتی اور ایک دن میں نے ڈرائیونگ کے دوران کچھ جھلے ترتیب دیئے اور میں کانوں تک سرخ ہوتے ہوئے بولی۔“

”مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے اور میں شادی بھی تم سے ہی کروں گی۔ میں قطعاً ڈرپوک نہیں ہوں، میں نے حتیٰ اور آخری فیصلہ تمہیں سنا دیا ہے اب اپنی ثابت قدمی کا ثبوت دو۔ خبردار جواب مجھے ڈرپوک کہا۔“ وہ یہ سن کر ایک دم سے چونکا گاڑی جھٹکے سے سڑک کے درمیان رک دی اور میری طرف حیران کن نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”یار ایکسیڈنٹ کرانے کی نہیں ہو رہی۔ اتنا بڑا مذاق مجھ سے مت کرو۔ کہاں تم اور کہاں میں۔ تمہارے بابا کا سامنا کیسے کر سکتا ہوں؟ ہمارے لیول میں فرق ہے۔“

”عباد تم سے محبت نہ کرتی تو وقت گزاری پر ہی اکتفا کرتی تمہاری طرف سے سب کچھ یکے بعد دیگرے ہوتا چلا گیا مگر تم نے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا۔ اسی خوش خبری کے عوض آج تم مجھے اچھی سی کافی پلا دو۔ میرے پرس سے نہیں جان

تمہاری جیب سے پینے کا مڑا تو چکھوں۔“ میں نے ادا سے کہا۔ ”اس کا مڑا اور ذائقہ ضرور مختلف ہوگا کیونکہ اس میں محبت کی چاشنی کا جو اضافہ ہوتا ہے۔ مجھے سنبھل تو جانے دو۔ اس وقت تم ڈرپوک نہیں ہونق لگ رہی ہو کیسی عجیب سی باتیں کر رہی ہو؟ دے تم نے میرے سر پر ہتھوڑا مارا ہے۔“ اس نے گاڑی کا ایکسیلیٹر دبا تے ہوئے کہا۔

”تم نے سچ کہا آج میں نے اپنی اس ہونق پن کی جو خوشی حاصل کی ہے عباد تم اس کا ذائقہ نہیں جانتے۔ مجھے اور کون سا نام دینا چاہتے ہو مجھے تمہاری زبان سے نکلا ہوا ہر نام ذہنی راحت اور دلی مسرت سے نوازے گا۔ بولو کہ میرے کتنے نام ہیں جو میری شخصیت پر جتے ہیں۔“ میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا کافی شاپ کے سامنے رک گیا۔

”مجھ گئی ہوں عباد کہ تم نے میری اس اندھی محبت کا یقین کر لیا ہے، کیا محبت یک طرفہ ہو تو پھر بھی اس میں اتنی توانائی اور شدت ہوتی ہے کہ قابل قبول ہو جاتی ہے۔“ میں سرشارانہ انداز میں بولی۔

”ہاں زونی تم نے اقرار کیا اور میں اس کے حصار میں مقید ہو گیا ہوں۔ محبت بے مشروط نہ ہو تو ریشم کے دھاگے کی مانند ہوتی ہے۔ دیکھنے میں بے حد حسین، پرکھنے میں بے حد کمزور اور نازک۔“ وہ میری طرف محبت پاش نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔

”سچ سمجھوں کہ مذاق۔“ میں قدرے بے یقینی اور حیرت سے بولی۔

”جو بھی سمجھو تمہیں اس کا اختیار ہے جیسے مجھے تمہارے اقرار پر مکمل بھروسہ و اعتماد کرنے کا اختیار ہے۔“ وہ تکلف سے بولا اور ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

”میں نے خوشی سے مغلوب ہو کر لرزتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ہمیشہ کے لیے جس کی ماما اور بابا کو دو سال تک خبر نہ ہوئی۔ شاید انہیں اپنے اس ملازم پر ہنک حلال ہونے کا بھروسہ تھا کیونکہ ان کے لیے اس کی وقعت اور حیثیت ہی زیر تھی۔ وہ ہمارے ٹکڑوں کا محتاج تھا تو اتنی جرأت کیسے کر سکتا تھا کہ ان کی بیٹی پر ہاتھ ڈال سکتا۔ تمام خرابی اور تباہی میرے جھوٹ سے شروع ہوئی اور اسی پراختتام پذیر ہو گئی۔“ وہ خلا میں دیکھ رہی تھی۔

سکتی۔ یہ خبر کسی کے کان میں پڑی تو اس معاشرے کے بھڑے اور کتے جنہوں نے مرد کا لہذا اوڑھ رکھا ہے میری کم مائیگی اور تنہائی کی بو کو محسوس کرتے ہوئے میرا چپھا کریں گے۔“ وہ خوف زدہ ہو کر زبزنے لگی۔

”زونی..... تم تعلیم یافتہ عورت ہو۔ اپنی ذمہ داری خود بھی اٹھا سکتی ہو۔ میں حیران اور پریشان ہوں کہ تم اس قدر کم ہمت تو کبھی نہیں تھی ثرائی کرنے میں کوئی ہرج نہیں تم والد کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لو وہ اولاد کے لیے بہت وسیع دل رکھتے ہیں اگر تم میں اس کی ہمت نہیں تو پھر یہاں سے کوچ کر جاؤ کنیڈا تمہیں نوکری بھی مل جائے گی اور اس قید سے رہائی بھی حاصل کر لو گی، تم جیسے عورتوں کی زندگی وہاں بے حد محفوظ ہے۔ یہ مسئلہ یہاں کا ہے تمہارے سامنے دو راستے ہیں معافی یا فرار۔“

”طیبہ..... مجھ میں کچھ بھی کرنے کی ہمت ہے نہ جرات۔ نسوانی عزت و کبر فخر کی جب یوں نیلای لگا دی جائے تو پھر یہ دنیا ہی بے معنی لگنے لگتی ہے۔ فرار ہونے کے لیے دل گردہ چاہیے۔ مجھ میں دونوں کی کمی ہے، تم تو مجھ پر یقین رکھتی ہونا کہ میں ایس لڑکی نہیں تھی جو محبت عباد سے کرتی اس پر خود کو تیار و فدا ہونے کے بعد اپنے منگیتے فارس کی بیوی بننے کے لیے تیار ہو جاتی۔ یہ ناممکن تھا میرے لیے۔ مجھے ہر قیمت اور ہر حال میں اسی سے شادی کرنا چاہیے تھی جس کی قیمت مجھے بہت بھاری ادا کرنا پڑی کہ اپنا کوئی نہ رہا جسے ہر خوشی رشتے سے اٹلی عرفا سمجھا وہی کمتر نکلا۔ زندگی میں اس کی موجودگی اور جیسے کے باوجود وہ میری زندگی سے کوسوں دور رہا۔ میں ہی نا سمجھ تھی۔ طیبہ بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ کوئی راہ بھائی نہیں دے رہی۔ طیبہ میری انگلی پکڑ کر مجھے چنا سکھا دس رستے پر ڈال دو جو مسرتوں اور راحتوں کے مرغزاروں کی جانب نکلتا ہو۔“ وہ رو پڑی۔

”زونی..... مجھے تم مکمل بھروسہ ہے بارامت دھراؤ میں تمہاری سادہ لوح فطرت کو بچپن سے ہی جانتی ہوں، تم بدکاریا بدچلن نہیں ہو، یہی دکھتے تھے کھاتے جا رہا ہے۔ زونی سب بھول جاؤ اور نئی زندگی کا آغاز کرو۔ رابطہ تعلق اور رشتہ محبت سے جڑتا ہے اور ایک دوسرے کے جذبات کی قدر سے پروان چڑھتا ہے یہاں سب ہی ایک طرف تھا تو پھر دونا کیسا تم دنیا کے کئی رنگوں کا ادراک رکھنے کے بعد سنسنیل تھی اب میری مانو زونی

”اب سوچتی ہوں کہ میں کس فسوں میں تھی کہ مجھے اپنی بے باکی و شرم کا احساس ہوا نہ ہی اس گناہ کبیرہ کو تسلیم کیا۔“

”زونی..... اگر وہ تمہارے ساتھ وفا کرتا تو تمہیں یہ احساس ہرگز نہ ہوتا، تمہیں اپنی اس کبیرہ غلطی کا پچھتاوا نہ ہوتا بلکہ تم خود کو قتل متصور کرتی کہ میں نے خود کو لٹایا تو اپنی محبت کو پاکر اسے ابدی بھی تو بنا دیا۔“ طیبہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، طویل توقف کے بعد وہ طیبہ کی طرف دیکھنے لگی کہ اسے کیا جواب دے۔

”تم بالکل صحیح سمجھ گئی ہو۔“ زونا نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔ ”میں حیرت زدہ ہوں کہ اس نے تم سے نکاح کیسے کر لیا۔ ایسے لڑکے تو فوراً ہی طوطا چشتی پر اتر آتے ہیں لیکن افسوس کہ اس نے تو نکاح کے بعد پینترہ بدلا۔ خاصا شاطر اور خود غرض ثابت ہوا ہے کم بخت۔“ طیبہ تاسف بھرے لہجے میں بولی۔

”اب میں سمجھ پاتی ہوں کہ مجھ سے نکاح کرنا اس کی مجبوری بن گیا تھا کیونکہ میں نے اسے دھمکی دی تھی کہ میں بابا کو اصل حقیقت سے آگاہ کر کے تمہیں جان سے مروا سکتی ہوں، تم نے میری معصومیت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ آخر کار اس نے بندوق میرے کندھے پر رکھی اور مجھ سے خط لکھوایا کہ میں عباد سے پیار کرتی ہوں اسے نکاح کے لیے میں نے مجبور کیا ہے اگر آپ اسے اپنا داماد تسلیم کر لیتے ہیں تو ٹھیک ورنہ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجئے گا آپ مجھے گا کہ آپ کی بیٹی آپ کے لیے مر گئی ہے۔ یاد رکھیے کہ اس تمام معاملے میں عباد بے قصور ہے۔ وہ میرے بن زندگی گزار سکتا ہے لیکن میں اس کے بغیر جی نہیں سکتی اس کے بعد غیرت مند باپ نے اپنی بیٹی کو حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ان کے لیے ڈھونڈنا مشکل تو ہرگز نہیں تھا۔ میں اپنے شہر کے قریب ہی تو تھی۔ خود کو تنہی مدت کے لیے ان کی رسائی سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔ ہائے طیبہ بے شک وہ مجھے باجھ کہہ کر تسکین حاصل کرتا۔ مجھے بالکل کہہ کر چڑاتا، مجھ سے شب روز جھگڑتا، گالی گلوچ سے دل کی بھڑاس نکالتا لیکن مجھ سے تعلق اور رشتہ نہ توڑتا۔ طلاق تو ہمارے درمیان سنگلاخ دیواری کا مانند حامل ہو گئی ہے۔ اسے نہ میں گرا سکتی ہوں نہ ہی تم اسے ہمسار کر سکتی ہو۔ اب مجھ پر خوف طاری ہے میں کسی بھی جگہ اکیلی نہیں رہ سکتی اس بھرپور جوانی کے عالم میں تہی دست میں اکیلی نہیں رہ

پلیز..... سیلف پٹی سے باہر نکل کر پرنیکیکل لائف میں پہلا قدم رکھو میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ طیبہ نے اس کو گلے لگا کر کہا۔

”ایک مرد کی بے وفائی کا مطلب یہ نہیں کہ تم دنیا ہی تیاگ دؤ ابھی تیار ہو جاؤ میں تمہیں انکل اور آئی سے ملوانے لے جاتی ہوں۔ وہ ابھی تک تمہاری راہ دکھ رہے ہوں گے۔ بنگلی مجھے ہی بتا دیا ہوتا کہ اصل ٹریجڈی کہاں پر ہوئی؟ میں تو فقط والدین کی دوری اور شوہر کے اس نامناسب رویے کا سوچ کر تنہا سمجھانے لگی تھی کہ شوہر لو نہیں رہتا نکاح کے تین بول کے بعد اس کی محبت کی کیا پلٹ جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ لو میرج بمشکل ہی کامیاب ہوتی ہے۔ چلو اپنا گھر تو اپنا ہی ہوتا ہے ناں۔ وہاں سے دھنکاری نہیں جاؤ گی چار مہینے دس دن کی عدت پوری کرنے کے بعد اپنے اس کزن کی ہوجانا مجھے امید ہے وہ تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوگا۔“

”طیبہ تم بابا کے مزاج سے لاعلم ہوؤ مجھے گولی مار دیں گے شادی تو دور کی بات ہے اور ماما تو میری شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہوں گی وہ سوشل سرکل میں میری واپسی کا انکشاف کیسے کریں گی؟ میں نے ہمیشہ ان کی ہر نصیحت کو رد کیا اگر ان کی تربیت کا مجھ پر جی بھرا ہوتا تو میں یہ شرمناک حرکت ہرگز نہ کرتی۔“ وہ پھر زار و قطار روئے لگی۔

”زونی..... اس زندگی سے کیا بہتر نہیں کہ تم باپ کی گولی کا نشانہ بن جاؤ شاید تمہارے گناہ کی یہی سزا انہیں ابدی سکون سے ہمکنار کر دے۔ زندگی میں سکون نہیں تو دنیا کی تمام آسائشیں ہی بیکار ہیں۔ یہ تو تم نے سبق حاصل کر ہی لیا ہوگا کہ محبت اندھی ہو تو بربادی اور اگر خوشحالی اور کامرانی نصیب میں لکھ دی جاتی ہے۔ اب بزدلی کا مظاہرہ مت کرو آج خود کو آریا پار ہونے دو یہ ہر لمحے کامرنا اور جینا تو عذاب الہی ہے۔“ طیبہ نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

”طیبہ..... آریا پار۔ ایک فیصلہ اٹل اور حتمی ہوگا۔ دونوں صورتوں میں تمہاری یہ بد قسمت دوست طمانیت و راحت کے بلکورے لینے لگے گی طیبہ غلامی میں لٹکنا کسے کہتے ہیں اور اس کا دکھ اور کرب کیا ہوتا ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔“ زونا نے سوچتے ہوئے حسرت بھری آواز میں کہا۔ اور کرسی سے اٹھ کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ مامی صورت اور سوگواری میں سلٹوؤں سے بھرا ہوا میلہ پچکا لباس دیکھ کر اسے بھکارن ہونے کا احساس ہوا۔

”آج یہ بھکارن والدین سے فقط ذہنی سکون اور قلبی اطمینان کی بھیک مانگنے جا رہی ہے۔“ وہ بڑبڑاتی تو طیبہ نے الماری سے اس کے لیے سفید رنگ کا سوٹ نکالا اور استری کرتے ہوئے سوچنے لگی۔

”جنت کی بد لے جہنم کا سودا محبت کی انتہا نہ ہوتی تو تم یہ عمل کرنے سے پہلے اپنے ذہن کے تمام در پیچے واکر کے سوچتی اور دل کے چاروں کونے مقفل کر کے فیصلہ کرتی تو آج پچھتاؤں کے لالہ میں جل نہ رہی ہوتی۔ والدین اپنے بچوں کے مستقبل کا فیصلہ ان کی بے لوث محبت کی وجہ سے بے حد سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔“ طیبہ نے استری کر کے سوٹ اس کی طرف بڑبھا کیا تو وہ خاموشی سے سوٹ تھام کر تیار ہونے چلی گئی اور کچھ دیر بعد زونی مجرم کی طرح سر جھکائے گھر کو لاک کیے بغیر ہمیشہ کے لیے باہر نکل گئی۔



دونوں گیٹ پر کھڑی منتظر تھیں کہ چوکیدار ہمیں دیکھتے ہی جھٹ سے گیٹ کے دونوں بھاری پٹ کھول کر ہمیں خوش آمدید کہہ گا یا واپسی کی راہ دکھائے گا۔

”زونی بی بی.....! آپ نے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟ کیا دباغیر میں دل نہیں لگا یا میرے مالک جی نے آپ کو چپک بیٹھنے میں دیر کر دی ہے۔“ چوکیدار دروازہ کھول کر حیرت سے بولا۔

”وہ تو کہتے تھے کہ آپ بہت بڑی ڈاکٹر بننے امریکا چلی گئی ہیں۔ کیا وہاں کے لوگ ایسے رہتے ہیں بہت سادہ ہماری طرح۔ میں نے تو سنا ہے کہ وہ بہت امیر ملک ہے آپ کو دیکھ کر تو دل ہی ماند پڑ گیا ہے۔“

”ہاں چا چا..... وہ بہت امیر ملک ہے وہاں میری جیسی غریب ہی نہ سما سکی میں نے سوچا کہ بابا کا پیسہ ضائع کرنے کا کیا فائدہ، اس ملک میں تو میں شہزادی تھی ناں اس لیے واپس آ گئی اپنی جنت میں۔“ زونا نے اپنی آشفتمند ہمت کو بچا کرتے ہوئے کہا اور دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے لگی کہ والدین جہان دیدہ دور اندیش اور دانش مند نہ ہوتے تو جی بچ عزت کا جنازہ میرے ساتھ ہی نکل چکا ہوتا۔

”آئیے چھوٹی بی بی جی، آپ کی مام تو رو کر تاپینا ہو گئی ہیں۔ آپ کی آواز سن کر ان کی بیانی واپس آ سکتی ہے۔ وہ ہر وقت اندھیرے کمرے میں لیٹی آپ کی جدائی میں ٹمک کی



طرح گھٹی رہیں اور آخر بستر کے ساتھ ہی لگ گئیں۔“ وہ افسردگی سے بولا۔

”ایک سال ان کے لیے ایک صدیوں کے برابر تھا۔ مجھے تو ان کی دل آزاری اور لبوں پر جامد خاموشی نے خاصا فکر مند کر دیا تھا۔“ وہ جھگنے کے انداز میں ان کے آگے چلے لگا اور طیبہ اور زونی اس کے پیچھے ہماری قدموں سے آہستہ آہستہ چلتی گئیں لیکن زونی کی کچھ پیٹھ آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ خوش ہو یا دھاڑیں مار مار کر روئے۔ نام ہو یا اپنے دل پر لگی ضرب کو والدین کے سامنے کھول کر ان سے مسیحائی کی امید رکھے۔ اسی کشمکش میں مبتلا وہ لاؤنج میں پہنچ گئی۔ ماں کو بجدے میں گڑگڑاتے ہوئے دعائیں مانگتے دیکھا۔ باپ صوفے پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے بڑبڑا رہے تھے۔ وہ ان کے قدموں پر سر رکھ کر سکتے تھی۔

”مجھے معاف کر دیجیے۔“ مگر پایا کی طرف سے جواب نہ ملا۔

”انکل آپ کی بیٹی زونا واپس آ گئی۔“ طیبہ نے ان کے پہلو میں بیٹھ کر کہا تو وہ ایک دم سے چونکے اور حواس باختہ نظروں سے زونی کو دیکھنے لگے۔

”ماما.....“ وہ ماں کے اوپر گر گئی۔ ”مجھے قبول کر لیجئے، مجھے معاف کر دیجیے۔ آپ کی نافرمانی کی سزا مجھ ل گئی۔ میں ایسے دکھ و کرب کی جتنی سے سکتی ہوں کہ کندن بن گئی ہوں۔“

”میری زونا.....“ ماں بجدے سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”میرے رب، میں نے اس وقت یہی تو دعا مانگی تھی کہ اسی وقت زونا مجھے پکار کر کہے، ماما مجھے معاف کر دیجیے۔ میرے رب تو نے میری دعا اتنی جلدی قبول فرمائی۔ تیرا کرم ہے مجھ پر اور خصوصاً میری زونا پر کہ وہ صحیح سلامت اپنے گھر واپس آ گئی۔“ اسی اثنا میں بابا جوش و حواس کی دنیا میں آ گئے آہستہ سے چلتے ہوئے وہ ماں کی بیٹی کے فریب بیٹھ گئے۔

”بیگم..... تمہارا دماغ ہمیشہ سے ہی خراب ہے میری بات غور سے سنو گئی؟ میں تمہیں معاف کر سکتا ہوں نہ ہی اس حالت میں قبول کر سکتا ہوں! اسی وقت یہاں سے نکل جاؤ اگر اپنی سلامتی اور خیر چاہتی ہو۔“ وہ غصے سے بولے تو ماں نے حیرت زدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

”تمہیں دیکھ کر میری غیرت جاگ اٹھی ہے۔ تم نے ہمیں

پیچھے سے چہرہ مار کر ہمیں نہ جینے کے قابل چھوڑا نہ مرنے کے تم نے کس گناہ کی پاداش میں ہمیں نیم مردہ کر دیا؟ بولو مجھے جواب دو۔ ورنہ ابھی وہی چہرہ تمہارے سینے میں گھونپ دوں گا۔“ وہ غصے سے اس کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ کر بولے۔

”کچھ عقل کریں، بچی کتنے عرصہ بعد اپنے گھر آئی ہے آپ نے شکوے شکایتوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہمیں بھی تو اپنے قصور کا اعتراف کرنا چاہیے ہم دونوں کی زندگی میں زونی نہیں تھی ہم نے پیسے سے اس کو بہلائے رکھا۔“ ماما نے اپنی آنکھوں کو دودھنے کے کونے سے صاف کیا اور آنکھیں جھپک کر بیٹی کو دیکھا۔

”من رہی ہو یہ جدائی کی صدیاں تمہارے بن کیسے گزریں؟ میری نظر کرو رہو گی اور تمہارے بابا کی قوت کو پائی رہو پوش ہو گئی تھی۔“ زونا سر جھکائے اور ہاتھ جوڑے خاموش بیٹھی رہی۔

”ہمیں کچھ نہیں ہوا، ہم بالکل ٹھیک ٹھاک اور تندرست ہیں، بیگم اس کی غلطی ناقابل عطا ہے۔ ہم بے قصور ہیں یہ مت بھولو۔“ وہ چیخے۔

”زونی..... تم نے مجھے مٹی کا تودہ بنا دیا لیکن میری غیرت نہیں مری اس تودے میں قوت بھی ہے جرأت بھی۔“

”غصہ ٹھوک دیں جو بھی ہوا ہے اس کے قصور وار ہم ہیں یا ہماری بچی۔ ذرا غور و خوض تو کریں، طبع کا بھولا شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ شکر ادا کر کے سینے سے لگا لیتے ہیں۔ میں نے بیٹے ہوئے اس طویل عرصے میں یہ سبق تو سیکھ ہی لیا ہے کہ اپنے بچوں کی نئی نسل کے دم قدم چلنے کے لیے زور آوری جہت دھریں اور لڑن طعن کو اللہ حافظ کہنا ہی بہتر ہے، محبت اور لگاؤ کی طاقت بچوں کو غلط فیصلے کرنے سے دور رکھتی ہے۔ جب ہمارے مذہب نے پسند کی شادی کی اجازت دی ہے تو پھر انکار کیوں؟ ہم اپنی بچی کے مجرم ہیں! اگر ہم اسے اپنے ہاتھوں سے رخصت کرتے تو یہ اس ناگفتہ بہ حالت میں ہرگز واپس نہ آتی! اچھا گھر بسا لیتی، شوہر کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزارتی لیکن آپ کی ضد نے اس کی زندگی برباد کر دی لیکن میں دیکھ رہی ہوں آپس کو آپ کی انا کا مزار سمانہ ہوا۔ آپ کی آواز میں توانائی رہی نہ وجود میں طاقت رہی۔ نہ قلب و ذہن میں قوت لیکن انا پہاڑ جیسی اپنی جگہ سے اچھ بھر نہیں ہلی۔“ ماما انتحاق سے بول رہی تھی۔

”یاد رکھیں کہ اگر ہم اولاد کو دکھوں کی آماجگاہ میں پھینک دیں گے تو خود جیتے جی جہنم رسید ہو جائیں گے اپنی اور میری حالت کا موازنہ کریں۔“ طیبہ نے دونوں کو ہنڈاپا پلا پلا کر زونا کو وہاں سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آنسو صاف کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

جونہی کمرے میں داخل ہوئی تو فارس کو اس کی پورٹریٹ پر جھکے ہوئے دیکھ کر وہ ایسے اچھلی جیسے دیکھتے ہوئے کوپلے پر پاؤں رکھ دیا ہو کیونکہ وہ اس کی پورٹریٹ کو ابھی مکمل کر کے گوٹے میں اپنا نام لکھ رہا تھا۔ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو کر پینٹنگ کو دیکھنے لگی۔

”یہ میں کیا دکھ رہا ہوں؟“ وہ سراستگی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”تو زونا اس دنیا میں واپس آگئی وہ کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ کمرے کی ہر شے بدلی ہوئی تھی اور اس کمرے میں قیام کرنے والا اس کا فارس تھا جو ابھی بھی اس کی یاد میں اس کی پورٹریٹ بنانے میں انتظار کے جان لیوا محو سے گزر رہا تھا۔ وہ اس کے والدین کے ساتھ دین رات رہتا اور ان کی خدمت میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ورنہ وہ تو دونوں ہی بیٹی کے دکھ میں چل بیٹے۔

”میں نے ہیرے کو چھوڑ کر ایک عام پتھر کا چٹاؤ کرنے کی سزا خوب بھگتی فارس تمہیں کیسے بتاؤں ہار ٹکست اور بچھتاؤا میرا مقدر رہا۔ میری غیر موجودگی کو تم نے اپنے پیار لگاؤ تو جاور ہمدردی سے اپنا لایچ ہے کہ جب ہم ایک جگہ چھوڑتے ہیں تو اسے باؤ کرنے کے لیے دوسرا ضرور پہنچ جاتا ہے۔“ زونا سوچنے لگی۔ اس نے الماری کھولی تو اس میں ابھی بھی تمام ہنگامہ گزر پراس کے ملبوسات لٹکے مگر انتظار تھے۔

”زونی..... میری محبت و چاہت تمہارا خرواپس آ ہی گئی۔ تم جیسی بھی ہو مجھے قبول ہو۔ پاکیزہ ٹکھری اچلی اور شرمیلی اور حیا کی پتلیوں کو تو سب ہی پیار بھی کرتے ہیں انہیں اپنا جیون ساسی بنانے کے لیے کیا کیا پادیں نہیں بیلتے لیکن تم جیسی معصوم بے گناہ اور دھوکے فریب کی شکار لڑکی کو اپنا ناتو اور کنارا اس پر تھوک کر گزر جاتے ہیں۔ تمہاری حالت ایک ناکام داستان کی نشاندہی کر رہی ہے تم فکر نہ کرو فارس آج بھی تمہارا ہے۔“ وہ خود کلامی کرتا ہوا باہر نکلا تو خالد اور خالو کو دیکھ کر ان کے قریب بیٹھ کر بے حد دلچسپی اور مستحکم لہجے میں بولا۔

”خالد جانی..... میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

”میں جانتا ہوں تمہارا فیصلہ۔ ہمارے منہ پر غلاظت سے بھر پور جوتا لگاؤ کسی کی کمر بانی رہ گئی تھی جو یہ منوں لڑکی آن چکی۔“

”خالد جان یاد رکھیے زونی ڈاکٹر نے امریکہ سدھار گئی تھی چھٹی خانے اپنے گھر آئی ہے زونی ہرگز نہیں وہ معصوم ہے لڑکی کی معصومیت ہی تو اسے لے ڈوبتی ہے چار میٹھے بول کے عوض اپنا دل و جان عزت اور وقار کا سودا کر بیٹھتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ زونی بہت جلد واپس آ جائے گی میرا اسے اپنانے کا فیصلہ ابھی تک برقرار ہے۔ ایسے موقع پر اپنے نہیں کام آئیں گے تو کیا غیرہ فرض نبھائیں گے۔“ وہ سمجھداری سے بولا۔

”زونی کو معاف کر دیں اسی میں آپ کی عظمت و بڑائی ہے۔“

”تم سچ کہہ رہے ہو.....؟“ بابا نے حیران کن لہجے میں سوال کیا تو وہ مسکرایا۔

”خالد ہم بالغ اور آزاد بچے ہیں ہمیں اپنی آزادی کا جشن منانے کی اجازت چاہیے آپ کو قبول ہے کہ نہیں۔“ وہ خوشی سے کہہ رہا تھا اور دونوں کی مانند چھل بڑا۔

”بیٹا زونی سے مشورہ کیے بغیر جشن منانے کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔“ بابا نے مستحکم لہجے میں کہا اور زونی کو حلاوت سے بھر پورا واز میں پکارا تو وہ سر کو اسے دوپٹے سے ڈھانپ کر باہر نکلی اور فارس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”فارس..... مجھے معاف کر دینا میں ایک فرشتہ خصل انسان کے قابل ہرگز نہیں ہوں تمہارے لیے تو جنت کی حور چاہیے۔“

”میں ہمیشہ اسی حور کا منتظر رہا میرے رب نے آج وہ میرے حضور پیش کر دی اور اس پر اس رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر محبت سے بولا تو طیبہ نے آگے بڑھ کر زونی کو اپنے گلے سے لگالیا۔

”زونی..... میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے میرا مان رکھ لیا۔ جب اپنے پیاروں کی لاچ رکھ لی جائے تو اس پر رحمتوں کی بارش کیوں نہیں ہوگی؟ آئی انکل آپ کو اپنی بچی مبارک ہو۔ میں نے بھی چند گھنٹوں میں ایک ناقابل فراموش سبق سیکھا ہے جو میری اولاد کے لیے خوش آمد ثابت ہوگا۔“

طیبہ نے کہا تو سب مسکرا دیے تھے۔



# اکلی

عشنا کوثر سردار

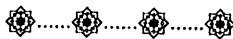
دل اس قدر اداس بھی پہلے کبھی نہ تھا  
غم میرا اک رفیق تو تھا، زندگی نہ تھا  
بکھری ہوئی تھی شہر میں چہروں کی بازگشت  
جس شخص کی تلاش تھی، بس اک وہی نہ تھا

ٹرین میں موجود ہر فرد عامانگ رہا تھا۔ ٹرین سرپٹ دوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی مگر ڈر تھا کہ ذہن سے جانا نہ تھا بلوائیوں نے ایسا خوف پھیلا دیا تھا۔

”جب تک ٹرین ہندوستان کی حدود میں رہے گی تب تک دل کو ایک دھڑکا لگا رہے گا۔“ ہاجرہ اماں نے کہا۔  
”یہ تو ہے ہاجرہ اماں دودھ کا جلا جھابھی پھونک پھونک کر پیتا ہے بلوائیوں نے لوٹ مار ہی ایسی چنپی کہ دل سوچ کر بھی بیٹھا جاتا ہے اس وقت میں کوئی کسی کا انتبا نہیں کر سکتا۔“ حلیمہ خالہ نے کہا تو تاج بیگم نے سر ہلایا۔  
”سو تو ہے، ہر قدم پر گھاسٹ ہے مگر رکنے والے کہاں رکے ہیں ان سازشوں کا اثر تو تب ہو جب آگے بڑھنے والے اپنے قدم روک لیں، ہجرت کرنے والوں کی تعداد کہاں کم ہوئی ہے ان کے حوصلوں کو سازشیں کہاں پسپا کر پائی ہیں؟“ تاج بیگم نے کہا۔

”دادی جان آپ آنکھیں بند کیجیے تمام سفر آپ جاگتی رہی ہیں کہیں طبیعت ہی نہ بگڑ جائے۔“ فاطمہ بی بی نے تاج بیگم کا خیال کر کے کہا تب ہی ایک شور سنا دیا تھا فوری طور پر تو کچھ سمجھ نہ آیا ٹرین فرار لے بھر رہی تھی پھر اچانک کیا افتاد ٹوٹ پڑی تھی۔ ہر کوئی حیران تھا ہاجرہ اماں نے کان لگا کر آواز کی سمت کو جانچا۔  
”یہ آواز پیچھے کی بوگیوں سے آرہی ہے۔ شاید ٹرین کی ان بوگیوں پر حملہ ہوا ہے۔“ درد سے بھری بے ہنگم چیخوں کو سننا۔

”یا اللہ خیر۔“ آوازوں سے لگ رہا تھا جیسے کوئی تیز دھارا آلے سے وار کر رہا ہو جنہیں جیسے آسمان تک رسائی پانے کو تھیں۔

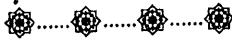


”یا اللہ کرم۔“ فاطمہ بی بی کے منہ سے بے ساختہ نکال۔ وہ جواب قدرے مطمئن تھیں اور انہیں لگ رہا تھا کہ اب سفر سکون سے کٹ جائے گا اور کوئی افتاد نہیں آئے گی تو وہ ایک وہم ہی تھا۔ عجیب قیامت کی سی آوازیں تھیں۔ جیسے کوئی

تیز دھار آ لے کسی انسانی وجود کو کاٹ رہا ہو۔

”یا اللہ یہ کیسی افتاد نازل ہو گئی۔ اب چلتی ٹرین پر بھی حملہ آور سوار ہو گئے موئے۔“ ہاجرہ اماں کی آواز ابھری۔  
 ”کوئی چلتی ٹرین میں سوار کیسے ہو سکتا ہے؟ ضرور کوئی پہلے سے ٹرین میں موجود ہوگا۔ وہ زیادہ سے زیادہ نقصان کرنے کے خواہاں ہوں گے۔ زیادہ لاشیں گرانا چاہتے ہوں گے۔“ تاج بیگم نے اندازہ لگایا۔  
 ”کہیں یہ موئے ان اگلی بوگیوں میں بھی نہ گھس جائیں، اللہ کی مار پڑے ان پر چلتی ٹرین میں بھی قتل و غارت سے باز نہیں آ رہے۔“

”اب اس قیامت کے ساتھ ہی ہمیں جانا ہے، فکر کیا، مرنا ہے تو مرنا ہے، کوئی آئی گھڑی کو ٹال تو نہیں سکتا، بہر حال حوصلہ رکھیں ڈر کر خود کو کمزور کرنے سے کیا حاصل؟“ تاج بیگم نے سمجھایا۔ شور بڑھ رہا تھا چیخیں آسمان کو چھو رہی تھیں۔  
 ”یا اللہ خیر..... یا اللہ اپنا کرم کر دے۔“ قاطمہ بی بی آنکھیں بند کیے اپنے رب سے مخاطب تھیں۔



”چچا جان، ہم کب تک یہاں خیموں میں رہیں گے۔ کیا یہاں گھر نہیں ملے گا؟“ ننھے شیردل نے پوچھا۔  
 ”شیردل بیٹا آپ اپنے چچا جان کو بہت پریشان کرتے ہیں اتنے بے معنی سوال پوچھنے کا کوئی جواز ہے کیا؟“ خاتون نے اپنے سپوت کو ڈانٹا مگر وہ اطمینان سے مسکرا دیا۔

”سوال بے معنی نہیں ہیں امی جان، چچا جان آپ ہی کہیے کیا ہمارا سوال بے معنی ہے؟“ ننھے شیردل نے جواب پا کر دوبارہ وقار اُتھ کر مخاطب کیا۔ وقار اُتھ شیردل کی طرف متوجہ ہوئے اور آہستگی سے بولے۔  
 ”نہیں میاں آپ کے سوال بے معنی کیسے ہو سکتے ہیں؟ آپ ایک ذہن بچے ہیں۔ آپ غیر منطقی گفتگو نہیں



فرماتے: ”وقار الحق نے شیردل کی طرف داری کی تو وہ کھل کر مسکرا دیا۔

”امی جان، چچا جان نے کہا کہ ہم غیر منطقی گفتگو نہیں کرتے، اب تو آپ کو یقین آ گیا ہوگا ناں؟“ خاتون نے بچے کو گھورا تو وہ بھاگ کر وقار الحق کی گود میں سوار ہو گیا۔

”بہن جی..... آپ یہ مت سوچیے کہ شیردل ہمیں پریشان کرتا ہے۔ ان کی باتیں دلچسپ ہیں، معصوم بچے کا دماغ پُر تجسس ہے ان کو ہر شے کو جاننے کی لگن، ہم بڑوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ سبھی سبھی ہم جن سوالوں اور باتوں کو اپنے اندر دبا لیتے ہیں بچے ایسا نہیں کر پاتے۔“ وقار الحق نے کہا تو خاتون سر ہلا کر خیمے کے اندر چلی گئیں۔ شیردل ماں کے جانے کے بعد مسکرایا۔

”چچا جان، ہم آج اس جگہ گھومنے چلیں جس مقام پر پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی؟“ شیردل نے اپنے مطلب کی بات کی وقار الحق نے سر ہلا دیا۔

”جگہ کو دیکھنے ضرور چلیں گے میاں مگر آج نہیں، فی الحال یہاں کاغذی کارروائی مکمل کرانی ہے۔“

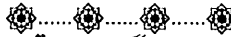
”کاغذی کارروائی، یہ کیا شے ہے چچا جان؟“ شیردل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”بیٹا یہ ابھی آپ کی سمجھ میں آئے والی بات نہیں ہے، بس اتنا جان لیجئے کہ ہم کمپنوں میں مستقل قیام نہیں کریں گے۔ اس کاغذی کارروائی کے بعد ہمیں گھر مل جائیں گے۔“ وقار الحق نے مطلع کیا۔

”زبردست..... مگر چچا جان اگر ہمیں آپ کے برابر میں گھر ناملا تو ہم روز آپ سے ملاقات کس طرح کر پائیں گے۔ آپ تو ہمیں بھول جائیں گے ناں؟ کہیں یہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ نہ ہو جائے دیکھیے ہمارے ابو جان کے خاندان کو ہماری یاد بھی نہیں آتی۔ وہ ہماری خبر بھی نہیں لیتے اور اب تو ہم ان سے اور بھی دور آ گئے ہیں۔ اب ان کو ہم تک پہنچنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا اور راستہ بھی کیونکر ملے گا؟ ان کو خبر ہی نہیں کہ ہم کہاں ہیں۔ پاکستان تو بہت بڑا ہے ناں؟ اتنی جگہیں ہیں ان کو بھلا خبر کیونکر اور کیسے ہوگی؟“ شیردل متفکر ہوا۔ وقار الحق کو بچے کی معصومیت پر بہت پیا آ یا۔ اس کو ساتھ لگا لیا۔

”بیٹا اللہ کی زمین بہت بڑی ہے اور اللہ سے بڑا سہارا کوئی نہیں۔“ وقار الحق نے سمجھایا۔

”اوہ..... ہاں یاد آ یا ہمارا خبر گیری کو اللہ میاں ہیں ناں۔“ شیردل مسکرایا، وقار الحق نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا تھا۔



ہر چہرہ درد کی کہانی سنارہا تھا اور اس کی دوا فقط محمد جہانگیر کے پاس تھی۔ جہانگیر ایک ایک چہرے کو بغور دیکھتا، ان پر درج کہانیوں کو ٹوٹتا، حرف اکٹھے کرتا، مگر سب ایک لمحے میں جیسے بکھرتا جاتا، درجیسے لامتناہی تھا اور دلجوئی کافی نہ تھی۔ وہ کس کس زخم پر مرہم رکھتا، کس کس درد کی دوا کرتا، کہانیاں لاتعداد تھیں، دکھ بے انتہا تھے اور درونی الجھال لا دوا تھا۔

”اللہ ان معصوموں کے دلوں پر اپنا ہاتھ رکھ اور تمام درد چن لے۔ ان کی آنکھوں سے اس درد کی کیفیت کو سمیٹ لے میرے رب۔“ وہ حساس دل رکھتا تھا۔ اس وقت بھی انسانوں کو تکلیف میں دیکھنا پارہا تھا۔

وہ آنکھیں ٹرین کے ڈبے کی چھت پر ٹکائے بیٹھا تھا جب کسی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا، وہ بری طرح چونکا دیکھا تو وہی بزرگ اس کی طرف متوجہ تھے جو رات وقار دروڑے تھے۔ شاید وہ اپنی تکلیف پر آنسو بہا کر تھک گئے تھے اور چونکہ جہانگیر نے ان سے درد بانٹنے کی بابت کہا تھا اس لیے اس کو متوجہ کر رہے تھے۔

”آپ خبریت سے ہیں محترم؟“ جہانگیر نے دریافت کیا۔ انہوں نے سر ہلا دیا۔ جہانگیر نے ان کو بغور دیکھا۔

”پیاں تو محسوس نہیں ہوئی آپ کو؟“ دوبارہ دریافت کیا مگر ان بزرگ نے سرفی میں ہلا دیا۔ تب جہانگیر خاموش

رہا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ ان بزرگوار نے پوچھا جہانگیر چونکا۔

”رجت..... جہاں..... محمد جہانگیر“ وہ لہجہ بھرکوانکا پھر اپنا نام ان کو بتادیا۔ وہ بزرگ جسے غائب دماغی سے اس کی طرف متوجہ تھے انہوں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ جہانگیر ان کے بولنے کا منتظر رہا مگر وہ بزرگ فوری بولنے پر مائل نہ ہوئے۔

”کہاں سے ہیں آپ؟“ جہانگیر نے پوچھا۔

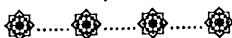
”لکھنؤ“ بزرگ نے مختصر جواب دیا۔ جہانگیر نے مزید کوئی سوال نہ کیا وہ چاہ رہا تھا بزرگ خود بات کا آغاز کریں۔

”تم کہاں سے ہو بر خوردار؟“ بزرگ نے دریافت کیا۔

”ہمدلی سے ہیں۔“ جہانگیر نے مختصر بتایا۔ بزرگ نے سر ہلادیا۔

”ظالموں نے ہر طرف تباہی مچادی۔ کوئی ایسا کونا نہیں بچا جو ان کے عتاب سے خالی نہ ہو۔“ بزرگ نے خود ہی کہا تو جہانگیر نے سر ہلایا۔

”بجائے آیا آپ نے۔“ جہانگیر نے اتفاق کیا۔ بزرگ دوبارہ خاموش ہو گئے تھے۔



قالے چل پڑے تور کے نہیں

ہمتیں ٹوٹی نہیں، قدم رکے نہیں

جاں اک نا تو ان تھی مگر

راستے بنتے گئے، چلتے گئے، قدم چلتے گئے

خاک نے کسرن چھوڑی

اڑی ہواؤں کے رخ پر

آنکھیں گرد سے اٹھیں مگر

حوصلے تھکے نہیں رکے نہیں

ہجرت کا احوال کیا کہیں تم سے

قالے لئے کئی، سر کئے کئی

آبرور وندی گئی پیروں تلے

آچل تارتا رہوئے

روح زار زار روئی مگر

جن کو چلنا تھا وہ چلتے گئے

آگے بڑھتے گئے، رکے نہیں، تھکے نہیں

آسمان کو اوڑھ لیا سر پر آچل کی طرح

ماؤں نے عزتوں کو سنھال کر رکھا

بہنوں نے نظریں جھکا لیں

سر جھکنے نہیں دیے

بھائیوں نے سر کٹا لیے گھر لٹنے نہیں دیا  
ہجرت نے کہانیاں کٹی لکھ دیں  
چہرے آکھیں قصوں سے بھر دیے

درد کا پیمانہ بڑھا دیا  
زمین تنگ بھی کر دی  
مگر جن کو بڑھنا تھا آگے وہ بڑھتے گئے  
جن کو ٹھنا تھا مٹ گئے داستان بن گئے

وقار الحق نے تفصیل درج کرنے والوں کے پاس جا کر کئی بار فاطمہ بی بی کی بابت دریافت کیا مگر کوئی خبر نہ ملی۔  
”یہاں کئی اپنے اپنوں کے منتظر ہیں میاں، انہیں ہجرت کا سلسلہ رکا نہیں، ٹرینیں سرحد پار سے مسافر لانے کا کام  
بدستور کر رہی ہیں۔ اچھی امید رکھیے۔ اگر کوئی سلامت ہوا تو آپ سے ضرور ملے گا۔ یہ وقت دعاؤں کا ہے خیر کی دعا  
مانگیے اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔“ تفصیل بتانے والے اہلکار نے کہا تو وقار الحق نے سر ہلادیا۔  
”اللہ تعالیٰ کا انسانوں کو چاہئے کہ پیمانہ ایک ہے۔ اس کی رحمت سب کے لیے یکساں ہے اور عذاب بھی یکساں۔  
اس وقت کون ہے جو وقت کے عتاب سے بچ گیا ہو؟“ ایک بزرگ کی آواز کانوں میں پڑی۔

”کہتے تو آپ ٹھیک ہی ہیں، اب یہی دیکھ لیجئے کیسے کیسے لوگ در بدر اور بے گھر ہوئے، خوار ہوئے، اس خطے کے  
لوگوں نے اپنی بھلائی کے لیے جو فیصلے لیے ان کو پورا کیا اور ہم اس کو عذاب نہیں کہہ سکتے۔ یہ اللہ پاک کی طرف سے  
آزمائش ہے اور یہ درست ہے کہ اس کی رحمتوں کا شمار نہیں۔ اس کا مینہ اچھوں اور بروں دونوں پر برستا ہے۔“ دوسرے  
بزرگ نے کہا۔

”بجایا میاں جناب۔ اللہ نے کرم کیا جو ایک ریاست کا وجود عمل میں آیا۔ وگرنہ سیکولر ازم کے نام پر ہندوؤں کو مسلط  
کر دیا جاتا اور ہم ساری عمران کی غلامی میں گزار دیتے۔“ ایک نے اپنی رائے دی۔ خیموں کے باہر بیٹھے بزرگ سیر  
حاصل گفتگو فرما رہے تھے۔

”اللہ مہربان ہے آج ہم ایک آزاد مملکت میں بیٹھے سانس لے رہے ہیں۔ باقی جو ختم ہیں وہ تو مندرجہ ہو ہی جائیں  
گے۔ ورنہ بھی ٹھم جائے گا۔“ ایک نے اپنی رائے دی۔

”درست فرمایا صاحب، آنے والی تسلیوں کے لیے یہ دکھ بھی ہے۔ اپنا گھر لٹایا اور گھر کے لیے تکلیف سہی بھی۔ اس  
زمین کے ٹکڑے کو اللہ نے اپنے نام سے آباد کیا ہے۔ دنیا کا واحد ملک ہے جو نظر یہ کی بنیاد پر قائم ہوا۔ اس زمین پر اپنی  
مرضی کی حکومت ہوگی۔ اپنی مرضی کا قانون ہوگا۔ ہمیں ہندوؤں کے منہ کی طرف نہیں دیکھنا پڑے گا۔ ان کے قانون  
جبر اُسہنا نہیں چریں گے۔“ ایک اور نے اپنی رائے دی۔ وقار الحق نے کچھ دیر رک کر ان کی گفتگو سنی پھر آگے بڑھ گئے۔  
”چچا جان آپ کی شہزادی کی خبر آگئی؟“ شیردل نے پوچھا تو وقار الحق نے سر ہلایا۔

”نہیں بیٹا، مگر آپ دعا کریں کہ وہ جلد ہندوستان سے یہاں پہنچ جائیں۔“ وقار الحق نے آہستگی سے کہا تو خاتون  
نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

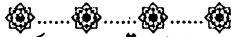
”ان شاء اللہ آپ کا کنبہ بھی خیریت سے یہاں پہنچ جائے گا، بھیا فکر مند نہ ہوئے۔“ خاتون نے تسلی دی وقار الحق  
نے سر ہلایا۔

”امید تو یہی ہے، سنا ہے ایک ٹرین آئی ہے مگر ابھی اس کے مسافروں کی تفصیل سے آگاہ نہیں کیا جا رہا۔“ وقار الحق

آہستگی سے بولے۔

”آپ فکر مت کیجیے چچا جان اللہ سب ٹھیک کریں گے۔“ شیردل نے بھی تسلی دی وقار الحق مسکرا دیے۔  
”شکر یہ ننھے میاں آپ نے کہہ دیا تو ان شاء اللہ بہتر ہوگا۔ جلد ہی ہم اپنے کنبے کو دیکھیں گے۔“ وقار الحق نے کہا تو ننھے شیردل مسکرا دیے۔  
”ہم بھی آپ کی دہن کو دیکھنے کے لیے پریشان ہیں۔ آپ نے آگاہ کیا تھا وہ بالکل پری سی دکھتی ہیں۔“ ننھا شیردل مسکرایا۔

”ہم نے کہانی کی پریوں اور شہزادیوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ اگر ہم کانے دیو کو دیکھ لیتے تو ان کا سر پھوٹ دیتے۔ وہ ہمیں بالکل بھی پسند نہیں۔“ شیردل نے کہا تو وقار الحق کھل کر مسکرا دیے۔  
”لیکن آپ کو بہادر شہزادہ تو اچھا لگتا ہے نا؟“ وقار الحق نے دریافت کیا۔  
”تب ہی تو آپ ہمیں اچھے لگتے ہیں چچا جان، آپ کو دیکھ کر ہمیں کہانیوں کے شہزادے یاد آتے ہیں، آپ کی شخصیت بہت نرالی لگتی ہے۔“ ننھا شیردل مسکرایا۔ وقار الحق مسکرا دیے۔  
”مذاق نہیں ہے چچا جان، آپ واقعی ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں تب ہی تو ہم نے آپ کو فوراً دوست بنالیا۔ ہم تو چچی جان کو بھی فوراً دوست بنالیں گے۔“ ننھا شیردل مسکرایا اور ان کی یہ بات وقار الحق کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیر گئی تھی۔



قتل و غارت گری کا عمل رکا نہیں تھا۔ ٹرین رکی نہیں تھی۔ چھت پر کسی کے بھاگنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”یہ ہو کیا رہا ہے؟“ حلیمہ خالہ چیخیں۔

”کچھ نہیں اماں جان آپ کھڑکیاں بند رکھیے۔“ ایک نوجوان چیخا اور ڈبے سے باہر نکل گیا۔ شاید بلوائی قتل و غارت کر کے چھت پر سوار ہو گئے تھے اور اگلے ڈبوں کی طرف رسائی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور ٹرین کی چھت پر موجود افراد ان کو روکنے کی کوشش میں ان سے مقابلہ کر رہے تھے۔ کوئی ٹرین کو نہیں رکوا رہا تھا کہ ٹرین کے رکنے سے بلوائیوں کے لیے اگلے ڈبوں میں داخل ہونا آسان ہو جاتا اور ان کو ایسا کرنے سے روکنے کے لیے چھت پر موجود نوجوان ان سے بھیڑ گئے تھے۔ ڈبوں میں موجود خواتین نے ٹرین کی کھڑکیاں بند کر لی تھیں۔  
”یا اللہ مدد فرما ان نوجوانوں کو ہمت دے جو حق کے لیے دشمنوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔“ ہاجرہ اماں نے دعا مانگی۔



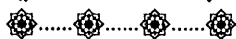
نواب صاحب نے تفصیل درج کرائی اور اپنے عارضی ٹھکانے کی طرف آگئے تھے۔ کیمپ میں جن افراد کے ہمراہ ان کو جگہ ملی تھی وہ ان سے گفتگو کرتے رہے پھر سو گئے۔ آنکھ کھلی تو ضروری ساز و سامان جو ہمراہ لائے تھے۔ وہ غائب تھا۔ شاید کوئی بندہ دوسرے کیمپ میں منتقل ہوا تو ان کا سامان غلطی سے اپنے سامان کے ہمراہ لے گیا۔  
”کچھ ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟“ ایک بزرگ نے پوچھا۔  
”نہیں..... ہاں۔“ وہ بولتے ہوئے رکے۔

”آپ کا سامان شاید کسی نوجوان کے سامان میں چلا گیا ہے کچھ دیر بعد غور کریں گے تو واپس لوٹا جائیں گے۔ فکر مت کیجیے۔“ بزرگ دھیمے سے مسکرائے۔ نواب صاحب نے سر ہلایا اور دم ہم لہجے میں بولے۔



”ہمیں اندازہ ہو گیا تھا۔ ایسا کوئی قیمتی سامان بھی نہیں تھا کہ اس کی فکر ستاتی، بہر حال تشفی ہو گئی۔“ نواب صاحب دھیمے سے مسکرائے۔

”چائے پیچھے گا؟“ بزرگوار نے پوچھا۔  
 ”کیپ کے باہر چند نوجوان بہت بہترین چائے بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ ایک اچھی نشست جی ہے آپ بھی تشریف لائیے۔“ ان کے کہنے پر نواب صاحب بھی ان کے ہمراہ چل دیے تھے۔



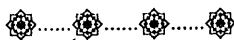
ہم نے قصے کہانیوں میں  
 خوب صورت کردار پڑھے  
 خواب جتے، گیت سنے  
 مگر خوابوں میں جیتے تو مر جاتے  
 سفر اختیار نہ کرتے تو جان سے گزر جاتے  
 نظریے نے نظریہ بدل دیا یک دم  
 راستے پہلے بھی جدا تھے گھر کو بھی الگ کر لیا  
 سمتوں کو چنا اپنی اور منزل کی جانب چل پڑے  
 کیا، کہاں رکھا ہے، سب بھول گئے  
 چھوڑ دیا سب ویسے ہی جہاں جو تھا  
 گھر کے لیے بھول گئے سب کہاں کون کھڑا تھا  
 آچل کہاں گم ہوئے کہاں لٹیرے ملے  
 ہم نے سوچا نہیں کچھ بھی جب ہجرت اختیار کی  
 نظریے نے نظریہ بدل دیا یک دم  
 دل تو الگ تھے در بھی بدل دیا ایک دن

”دلی میں کہاں سے ہوں میاں؟“ ان بزرگ نے دریافت کیا۔ جہانگیر نے مدہم لہجے میں جواب دیا۔  
 ”ہم دلی کے مرکز میں قیام پر زیر تھے۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے اب، پانی پیتیں گے آپ؟“ جہانگیر نے احتراماً پوچھا  
 مگر انہوں نے گردن نفی میں ہلا دی۔ ان کا چہرہ رنجیدہ اور آنکھیں ویران تھیں۔ جیسے وہ زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ آئے  
 ہوں۔ جہانگیر جان بوجھ کر ان کو کرید کران کے زخم ہرے کرنا نہیں چاہتا تھا وہ دانستہ نظر پھیر گیا۔  
 ”بھئی کبھی کہنے کو بہت کچھ ہوتا ہے مگر بات کرنے کو ایک لفظ نہیں ہوتا۔ زبان پر جیسے تالے سے پڑ جاتے ہیں۔ ہم  
 نے بھی اسے حالات دیکھے ہیں۔ کیسے ممکن تھا کہ ہم ہجرت نہ کرتے۔ مشکلات سے ڈر کر قافلے نہیں رکھتے۔“ ان  
 بزرگ نے تمہید باندھی تو جہانگیر نے سر ہلا دیا۔

”خیر ہم نے بھی وہی کیا جو ضروری تھا۔ ہم وہ باپ ہیں جنہوں نے اپنی تین جوان بیٹیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔  
 تاکہ ان کی عزتوں پر حرف نہ آئے۔ ہم نے اپنی بیٹیوں کے لیے کھانا اپنے ہاتھوں سے پکایا۔ ان کو بہت عزیز رکھتے  
 تھے۔ اس لیے ان کو کسی تکلف میں دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے ان کی موت کا سامان ڈھونڈا۔ ان کے کھانے میں  
 زہر ملا دیا۔ کھانے کے فوراً بعد ان کو جیسے نیند کے غلبے نے گھیرا۔ ہمیں شب بھر کہہ کر وہ اپنے بستر میں چلی گئیں اور

اگلی صبح کا سورج انہوں نے نہیں دیکھا۔“ ان کی داستان عجیب سفاکی لیے ہوئے تھی۔ جہانگیر ششدر رہ گیا مگر ان کی آنکھیں بھیگے لگیں۔

”ہم قاتل ہیں۔ جانتے ہیں مگر یہ اقدام ضروری تھا آپ ہمیں ظالم اور سفاک کہہ سکتے ہیں اور ہم ہیں مگر وہ دنیا سے بہت مطمئن گئی ہیں۔ ان کے آپ بچل ان کے سر پر تھے۔ ان کو لحد میں ہم نے اپنے ہاتھوں سے اتارا۔ ان کی عزت محفوظ تھی۔ ان کا وقار و جرح نہ ہوا تھا۔ ہم سر اٹھا کر کھڑے تھے ہماری بیٹیاں سعادت مند اولاد تھیں۔ ہماری بڑی بیٹی نے ہمیں کھانے میں زہر ملاتے دیکھ لیا تھا مگر اس نے ایک حرف نہ کہا۔ اس کے لبوں پر کوئی شکایت نہ تھی۔ ان کے چہروں پر سکون دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ ہمارے فیصلے پر مطمئن تھیں۔“ ان بزرگ کی آواز بوجھل اور دکھ سے بھری ہوئی تھی۔ جہانگیر ایک حرف نہ کہہ پایا تھا۔



”زندگی کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ شاہوں کو گدا بنا دیتی ہے اور کہیں فقیر کی شہنشاہ بن جاتے ہیں۔“ شام کے وقت سب لوگ اپنے خیمے سے باہر آ کر بیٹھ جاتے تو ایک نشست خاص جم جاتی۔ قبوے کی چسکیوں کے ساتھ دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو رہتی۔ سب اپنے اپنے تجربات، قصے کہانیاں کہتے، تذکرے سنتے۔

”نواب صاحب آپ خاموش ہیں..... طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ ایک بزرگ نے نواب صاحب کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔ نواب صاحب نے سر لٹی میں ہلادیا۔

”آپ کے صاحب زادے اور دیگر کنبہ کے متعلق کچھ خبر ہوئی؟“

”نہیں فی الحال تو کوئی خبر نہیں۔ دو چار بار دریافت کیا مگر تاحال کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔“ نواب صاحب متفکر دکھائی دے رہے تھے۔

”آپ فکر مت کیجیے محترم۔ فی الحال آنے والوں کا تانتا بندھا ہے۔ کئی لوگوں کی تو تفصیل بھی درج نہیں ہو پائیں کئی نام پتے کے بنا کیپوں میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ مطلوبہ شعبے کو کبھی تسلی ہے کہ لوگ یہیں کیپوں میں ہی ہیں اور کہاں جائیں گے کہ ابھی انہوں نے جائیدادیں بھی کلیم کرنا ہیں۔ سو تفصیلات تو درج ہو ہی جائے گی۔ خیر یہ قانونی کام ہیں اور یہاں کون ہے جو اپنا اندراج نہ کرانا چاہیے گا قوم بننے کے لیے جو حالات جھیلے ہیں اور صعوبتیں کالی ہیں وہ تو مکمل ہونا طے ہے۔“ ایک بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نواب صاحب نے سر ہلادیا اور اطمینان بھرے لہجے میں گویا ہوئے۔

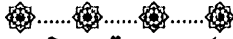
”سو تو ہے میاں قوم بننا آسان نہیں اور ہجوم جو قوم بن جائے اسے کوئی منتشر نہیں کر سکتا۔ ایک قوم ہی مملکت بناتی ہے۔ ریاست بننے کا باعث بنتی ہے۔ مگر نہ غول اور جھنڈ تو جنگلوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔“ نواب صاحب کے کہنے پر بزرگ نے سر ہلادیا۔

”بہت پتے کی بات بھی محترم۔ ہم نے ہجرت اختیار کی یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ ہم میں اپنے حقوق کو پہنچانے کی خاصیت تھی۔ یہ قربانیاں جو ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں نے دی ہیں یہ ہمیشہ آزادی کے باب میں یاد رکھی جائیں گی۔ ایک قوم ہی ایسی قربانیاں دے سکتی ہے۔ جنہوں نے نظریے کی اہمیت کو پہنچانا انہوں نے جانا کہ آزادی کی وقعت کیا ہے۔ نظریے کو سمجھنے کے لیے بھی اہل عقل ہونا ضروری ہے جنہوں نے نظریے کی مخالفت کی وہ کل جان پائیں گے کہ وہ کہاں اور کس قدر غلط تھے۔ خیر ہر ایک کو اپنی زندگی گزارنی ہے اور اپنی قسمت کے دکھ کھ سہنے ہیں۔“ بزرگ نے اہم موضوع چھیڑ کر یک دم سمیٹ دیا۔

”ایک عظیم لیڈر کے باعث سب ممکن ہوا ورنہ ہم وہیں ہندوستان میں بیٹھے سیکولر نظریات کی حمایت میں لگے ہوتے۔ ہندو کے نظریات کو سراہنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور راہ نہ ہوتی۔“ ایک بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا تو سب نے بھرپور حمایت کی۔

”خیر اللہ کا جتنا شکر کریں کم ہے کہ ایک نظریاتی ریاست میں بیٹھے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہماری آئندہ آنے والی نسلیں آزاد فضا میں سانس لیں گی۔“

”یہ تو ہے جناب، خیر جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے۔“



ٹرین کی چھت پر بھاگتے دوڑتے لوگوں کی آوازیں آتی رہیں چیخ دیکار دل دہلانے کو کافی تھے جو بھی تھا ٹرین کی چھتوں پر موجود جوان بلوائیوں کا بھرپور مقابلہ کر رہے تھے۔

”ان بے چاروں کے ہاتھ خالی ہیں اللہ ان کی مدد فرمائے۔“ ہاجرہ اماں نے ان نہتے لڑنے والوں کے حق میں دعا مانگی۔

”اللہ جن کی مدد فرمائے ان کو تیغ و تلوار کی کیا حاجت؟“ تاج بیگم نے کہا۔

”اللہ پاک کامیاب کرے ماؤں کے ان بہادر سپوتوں کو یہ موئے بلوائی قبر کا عذاب سہیں گے۔“ ہاجرہ اماں نے کہا۔

”قبر کا نظریہ ان لوگوں میں کہاں ہاجرہ ماں، یہ لوگ تو جلانے کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کو اللہ کے عتاب کی کیا فکر۔“

حلیہ خالہ نے کہا۔

”یا اللہ کرم کر دے، یہ سفر مبارک کر دے۔“ شا کرہ کی آنکھیں بھیکے لگیں۔ فاطمہ بی بی نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں میچ لی تھیں۔

”یا اللہ مدد فرما۔“ ذہن اور سوچیں منتشر تھیں۔

پتا نہیں کیا ہونا تھا۔ مشکلات ختم نہ ہو رہی تھیں جانے اور کیا ہونا باقی تھا۔ وجود پر تھکن تھی مگر ان کے اندر کی امید ختم نہیں ہو رہی تھی۔

سفر سآگے کی راہ

تھکن سمیٹ لے گی

سفر سآگے کی منزل

دل کو سکون دے گی

خوابوں کا مسکن

گھٹڑیوں میں بندھا پڑا ہے

سامان تھوہیں گے تو یقین کی دھوپ میں رکھیں گے

دھوپ سمیٹ لے گی تمام درد

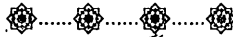
تمام کرب تمام دکھ

سفر سآگے کی تھکان

یقین کی اڑان

ہجرتوں کے دکھ

خالی شاخوں کے ملال  
 پروں کے بوجھ سمیٹ لیں گی  
 ہجرتوں سے آگے  
 امید سے یقین تک  
 ملال سے یقین تک  
 یقین کی نبضیں تو چل رہی ہیں  
 خواب نئے بن رہی ہیں  
 وقت کو علم ہے اسے گھٹنے ٹیکنا ہے  
 اپنا پہیرہ روکنا ہے  
 منزل و حسد لکوں میں گم ہے  
 مگر دور نہیں  
 تسکین سے آگے کا سکون  
 پلکوں پر لرزے خوابوں کا جنوں  
 اور اک فسون  
 یقین کی نبضیں تو چل رہی ہیں  
 خواب نئے بن رہی ہیں  
 وقت کو علم ہے اسے گھٹنے ٹیکنا ہے



”میاں یہاں جگہ ہے، اس طرف آجائیے۔“ جہانگیر اپنی نشست پر جمائیں کی مدہم روشنی کو گھور رہا تھا جب کرم دین چاچا نے اسے اپنی جانب بلایا۔ جہانگیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند ثانیے یونہی بیٹھا رہا۔ کرم دین چاچا نے بغور اسے دیکھا۔ ان کو وہ خاصا منتشر دکھائی دیا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے میاں؟“ کرم دین چاچا نے وہیں سے دریافت کیا۔ جہانگیر شاید مردنا اٹھ کھڑا ہوا اور کرم دین چاچا کے عین سامنے آن بٹھا۔ نگاہ آیت پر پڑی۔ جو بے خبر سو رہی تھیں۔ چہرہ سیاہ چادر سے آدھا ڈھانپا ہوا تھا۔ لاجپت بلیس سرخ و سپید عارضوں پر جھکی جیسے جدے کر رہی تھیں۔ جہانگیر بے توجہی سے نگاہ پھیر گیا۔

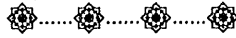
”کیا ہوا جہانگیر..... بہت منتشر دیکھ رہے ہو؟“ کرم دین چاچا نے دریافت کیا مگر جہانگیر نے سر نفی میں ہلادیا۔

”حساس دل و دماغ والے ہو، یہ وقت کڑا ہے مگر بہر طور اسے گزر جانا ہے۔ ہم خوش نصیب ہیں جو اس وقت کا حصہ ہیں اور آزادی کی فضا میں سانس لینے جارہے ہیں۔ اس ملک کی طرف گامزن ہیں جو عقیدے اور نظریاتی سوچ کا حصہ ہے۔ دنیا میں کوئی ریاست عقیدے یا نظریاتی بنا پر نہیں وجود میں آئی۔ پاکستان واحد ریاست ہے جو یہ انفرادیت رکھتی ہے۔ اچھی چیزوں کو پانے کے لیے قربانیاں دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے میاں۔ سو جو قربانیاں اس راہ میں دی جا رہی ہیں، وہ اس آزادی کی قیمت ہیں۔ کسی مفکر نے کہا ہے کہ آزادی کسی قیمت پر بھی لے لی جانی چاہیے اور آزادی کو کسی قیمت پر ہی کوئی چھیننا چاہیے تو اس سے انکاری نہیں ہونا چاہیے۔ آزادی سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ اللہ نے انسان کو کئی نعمتوں سے نوازا ہے مگر انسان غرض کے لیے زمین کے کنگڑوں کو بانٹتے جاتے ہیں۔ بہر حال دل کڑا کرو۔ حساس طبیعت بھی

کمال شے ہے اللہ کے بندوں کا درد ہو کوئی محسوس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یہ وصف بھی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا کہ

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا  
آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا

سو خوش نصیب ہو میاں تمہیں انسان بننا میسر ہے۔ حساس دل تمہارے سینے میں دھڑکتا ہے۔ آنکھیں دوسروں کے دکھ تکلیف پر اشک بہاتی ہیں۔ یہ سب نایاب ہیں محمد جہانگیرؒ، کرم دین چاچا نے دلاسا دیا۔ وہ آنکھیں موند گیا۔



مجدد احساسات..... لبورنگ خواب

مردہ جسم اور اس کے نیچے دبی جنت بی بی، جانے کب تک وہ نیم جان سی پڑی رہیں۔ کسی پہر حواس بحال ہوئے تو انگلیوں میں جان محسوس ہوئی۔ حرمت زندگی کی علامت ہے مگر جس گھڑی ٹرین کے فرش پر پڑے خون پر انگلیاں پڑیں تو زندگی کے بہت ارزاں ہونے کا لال لال روح تک کو چیر گیا تھا۔

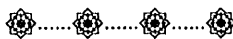
”آزادی..... آ..... آہ.....! آزادی کا ڈھنڈوا پیٹنے والے خود غرض انسانوں کے اس لبو کے ذمہ دار ہیں۔ جن کو قربانیاں کہتے ہیں۔ وہ انسان کی بے قدری اور توہین ہے۔ جس طرح بے دردی سے انسانوں کو قتل ہوئے کو چھوڑ دیا۔ یہ انسانیت نہیں، آزادی کو اہم واقعہ بنانے کی سازش ہے بس آزادی ڈھکوسلہ ہے۔ کھیل ہے یا آزادی۔“ جنت بی بی کے اندر کا غصہ جیسے لاوے کی طرح کینے لگا۔

”آزادی کے نام پر انسانیت کو ارزاں کر دیا۔ عزتوں کو نیلام کر دیا نہیں جانا پاکستان۔ کوئی اس ٹرین کو روکوا ہمیں بھی موت کے گھاٹ اتار دو، مار دو ہمیں بھی۔ اس سے بھی سیکولراٹھٹھی۔ انسان بے بس تو نہ لگے کوئی روکے اس ٹرین کو۔“ ان کی آنکھیں جامد تھیں مگر روح چیخ رہی تھی۔

نظریاتی مخالفت رگوں میں جیسے لاوا بن کر دوڑنے لگا۔ لاشوں سے بھری ٹرین میں جیسے وہ ایک تنہا زندگی کی حرارت سے بھرا وجود تھیں۔ سوچنے کی صلاحیت جیسے نیم مردہ تھی۔ ایک لمحے میں دماغ میں ریحان میاں کا خیال آیا۔ جنت نے ادھر ادھر لگا ہیں دوڑائیں۔ وجود جیسے فوج زدہ ہو گیا تھا۔ وہ جاتے ہوئے بھی حرکت نہ کر پائیں۔ ٹرین میں کتنے لوگ زندہ تھے۔ کتنے زندگی کی حرارت سے خالی، وہ جان نہ پائیں مگر تیزی سے دوڑتی اس ٹرین کا سفر جس سمت تھا اس خیال سے ہی ان کو نفرت ہو رہی تھی۔

”کاش ہم بھی مرجائیں مگر پاکستان نہ جائیں، یہ محض نظریاتی مخالفت نہیں، یہ انسانیت سوز اقدام ہے ہم اس درجہ ظلم نہیں دیکھ سکتے۔ ہمیں مرجانا چاہتے۔ ریحان..... ریحان میاں، کہاں ہیں آپ؟ آپ ہمیں پاکستان لے جانا چاہتے تھے ناں، کہاں ہیں آپ؟“ جنت نے چیخنا چاہا مگر زبان سے ایک حرف نہ نکلا۔

”یا اللہ ہم مردہ وجودوں کے درمیان پڑے ہیں ماروے ہمیں بھی ایسا انسانیت سوز منظر نہیں دیکھ سکتے ہم۔ چھین لے یہ سانس چیخ لے، روح سمیٹ لے لے یہ جان اس زندگی سے کھلی موت ہے۔“ جنت بی بی بے بس ٹرین کے فرش پر پڑی تھیں اور ان کی روح چیخ رہی تھی مگر اس ٹرین کے لانے سے ٹرین کی رفتار پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا، وہ اپنی مخصوص رفتار سے اپنی منزل کی سمت بھاگ رہی تھی۔



”چچا جان، آپ کو آپ کے کنبہ متعلق کچھ خبر ہوئی؟“ وقار الحق کیمپ میں واپس آئے تو ننھے شیردل نے دریافت

”نہیں میاں..... کئی نئے آنے والوں کا اندراج ہوا تو ہے مگر ان میں ہمارے کنبے کا نام نہیں۔“ وقار الحق نے مدہم لہجے میں کہا۔

”اوہ..... یہ تو باعث فکر ہے مگر آپ امید رکھیے آپ کے کنبے کے متعلق جلد آپ کو خبر ہوگی۔ ہماری امی جان کہتی ہیں مایوسی کفر ہے کسی بھی حال میں ہوا انسان کو ہمت نہیں ہارنا چاہیے۔“ ننھے شیر دل نے مسکراتے ہوئے کہا تو وقار الحق کو ہر شے مثبت رنگ میں رنگی دکھائی دی۔ اللہ نے بچوں کو معصومیت اور صاف دل عطا کیا ہے ان کی مسکراہٹ دیکھ کر ہر شے مثبت دکھائی دیتی ہے۔ وقار الحق کو ہمیشہ یہ بات خاص طور پر متاثر کرتی تھی۔ تب ہی وہ ننھے شیر دل کے ہمراہ نشست ضرور جماتے۔

”ہم کیمپ سے کہاں جائیں گے چچا جان؟“ شیر دل نے دریافت کیا۔ وقار الحق نے لاعلمی سے سر نفی میں ہلایا اور نرمی سے بولے۔

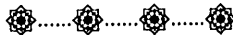
”نہیں معلوم بیٹا مگر ہم پاکستان میں رہیں گے۔ کسی بھی حصہ میں رہیں اس سے فرق نہیں پڑتا۔“ وقار الحق نے مدہم لہجے میں سمجھایا۔

”یہ تو ہے چچا جان مگر ہم اچھے دوست بن گئے ہیں اور ہم آپ سے دور رہنا نہیں چاہتے۔ آپ نے کہا تھا ناں تدریسی کاموں میں آپ کو ہماری معاونت درکار ہوگی۔ اگر ہم کہیں دور چلے گئے تو آپ ہماری مدد سے استفادہ کیسے کریں گے؟“ وقار الحق پریشانی کے باوجود مسکرائے پر مجبور ہو گئے۔

”یہ تو پتے کی بات کی سہا آپ نے میاں۔ واقعی ہم آپ کو کہاں ڈھونڈتے پھریں گے یا؟ آپ جو اتنے کام کے بندے ہیں آپ کو کھونا کون چاہے گا۔“ وقار الحق نے مسکراتے ہوئے انہیں گود میں لیا۔

”کیا آپ ہمارے ہمراہ رہیں گے؟“ وقار الحق نے پوچھا۔ چچا اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا پھر کوئی واضح جواب دیے بنا بولا۔

”ہم آپ کی معاونت کو تیار رہیں گے چچا جان، آپ فکر مت کیجیے۔“ وقار الحق مسکرا دیے۔  
”چلیے یہ ننھی غنیمت ہے میاں، شکریہ۔“



”نظریات کا تعلق نظر سے نہیں دراصل دماغ کی سوچ سے ہوتا ہے جو محرکات کا باعث ہوتی ہے۔“ نواب صاحب نے کہا حالیہ بنے رفیق نے سر ہلایا۔

”بجائے میاں نظر سے کیا بدلتا ہے؟ نظریات دنیا کو بدلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور نظریات سوچ کے مرہون منت ہیں۔“ بزرگ نے مکمل اتفاق کیا اور پیالی اٹھا کر تھوہے کی چسکی لی۔

”آپ نے اپنی تفصیلات کا اندراج کروایا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اپنے کنبے کو تلاش کر رہے ہیں ہمارا مشورہ ہے کہ جلد سے جلد اندراج کروائیے سو آپ کو اپنے پیارے جلد آ کر مل سکیں۔“ ان حضرات نے سمجھایا تو نواب صاحب نے سر ہلادیا۔

”ہماری بیگم نے کان کھا رکھے ہیں کب کیمپ سے نکلیں اور کب معمول کی زندگی کا آغاز کریں، ان کی باتیں سن کر کپکپاتے ہیں تو ہم یہاں آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔“ ان بزرگ نے کہا تو نواب صاحب مسکرا دیے۔

”بیگم کے ہوتے ہوئے کوئی بے غم نہیں ہو سکتا مگر یہ بھی درست ہے کہ بیگم کے نہ ہونے کا خلا ایسا ہے کہ عمر بھر غم دیتا

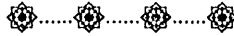
ہے۔“ نواب صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ حضرت کھل کر رہے۔

”کیا خوب کہی، دل کو لگی نواب صاحب۔“

”آپ کی بیگم خیر سے حیات ہیں؟“ ان حضرت نے دریافت کیا۔ نواب صاحب کے مسکراتے لب بھیج گئے۔ وہ حضرت سمجھ گئے۔

”بواللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ہم اب تک خوش بختی سے خالی ہیں۔“ ان حضرت نے ایسے لہجے میں کہا کہ نواب صاحب بے ساختہ ہنس دیئے۔ جب ہی عین سامنے نگاہ گئی۔ ایک دو شیزہ بہت ملول سی بیٹھی تھیں۔ بار بار آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ ہر بار بے دردی سے آنکھیں رگڑ لیتیں۔ جانے کیا تھا اس ملول چہرے میں کہ نواب صاحب نگاہ نہ ہٹا سکے۔ ان حضرت کی زوجہ کی آواز پڑی تو فو اٹھ کھڑے ہوئے۔

”قبوے کا مزہ دوبالا ہو گیا جناب مگر اب واپسی ضروری ہے ورنہ بیگم کے عتاب کا شکار ہو جائیں گے کیا کریں اس کے سوا چارہ نہیں۔“ وہ حضرت مسکراتے ہوئے اٹھ کر چلتے بنے۔ نواب صاحب نے دوبارہ نگاہ کی مگر اب منظر خالی تھا۔ جانے کیوں نواب صاحب کی نگاہ بے چینی سے یہاں وہاں کچھ ڈھونڈنے لگی مگر تمام منظر خالی دکھائی دیا اور وہ گہری سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔



رگ جاں میں کہیں

ایک لمحہ دھڑکتا رہتا ہے

وہ لمحہ جو ساکن تھا

لیکن ہر طرف ہلچل تھی

جس سے سارا منظر دھڑکتا تھا

جس سے دل آباد تھا

لیکن پھر بھی شاد نہ تھا

منظر روح کے کھلنے اور مسکراتے کا

رگ جاں میں کہیں

وہ لمحہ ساکن ہے

وہ رابطہ مسلسل دھڑکتا ہے

وقت کی بنفیں بھی جن کی دھڑکنوں کو

رک کر غور سے سنتی ہیں

وہ ساکن لمحہ

جو لمحہ محبت کا آغاز تھا

وہ لمحہ جس سے دل آباد تھا

اور جس نے دل غیر آباد کیا

وہ لمحہ ساکن تھا

ساکن رہا

وقت چلتا رہا  
جان چلتی رہی  
دل سلگتا رہا  
وہ ساکن لہ

فاطمہ بی بی جانے کتنی دیر غنودگی میں رہیں، آنکھ کھلی تو ماحول ساکت تھا۔ ہر طرف سکون تھا۔ ٹرین اپنی مخصوص رفتار سے چل رہی تھی۔ سو وہ ہولناک لمحہ گزر گیا تھا۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا اس نے تاج بیگم کی طرف دیکھا۔  
”دادی جان اتنا سکون ہے سب ٹھیک ہے ناں؟“ اس نے اندر کے ڈر اور خدشوں کو دبا کر مدہم لہجے میں دریافت کیا۔ تاج بیگم نے سر اثبات میں ہلایا۔

”تو سو جا میری بچی۔ اللہ ساتھ ہو تو کچھ غلط نہیں ہو سکتا۔ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہے۔“ تاج بیگم نے کہا۔  
فاطمہ بی بی نے باہرہ اماں کی طرف دیکھا جو آنکھیں مڑ سکون انداز میں بند کیے تکیج کے دانے گزار رہی تھیں، گویا واقعی وہ قیامت خیز لمحہ بنا کوئی نقصان پہنچائے گزر گیا تھا۔

”فکر مت کریں۔ بہو بیگم ہم خیریت سے ہیں اور پاکستان کی طرف بڑھ رہے ہیں، جملہ آوروں سے منٹ لیا گیا۔ اب ان کا کیا انجام ہوا یہ تو ہم نہیں جانتے مگر ٹرین کی چھت پر قدموں کی آواز اور چیخ و پکار بھی نہیں رہی اور پھر یکدم سکوت چھا گیا۔ لگتا تو یہی ہے کہ ان بلوائیوں کا کام اس ٹرین کے مسافروں نے تمام کر دیا ورنہ وہ کسی بھی ڈبے میں گھس کر قیامت پکا کر گئے ہوتے۔“ حلیمہ خالہ نے کہا۔

”نہتے مسافروں نے ایسی ہمت دکھائی لگتا ہے انہی کے ہتھیاروں سے ان کی بولتی بند کردی۔“ حلیمہ خالہ نے اپنے طور پر تجزیہ پیش کیا۔

”خیر آپ آرام فرمائیے، تمام فکروں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیجیے۔ ہم سب خیریت سے ہیں اور یہ ٹرین کامیابی سے اپنی سمت کی طرف گامزن ہے۔ اللہ پاک کی مدد ہمارے ہمراہ ہے۔“ فاطمہ بی بی نے گہری سانس خارج کی۔

”سو ہم آپ سے کم فاصلے پر ہیں نواب زادہ وقار الحق۔ ورنہ ایک پل کو لگا ہم آپ سے بھی مل نہیں پائیں گے اور سانسوں کا یہ تسلسل ختم ہو جائے گا۔ ہماری امید انہی سانسوں کے ساتھ ٹوٹ جائے گی۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ زندگی سے ایسا پیار ہمیں کبھی نہیں ہوا۔ ہم نے زندگی کو مشکلات کے ساتھ جیا ہے مگر اب۔۔۔۔۔ اب بھی سانسوں کوئی خوش فہمی قبول نہیں کرتیں، بس ایک آس ہے کہ آپ سے روبرو ہوں۔ ہم آپ کو بتا سکیں کہ آپ سے کس درجہ محبت کرتے ہیں اور ایک آس لیے جی رہے ہیں۔ پھر چاہے آپ ہمیں قبول کریں یا نہیں یا سمت بدل لیں۔ ہم آپ کو نہیں روکیں گے۔ ہم آپ کو متاثر نہیں کرنا چاہتے۔ محبت خیرات نہیں دیتی نہ خیرات قبول کرتی ہے پھر چاہے وہ نگاہ التفات ہو کہ کسی کا ساتھ۔“ فاطمہ بی بی نے گہری سانس خارج کی۔ ذہن میں یک دم جنت کا خیال آیا۔

”آپ جو ہم سے ملے باغائب ہوئے تو کیا پتا آپ نے واقعی رستہ بدل لیا ہوا اور اپنی سمت پر چلتے کہیں دور جا ٹھہریں ہوں۔ آپ سے شکوہ نہیں کر سکیں گے اگر ایسا ہوا تو آپ کو حق ہے کہ جسے چاہیں چن لیں۔ ہم آپ کو الزام نہیں دیں گے۔ نہیں جانتے آپ ہمارے منتظر ہیں یا پھر کسی کے ہمراہ ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی کے بے واسطہ ہونے سے محبت بدلتی نہیں نا اپنی سمت بدلتی ہے۔ ہمارے جذبات و احساسات آپ کے لیے جس طور ہیں وہ جوں کے توں رہیں گے۔ ہم ناپ کو بے وفائی کا کوئی الزام دیں گے اور نہ ہی آپ پر کوئی قدغن لگائیں گے اگرچہ ہم آپ سے ملنے کے لیے بے صبری سے منتظر ہیں مگر ہم اپنے آپ کو سمجھا بھی چکے ہیں کہ آخری فیصلہ بہر حال آپ کے ہاتھ میں ہے



اور ہمارا کیا ہے۔“ سوچیں ایک لمحے کو ظہر گئیں، دل کے دھڑکنے کی رفتار مدہم ہوئی۔ نئی اچانک ہی آنکھوں میں آن ظہری۔ للال رگوں میں پھیلنے لگا تھا۔

”ہم منتظر ہیں آپ کے اور منتظر ہیں گے نواز اداہ وقار الحق ہماری اولین خواہش آپ ہیں ہم نے آپ سے محبت کی ہے اور آپ کے علاوہ کچھ نہ دیکھا نہ سوچا۔ ہم جس راہ کے ہو لیے وہیں کہہ رہے گے۔ ہم نے نہ راہیں بدلنا سیکھا ہے نہ نظر بدلنا۔ نہ ازام لگانا، نہ اشکایات کرنا عورت کی محبت مرد کی محبت سے مختلف ہوتی ہے۔ عورت کو ناپ تول کے طریقے از بر نہیں ہوتے۔ اس کا حساب اس قدر کمزور ہوتا ہے، تب ہی بنا پیمائش کے محبت کرتی ہے عورت، بنا سوچے سمجھے معاف کرتی ہے ہر بار معاف کرتی ہے بار بار معاف کرتی ہے مگر مرد شاید ایک بار بھی معاف نہیں کر سکتا۔“ فاطمہ بی بی نے اپنے آنسوؤں کو اپنے اندر مدہم کیا۔

”محبت کی کہانی ختم نہیں ہوئی نواز اداہ وقار الحق نا ہماری محبت آپ کے لیے کبھی بدلے گی۔ چاہے ہم آپ کو ڈھونڈ سکیں یا نہیں، چاہے عمر بھر نہ ملیں چاہے پل بھر کو ملیں اور پھر سے اجنبی بن جائیں۔“ سوچیں ایک جگہ ہم گئیں فاطمہ بی بی نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

”کاش ہم آپ سے کہہ سکتے، طویل گفتگو کا موقع پاس دو حرف کہہ سکتے یا پھر بس خاموشی سے آپ کے مد مقابل کھڑے ہو پاتے۔ ہم اس ایک موقع میں زندگی بارنا چاہتے ہیں، اس ایک لمحے میں زندگی تمام کرنا چاہتے، اف محبت۔ کس طور بتلا کیا اس محبت نے جانے آپ نے کبھی اس طور سوچا کہ نہیں ہم نے تو اس محبت میں سب ہار دیا۔“ مدہم پڑی دھڑکنوں میں کوئی احساس نہ تھا مگر امید تھی اور اسی محبت کا ہاتھ تھا فاطمہ بی بی یہ سفر کر رہی تھیں سائیں بھرے جا رہی تھیں۔



محبت قدم در قدم آشفتم سر غیر مربوط  
عشق تار تار کر چہ وصل و جبرائیل میں طبع پرانندہ  
حال کیا سنائیں کو چہ صمنا تار کنار  
زیروز بر منتظر  
دل مجزون و مضحمل جیسے غیر مزرعہ بکھل  
واماندگی نظر کا عالم شوق نہ پوچھ  
سو گئی آنکھ دو ج کے چاند کو تکتے  
پتیرے سوئے اس کوئے جاں کئے اس پاس  
عشق کے گوشوارے کی گوشوارہ عقل تمام

محبت اپنی سمت سے بٹھنے نہیں دیتی اور کسی اور سمت دیکھنے نہیں دیتی۔ محبت کی تمام خاصیتوں میں اولین خاصیت یہ ہی ہے۔ منظر لا کھ رنگین ہوں تمام لکشی بھری ہو مگر جس منظر میں محبت نہیں اس کی طرف توجہ نہیں جاتی، محبت کی خوب صورتی اور دکاشی اپنی ہے کوئی عام سا منظر بھی عجب سحر انگیزی رکھتا ہے اور کبھی کوئی حد سے سوا خوب صورتی بھی نہیں بھاتی۔ محبت ایسی ہے کیوں ہے؟ اس کے متعلق کوئی اور نہیں جان سکا محبت اپنے سوال اپنے جواب خود آپ رکھتی ہے سو محبت کی رمز اور تال میں سے بھی محبت فقط خود واقعیت رکھتی ہے اور کسی اور کو کچھ خبر نہیں ہونے دیتی۔ جہاں گہر نے بند آنکھوں میں گویا کوئی اپنا مطلوبہ منظر تلاش اور تصویر کی آنکھ سے وہ دیکھا جو ظاہری نگاہ دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔

روح کو جو سکون ملا تھا وہ جد سے سوا تھا۔ کرم دین چاچا کسی مسافر کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے اور آیت خاموش بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ جب یکدم نگاہ محمد جہانگیر کی طرف گئی۔ وہ جانے نیند میں تھا یا محض سوئے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر کوئی خیال نیند میں پلکوں پر دستک دے رہا تھا کہ ایک براسر اسی مسکراہٹ بوں کا احاطہ کر رہی تھی۔ آیت جانے کیوں دلچسپی سے اس چہرے کو دیکھتی رہی۔ توجہ بندھ گئی اور نگاہ محسوس میں مبتلا ہو گئی۔

”کیا سوچ رہا ہوگا۔ کیسا خواب ہوگا، شاید اپنے کنبے کے متعلق یا شاید کسی اور کے متعلق۔“ ذہن قیاس آرائی کرنے لگا۔ کرم دین نے جو بتایا تھا وہ رحمت سنگھ کی شخصیت کے متعلق متاثر کن تھا۔ ایک غیر دین نے اللہ کی تلاش میں جو سفر کیا اس میں کیا کیا کھویا اور کیا پایا، یہ جاننا آیت کے لیے دلچسپ تھا وہ لمبا چوڑا شخص اپنی شخصیت میں ایک خاص اسرار رکھتا تھا اگر چیز زیادہ بات چیت نہ ہوتی تھی مگر یقیناً کرم دین چاچا سے سنا تھا وہ شریف النفس انسان ہی ہوگا۔

”تقسیم کی بات کیا کرتے ہو میاں صرف زمین نہیں یہاں تو اشیا کا بؤارہ بھی ہوا ہے۔ موئن جو دڑو اگرچہ پاکستان کی زمین میں شامل ہوا مگر اس سے نکلنے والے نوادرات کو بھی برابر کا تقسیم کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک بہت پرانے ملنے والے ہار کے بھی دو ٹکڑے کیے گئے اور اُدھا حصہ پاکستان کو ملا اور اُدھا ہندوستان زیر تسلط آیا یہ ہے تقسیم کوئی سنے تو ان باتوں پر خوب جگت بازی کرے مگر بؤارہ تو بؤارہ ہے جب زمین کے حصے ہو سکتے ہیں تو پھر اشیا کے کیوں نہیں۔“ کرم دین چاچا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ دوسرا شخص ہنس دیا۔

”ٹھیک کہتے ہو میاں، بؤارہ تو بؤارہ ہے۔ زمین کے ٹکڑے ہو سکتے ہیں تو پھر اشیا کے کیوں نہیں، بؤارے کا اصول ہے جو چیز سے وہ برابر کی تقسیم ہو۔ خیر ابھی تو اس میں بھی دھاندلی ہوئی۔ تقسیم برابری کی نہیں ہوئی۔ صرف مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان میں آئے کئی مسلم اکثریت والے علاقے بھی ساز باز سے انڈیا کے تسلط میں چلے گئے جو فہرست جاری ہوئی اس کے مطابق تقسیم ہوئی کہاں؟ خیر جو ہوا اس کا ہونا بھی ناممکن دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تو جناح محترم کی کوششیں شامل تھیں وگرنہ ہم کہاں اس قابل تھے کہ تقسیم کے متعلق سوچ بھی سکتے۔ ہم نے تو اقتدار گنوا دیا تھا جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی زمین پر قدم رکھا تھا۔ رہی سہی کسر تو تب ہی ختم ہو گئی تھی جب کانگریس کا وجود عمل میں آیا۔ اگر جناح صاحب مسلم لیگ کی بنیاد نہ رکھتے تو ہم تو ہاتھ دھو بیٹھتے ایک طویل مدت تک جو نظر پاتی جنگ لڑی یہ اس کا ثمر ہے۔“ ان صاحب نے بھرپور تجربہ پیش کیا کرم دین چاچا نے اتفاق کیا۔

”پہلیے اگر یہ عمل بھاگتے چور کی لگوٹ والا ہی سہی تو کیا برا ہے ہم نے تو گنوا دیا تھا یہ تو اس مخلص رہنما کی جدوجہد کا انعام ہے یا آزادی کسی کے منہ سے شکار چھیننے والی بات لگتی ہے۔ جو کوئی نکلنے کو تھا اسے حلق میں ہاتھ ڈال کر نکالا ورنہ یہ زمین، یہ اقتدار کہاں نصیب ہونا تھا میاں۔“ کرم دین چاچا مسکرائے۔

آیت کی سماعتیں جیسے اس بحث پر نہ تھیں جانے کیوں نگاہ بھٹک بھٹک کر اس سمت جا رہی تھی اور وہ خود اس بات پر حیران تھیں۔ کئی بار خود کو سرزنش کی اور نگاہ کا رخ بدلا مگر ہر بار نگاہ پلٹ جاتی وہ دانستہ رخ پھیر کر کھڑکی کی طرف گھوم نکلیں۔

”ایسی بھی کیا بے وقوفی ہے۔“ اس کو اپنے آپ پر غصہ آیا۔

”میری بیٹی نے قانون کی ڈگری لی ہے بہت لائق بچی ہے۔“ کرم دین چاچا ساتھ بیٹھے بزرگ کو تفصیل سے آگاہ کر رہے تھے۔

”بیگم تو بیٹی کی پیدائش کے وقت ہی گزر گئیں، بیٹی برسوتیلی ماں کا سایہ نہ آئے اس غرض سے دوسری عورت کی طرف ندریکھا۔ بیٹی ہونہار ہے اور کیا چاہیے اولاد نیک ہو تو زندگی اہل ہو جاتی ہے۔“ کرم دین چاچا نے اپنے متعلق بتایا۔

”بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں میاں، ہماری بھی ایک ہی اولاد ہے اپنے ہاتھوں سے ذمہ داری پوری کر دی۔ اپنے گھر خوش ہے ان کے سرال نے وہیں انڈیا میں قیام کرنے کو ترجیح دی سو ہم نے اکیلے رخت سفر باندھ لیا۔ کیا کریں اولاد اپنے گھر کی ہوتو زبردستی ممکن نہیں۔“ ان حضرت نے کہا۔

”بجائے میاں اپنے گھر کی نہ بھی ہوتو تب بھی اولاد پر زبردستی ٹھیک نہیں آپ نے ٹھیک کیا۔ دختر کو اپنی زندگی میں اپنے گھر کا کر دیا اور شوہر کی وفاداری کرنے کو وہیں چھوڑ دیا۔“

”انت بھلا سوسب بھلا۔ خیر اچھا ہے سو ہم کئی کڑوے سچ بھی شہد سمجھ کر نگل سکتے ہیں بفسادات بھی تو اسی لیے ہوئے کہ وہ ہوا جو کوئی امید نہیں کر رہا تھا۔ سوسب کو اپنی کدورتیں نکالنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ انگریزوں کی جی حضوری کر کے جو سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے ہاتھ کچھ نہ آئے گا ان کے سینے پر تو سانپ لوٹ رہے ہوں گے آخری دم تک وہ ساز باز کرنا چاہتے تھے مگر مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔“ کرم دین چاچا مسکرائے۔

آیت نے سامان سے کتاب نکالنے کا سوچا کہ اچانک سامنے نگاہ پڑی۔ جہانگیر آ نکھیں کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو اپنے بیگ کی طرف متوجہ ہوئی تھی دانستہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ متواتر اس کو دیکھ رہا تھا۔ ”کیا ہوا کوئی بڑا خواب دیکھا ہے کیا؟“ آیت کی مشکل کرم دین چاچا نے حل کر دی۔ جہانگیر جیسے کسی سوچ سے چونکا اور چہرہ پھیرتے ہوئے سرنفی میں ہلا دیا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ آیت نے پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی مگر اس نے سرنفی میں ہلا دیا اور نگاہ پھیر گیا۔ آیت نے پانی کی بوتل کو دوبارہ سامان میں رکھ لیا۔

”ابو جان بتا رہے تھے کہ آپ مسلم لیگ کے سرگرم کارکن رہے ہیں سن کر خوشی ہوئی۔“ آیت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جہانگیر نے کوئی جواب نہ دیا مگر مسلم لیگ کے ذکر پر دھیان کسی اور طرف ضرور چلا گیا تھا۔

تو بالا جب دل ہوا کیا جان کا کیا کریں؟

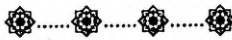
بھڑ میں جھونکیں تمام عمر نقل مکان کریں  
دن تاریک ہوئے زمانے ہوئے چشم یار میں گم  
سو گئی آنکھ دو ج کے چاند کو تکتے

پتیرے ہوئے اس کوئے جاں کے آس پاس  
عشق کے گوشوارے کی گواہ عقل تمام  
رطب و عقل چاہیے نہ تحقیق عینی کا کوئی کام  
کیا کرنا خرد کا یاں جاوے بھڑ میں فسطائیں  
عشق پھر عشق ہے شش و پنج میں مبتلا ہو یا کچھ اور  
دیدہ آشنا کی خیر ہو پارہ دل رہے پہلو میں سرمست  
عشق پھر عشق ہے  
عشق پھر عشق ہے

رگوں میں دوڑتا تھا ہوا ایک نقطے ایک خیال کے ہمراہ جیسے اب منجمد ہونے لگا جہانگیر پہلو بدل کر رہ گیا اور اپنی طرف کی کھڑکی کھول لی۔ تازہ ہوائ نے چہرے کو چھووا تو ایک تسکین ملی۔

”ابو جان بتا رہے تھے آپ نے قانون پڑھا ہے آپ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان گئے تھے۔ میرا بھی خواب تھا انگلستان جانے کا مگر ہر خواب مکمل ہو ضروری نہیں۔“ آیت براہ راست محمد جہانگیر کو مخاطب کرتی ہوئی مسکرائی سیاہ چادر کے ہالے میں چھپا سیاہ و سپید چہرہ توجہ کا طالب تھا۔ جہانگیر نے سر اثبات میں ہلادیا۔

”آپ نے وکالت کیوں نہ کی؟“ آیت نے پوچھا جہانگیر نے کوئی جواب نہ دیا۔ تب آیت بھی چپ ہو گئی اور کتاب کھول لی تھی۔



نواب صاحب کیمپ سے نکل کر باہر آئے۔ جب وہی چہرہ دکھائی دیا جانے کیوں وہ رک گئے مگر دوشیزہ ایک نگاہ دیکھ کر پلٹی اور اپنے کیمپ کے اندر چلی گئی۔ کیا کشش تھی اس چہرے میں، عام سا چہرہ اور عام سے ہی خدو خال تھے اس چہرے میں خاص کیا تھا؟ نواب صاحب اس بات کا کوئی واضح جواب تلاش نہ کر پائے۔ ان کی توجہ کا کوئی خاص پہلو نہ تھا مگر ان آنکھوں میں جو حزن و ملال تھا وہ جانے کیوں اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ نواب صاحب نے پلٹ کر کیمپ کی طرف نگاہ کی مگر وہ چہرہ دکھائی نہ دیا تب وہ آگے بڑھ گئے تھے۔



وقار الحق نے جائیداد کے لیے کلیم کر دیا تھا اگرچہ وہ یہاں سے فی الحال کہیں اور منتقل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے جانے کیوں وہ دل سے منظر تھے کہ فاطمہ بی بی یہاں ان سے آملے اگرچہ آخری ملاقات کوئی ایسی خوشگوار نہ تھی مگر محبت، بہر حال محبت ہوتی ہے، سب باتوں کے باوجود خوش گمانی میں مبتلا رکھتی ہے اور کوئی منفی بات سوچنا بھی نہیں دیتی، سو سب باتوں کے باوجود وہ منظر تھے روز متعلقہ شعبے میں جاتے اور آنے والوں کی تفصیلات دریافت کرتے۔ وہ نواب صاحب کے متعلق متفکر تھے انہوں نے اندراج کرنے والوں سے درخواست کی تھی کہ ان کے والد صاحب کے متعلق کوئی تفصیلات درج ہوں تو ان کو ضرور مطلع کیا جائے اس بات کا بچھتاوا بھی تھا کہ انہوں نے ناحق کرنا ل سے سفر کا آغاز کیا ان کو واپس مل آنا چاہیے تھا اور اباحضور کے ہمراہ سفر کا آغاز کرنا چاہیے تھا اور..... فاطمہ بی بی کا خیال بے ساختہ آیا۔

”ہم آپ کے مجرم ہیں فاطمہ، آپ سے محبت کے باوجود آپ کو تکلیف دینے کا باعث بنے، ہمیں اس بات کا ملال ہے مگر بخدا ہم آپ کی خوشی چاہتے تھے، آپ کو خوش دیکھنے کے خواہاں تھے، ہم نے صرف آپ کی خوشی کو، ہم سمجھا اور جانا، ہماری نیت میں کوئی کھوٹ نہ تھی نہ کوئی چور دل میں تھا۔ ہم آپ کے ہمراہ ہونا چاہتے تھے مگر آپ کی خوشی کے خلاف جانا نہیں چاہتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ آپ خوش رہیں اور ہم کوئی فیصلہ آپ پر مسلط کرنے کا باعث نہ بنیں، ہم نے محبت کی، خوشی اور خیر خواہی چاہی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں، ہم خود غرض ہوتے تو آپ کو زبردستی زندگی کا حصہ بنا لیتے۔ آپ کی مرضی کو، ہم جانے بنا آپ کو گل میں واپس لے آتے مگر ہم ایسا کر کے کیا کمال کرتے، اگر آپ کی خوشی اس میں شامل نہ ہوتی؟“

کہکشاؤں سے چمکتے

ستاروں سے دمکتے

چہرے لاکھ ہیں اطراف میں

روشنی شہری نہیں

سفر جو ہے سو ہے قدم تھکے نہیں رکے نہیں

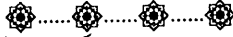
رنگ و نور ہے جہاں میں سو ہے  
 ہنگامہ پاپے اب بھی شہر میں، رنگ ہیں  
 بہاریں جانی ہیں لوٹ آئی ہیں  
 زندگی کو راستہ بھول گئیں  
 آنکھیں جام سی پھٹکتی ہیں  
 دلکش خواب بنتی ہیں  
 آرزوؤں کے دریا بہتے ہیں رفتار قسمتی نہیں  
 پلکوں پر خواب دھڑکتے ہیں جو قدم راستہ بھول جاتے ہیں  
 رعنائی سانس روکنے کو کافی ہے  
 مگر جو رگوں میں ابھو مجھ سے وہ رواں نہیں  
 گرمی شوق کی حد ہے سو نگاہ کو کچھ بچا نہیں  
 رعنائی ہے رنگ ہے نور ہے سب ہے

ہر وہ چہرہ  
 جو رگوں میں مجھ کو پل میں روا کر دے  
 گرمی شوق نگاہ میں بھر دے پلچل کر دے  
 کوئی نہیں..... کوئی نہیں  
 نہیں ملتا وہ چہرہ وہ خواب آنکھیں  
 وہ غلاب عارض وہ مضطرب پلکیں  
 وہ پلکوں پر ڈولتے ہوئے خواب  
 بنا بات کے سوالوں کے ان گنت جواب  
 نہیں ملتا وہ منزل میں نظریں  
 کنارہ ڈھونڈنے کو سفر کیسے کریں؟  
 کس سمت کو جائیں، کس طرف چلیں؟  
 ہزار سمت میں پھیلی ہوئی

ہر وہ چہرہ  
 نہیں ملنا کہیں وہ خواب خواب آنکھیں  
 رگوں میں ابھو مجھ سے  
 خواب سرد ہیں  
 نہیں ملنا کہیں وہ  
 کہاں سے ڈھونڈیں؟  
 کہاں تک دیکھیں؟

ہر وہ چہرہ

نواب زادہ وقار الحق کے اندر اضطراب پھیلنے لگا تھا۔  
 ”ہم منظر میں فاطمہ۔ بہت بے چینی سے منظر ہیں۔“ ان کے لبہ ہستکی سے ہلے تھے۔



ٹرین کے فرش پر چاروں شانے چت پڑے جانے کتنا وقت گزرا۔ وہ اٹھنے کی ہمت نہ رکھتی تھیں۔ لمحہ بھر کو وجود بے جان لاش لگا۔ ان کو یقین کرنا دشوار لگا کہ وہ زندہ ہیں اور ان کے وجود میں کوئی حرارت ہے۔ ریحان میاں جانے کہاں تھے؟ آخری بار کے منظر میں انہوں نے اسے ٹرین کے فرش پر گرایا تھا اور خود اپنے وجود سے اسے ڈھانپ کر جیسے ہر نگاہ سے اوجھل کر دیا تھا۔ جنت بی بی جانتی تھیں ان کا ارادہ ان کو بلوائیوں کی نگاہ سے چھپانا تھا پھر کیا ہوا تھا؟ وہ ہوش کھو گئی تھیں۔ لاشوں کے انبار میں اپنا وجود زندگی سے خالی لگا۔ اپنی رگوں میں دوڑتا خون نچھڑا لگا۔ شاید وہ بھی لاشیں زندگی کی معمولی رت کو زندگی نہیں کہتے وہ آنکھیں کھولے ٹرین کی چھت کو دیکھ رہی تھیں جب کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ دیکھ نہ پائیں ٹرین میں روشنی کا وجود نہ تھا بلوائیوں نے ڈبوں میں روشن قمقموں کو بھی توڑ دیا تھا کوئی تھا جو لاشوں کو گھسیٹ کر ایک طرف ہٹا رہا تھا۔

”جنت بھری..... جنت بھری“ کوئی خاتون اس کے بہت قریب چلا گئی، آواز ساعتوں کے بہت پاس تھی۔ جنت بی بی اندازہ کر پائیں کہ کوئی خاتون تھیں جو کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔  
 ”جنت بھری، ہم چیخ رہے ہیں کیا آپ کو ہمارا آواز سنائی نہیں دیتی۔ کیا آپ ہمیں سن سکتی ہیں، آپ سن رہی ہیں تو ہمیں جواب دیں۔“ وہ خاتون ایک بار پھر چیخیں۔ مگر کسی نے ان کی آواز کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ وہ لاشوں کے ڈھیر میں سے جن جن کر ایک دوسرے کو گھسیٹتی گئیں۔

”جنت بھری آپ یہاں ہیں خدارا جواب دیجیے۔“ وہ خاتون فکر مند آواز میں ایک بار پھر چیخیں ان کی آواز روہاٹی ہوئی پھر جیسے وہ ہمت ہارنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ ایک بار پھر ہمت کر کے لاشوں کو ایک دوسرے پر سے گھسیٹنے لگیں۔ جانے کون تھی جسے وہ خاتون تلاش کر رہی تھی۔ جنت بی بی کا دل چاہا ان کی آواز کے جواب میں جواب دیں مگر حلق سے کوشش کے باوجود کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔

”جنت بھری ہم آپ کو تلاش رہے ہیں خدارا ایک بار جواب دیں۔“ وہ خاتون رونے لگیں۔ ایک لاش کو گھسیٹنا تو جنت بی بی کا چہرہ دکھائی دیا۔ کھلی نچھڑا آنکھیں کہ مردہ ہونے کا گمان گزرے۔ کئی لمحوں تک وہ جنت بی بی کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ جنت بی بی کا دل چاہا زور سے چیخیں اور کہیں میں زندہ ہوں۔ خدارا مجھے ان لاشوں کے درمیان سے اٹھاؤ، ان لاشوں کے بوجھ سے میرا وجود کھل ہے۔ میں اگر زندہ ہوں تو زیادہ لمحوں کو زندہ نہ رہوں گی۔ مجھے ہاتھ پکڑ کر ایک طرف گھسیٹ لو کوئی لاش سمجھ کر ہی ایک طرف بچ دو، مجھے کھل کر سانس لینے کو کچھ ہوا تو میسر ہو مگر..... اس خاتون نے چند ثانیوں تک دیکھا اور پلٹ گئی۔

”سین مجھے اس بوجھ سے آزاد کریں۔ میں..... میں زندہ ہوں شاید..... شاید؟ نہیں یقیناً میں یقیناً زندہ ہوں مجھے اس طرح چھوڑ کر نہ جائیں میں زندہ ہوں میں سانس لینا چاہتی ہوں میرا دم گھٹ رہا ہے مجھے ان لاشوں کے بوجھ سے آزاد کر دیں یہ سب نہیں تو..... مجھے..... مجھے گھسیٹ کر ایک طرف بچ دیں۔ سین مت جائیں۔ میں..... میں زندہ ہوں، میں..... میں..... سا..... نس..... لے..... رہی ہوں..... دیکھیں..... میرے..... وجو..... د..... میں حرا..... ر..... ت..... بھی ہے..... میں..... کھل..... کر..... سانس..... لوں تو..... شا..... ید..... ب..... ج..... بھی.....

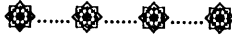
سکتی..... ہوں..... مت..... جائیے۔“ جنت نے چیخنے کی بھرپور کوشش کی، مگر حلق سے آواز برآمد نہ ہوئی۔ وہ خاتون پشت پھیرے کھڑی تھیں۔ وہ اپنی کسی پیاری کلاب بھی اس جوش و خروش سے تلاش رہی تھیں۔

”جنت بھری..... جنت بھری..... آواز دیں، آپ یہاں ہیں۔ ہم آپ کے لیے بہت متفکر ہیں بخت بھری۔ آپ ہمارا کل اثاثہ ہیں۔ خدا جواب دیں ہمیں ہم پاگل ہو جائیں گے۔“ وہ خاتون چیخ رہی تھیں اس سے قبل کہ وہ یہاں سے جاتیں جنت بی بی آواز دے کر ان کو متوجہ کرنا چاہتی تھی مگر حلق سے آواز برآمد نہ ہو رہی تھی۔ کوشش کے باوجود وہ ایک لفظ نہ بول پارہی تھیں۔

”جنت بھری..... جنت بھری.....“

”ہمیں بچائیں جنت بھری، ہم زندہ ہیں۔ ہمیں ان لاشوں کے بوجھ سے آزاد کریں..... آپ..... نے رک کر..... ہمارا چہرہ دیکھا ہے نا؟ ہماری آنکھیں کیا ہماری آنکھیں آپ کو زندگی سے بھری محسوس نہیں ہونیں؟ کیا آپ جان نہیں پائیں کہ ہم زندہ..... ہیں..... سینیں..... ہم..... زندہ..... ہیں..... اسے..... مت..... نظر..... اند..... از..... کریں..... ہم..... زندہ..... ہیں..... ہمارا..... وجود..... زندہ..... گی..... سے..... خالی..... نہیں..... ابھی..... سا..... نس..... چل..... رہی..... ہے..... ہماری..... طر..... ف..... متوجہ..... ہوں..... دیکھیں..... ہم..... زندہ..... ہیں.....“ جنت بی بی بولنے کے حلق میں ایک حرف نہ کہہ پائیں۔

”ا..... رے..... جان..... آپ..... کہاں..... ہیں..... آ..... وا..... ز..... دیں..... ہمیں.....“ جنت بی بی بے بسی سے پاگل ہونے کو تھیں مگر کوئی سن نہیں رہا تھا۔



”بھائی صاحب آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کے کنبے میں کون کون ہے؟“ شیردل کی والدہ نے دریافت کیا مگر وقار الحق نے کوئی جواب نہ دیا۔

”آپ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں آپ کو دیکھ کر اپنے چھوٹے بھائی کی یاد آتی ہے وہ لکھنؤ میں ہی رہ گئے۔ آپ جس کسی کے منتظر ہیں دعا ہے وہ جلد آپ سے ملے۔“ ان خاتون نے دل سے دعا دی۔

”آمین۔“ نوابزادہ وقار الحق کے لب ہشتکی سے بے۔

”ہم شاید خود غرض ہوتے ہیں آپا۔ ہم کھونا نہیں چاہتے۔ سو بہت کچھ ہمراہ رکھنا چاہتے ہیں۔ سنبھال کر دل کے بہت پاس۔“ وقار الحق نے آہستگی سے کہا۔ خاتون نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یقیناً ایسا ہی ہے بھیا۔ ہم اپنوں کو لے کر کس قدر متفکر ہوتے ہیں۔ شاید ہم نہیں جانتے کہ ان کو کوئی تکلیف پہنچے۔ ہم آپ کی فکر سمجھ سکتے ہیں۔“ خاتون نے کہا۔

”ہماری زوجہ اور والد صاحب ہیں۔ ہم ان کے منتظر ہیں، ہم ضروری کام سے کرنا مل گئے تھے۔ جب وہیں سے پاکستان کے لیے ٹرین پکڑ لی۔ اب حضور نے دراصل نصیحت کی تھی کہ جیسے ہی پاکستان بننے کا اعلان ہو، ہجرت اختیار کرنا ہم سب کی پروا نہیں کرنا ہم اپنے طور پر سفر اختیار کریں گے۔ سو ہم نے ان کی نصیحت پر عمل کیا اور اکیس نکل پڑے مگر اب پچھتاوا ہوتا ہے کہ اپنے کنبے کے ہمراہ سفر اختیار کرتے تو آج ایسے فکر مند نہ ہوتے۔ ہم اپنے فیصلے پر خود آپ متفکر ہیں۔“ نوابزادہ وقار الحق نے سر جھکا کر کہا۔ لہجہ پچھتاوے سے بھرپور تھا۔ خاتون نے تسلی دی۔

”فکر مند مت ہوں بھیا، آپ جلد اپنوں سے ملیں گے۔ حالات اگر چڑھیک نہیں اور بلوائیوں نے طوفان اٹھا رکھا ہے مگر اچھے کی امید رکھیے۔“ خاتون نے نرم لہجے میں تسلی دی۔

”میں جانے کیوں لگ رہا تھا کہ آپ کچھ متفکر اور کھوئے سے ہیں۔ ہم نے درپردہ آپ کے لیے دعا بھی کی کہ آپ کو یہی مشکل ہے جلد اس کا اختتام ہو۔“ وقار الحق نے سر ہلایا اور آہستہ کی بولے۔

”میں شکر گزار ہیں آپا۔ اللہ پاک کرم کرے اور جلد کوئی اچھی خبر سننے کو ملے ہم روز جا کر نئے اندراج ہونے والوں کی فہرست کو دیکھ رہے ہیں۔ سنا ہے اندراج کا عمل بھی قدرے سست روی سے ہو رہا ہے۔ تعداد غالباً زیادہ ہے سو اس عمل میں تاخیر لگ رہا ہے۔ مگر ہم پر امید ہیں کہ جلد ہم اپنوں کے نام اس اندراج میں درج دیکھیں گے۔“ وقار الحق کا لہجہ پر محبت تھا۔ آنکھوں کی بے چینی صاف ظاہر کر رہی تھی کہ وہ کس درجہ محو انتظار ہیں کس درجہ شدت سے منتظر ہیں۔

”اللہ پاک آپ کی امید پوری کرے آمین۔“ خاتون نے دعا دی۔

”تم آمین۔“

”پاکستان آنے کے لیے بہت سے گھرانوں نے عظیم قربانیاں دی ہیں۔ تاریخ ان قربانیوں کو یاد رکھے گی۔ اگرچہ ہم نے ایک عقیدے اور نظریے کے نام پر بنی ریاست کے لیے جو قربان کیا وہ کم ہے۔ جواب میں جو پایا ہے اس کا کوئی بدلہ نہیں اس ذات پاک کا احسان ہے جس نے اس ریاست کی صورت آزادی نصیب کی مگر نہ ہم انگریزوں کے بعد ہندوؤں کے زیر تسلط ملک میں سانس لے رہے ہوتے۔“ خاتون نے تجزیہ کیا۔ وقار الحق نے متفق ہو کر سر ہلایا۔

”بجائے رہا آپ نے آپا..... بس یہی سوچ کر ہم نے بھی سفر اختیار کیا۔ کنبے کی بھی پروا نہ کی۔ حالانکہ ابھی سوچوں تو اپنا آپ خود غرض لگتا ہے کہ اپنوں کی پروا کیے بنا خود سفر اختیار کر لیا۔ سب کو ہمراہ لے کر چلتے تو بہتر ہوتا۔ اب یہ فکر سانس لینا دو بھر کر دیتی ہے کہ جانے وہ کن حالات سے دوچار ہوں گے کس صورت حال سے گزر رہے ہوں گے۔ جانے کیا مسائل درپیش ہوں گے تاخیر ہو رہی ہے تو کسی باعث نہ ہو رہی ہو سب سے بڑھ کر یہ بات سانس روک دیتی ہے کہ وہ غیریت سے ہوں کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔ کہیں کسی مشکل میں گرفتار نہ ہوں۔“ وقار الحق نے اپنی فکر ظاہر کی۔

”اللہ نہ کرے کہ وہ کسی مشکل سے دوچار ہوں، آپ اچھے کی امید رکھیے کوئی برا خیال دلی میں مت لائیے۔“ خاتون نے سمجھا یا تو نواب زادہ وقار الحق گہری سانس خارج کر کے رہ گئے آنکھوں سے بے چینی ہو رہی تھی۔



حظ وصول کی تمنا  
آرزوؤں کی قطار  
عشق بے پروا  
کرتا ہے ساز باز  
رکھتا ہے باندھے ساتھ ساتھ  
کرتا ہے سفر ساتھ ساتھ  
چلتا ہے ہر پل ساتھ ساتھ  
موڑ دیتا ہے ہر راستہ اپنی طرف  
باندھ دیتا ہے اپنے ہمراہ  
چاند سے کرتا ہے ذکر رات بھر  
حظ وصل کی خواہش نہ  
کوئی تمننا اور کوئی



دل خود آپ مقابل ہے  
کیا کہا جائے خود کے خلاف  
عشق بے پرواہ  
کرتا ہے ساز باز

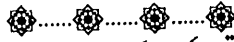
”جہانگیر بیٹا ایسی چپ کیوں، طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ کرم دین چاچا نے دریافت کیا تو جہانگیر نے سر ہلایا۔

”جی چچا جان ہم ٹھیک ہیں بس دل کچھ درد سے بوجھل ہے۔ ہم حوادث زمانہ پر حیران نہیں مگر جو ہو رہا ہے وہ بہت بے حسی ظاہر کر رہا ہے جیسے انسانیت مر گئی ہے۔ باپ اپنی بیٹیوں کو موت کی نیند سلائے پر مجبور ہے کیونکہ وہ ان کی عزتوں کو پامال ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ انسان بھٹرایا بن گیا ہے اور نوج نوج کر کھانے لگا۔ یہ کیسی انسانیت ہے جو پل میں مر گئی ہے؟ یہ کیسا انسان ہے جو اپنے لوگوں کو نوج رہا ہے؟ فقط اس لیے کہ زمین کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ زمین کے ٹکڑے انسانیت سے بڑھ کر ہیں کیا، گویا زمین نے انسان اور انسانیت کو ازراں اور ناپید کر دیا۔ انسانیت موت کی نیند سو گئی اور انسان شیطان بن کر دندانے لگا، یہ کیا تاریخ لکھی جا رہی ہے، ہمیں کس نام سے یاد رکھا جائے گا، کس حوالے سے پکارا جائے گا، انسانوں کو کوئی احساس نہیں؟“ جہانگیر جذباتی انداز میں بولا تو کرم دین چاچا نے بے بسی سے سر ہلایا۔

”درست فرماتے ہو بیٹا، مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ناہم دوپٹے پھینتے ہاتھ روک سکتے ہیں نا تو پنچے سے باز رکھ سکتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب کسی کو کسی کی کچھ خبر نہیں۔ دیکھتا کون ہے اور کس مشکل میں ہے کون کن حالات سے گزر رہا ہے۔ کوئی کرے بھی تو کیا کرے؟ ہم نہتے کسی کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ موت کا ڈر بڑا ہے کوئی کسی کی موت نہیں مرنے چاہتا اور مر بھی جائے تو کیا فرق پڑے گا۔ طاقت کے زور پر مار کر ان کو کرنا تو وہی ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ ان میں انسانیت ہوتی تو ایسا کرتے؟ یہ دہشت ہے سزا دی جا رہی ہے ہجرت کی مذہبی اختلاف..... نظریاتی اختلافات..... انسان کئی حصول میں بٹ گیا ہے۔ ان حصول میں انسان باقی نہیں بچا..... نہ انسانیت اب کوئی ڈھونڈے تو کیا ڈھونڈے؟“ کرم دین چاچا نے اپنی رائے دی۔ ان کا لہجہ ہی دہی تھا۔ آیت نے کتاب پڑھتے ہوئے ان دونوں کی گفتگو کو بخور سنا وہ جہانگیر کی سوچ سے متاثر ہوئے بنانہر سکی۔

”ہم تاریخ کے سیاہ ترین وقت سے چپ چاپ بننا احتجاج کیے گزر رہے ہیں کرم دین چاچا یہ ہمارا جرم شمار ہوگا۔ بلوائیوں کو طاقت ہماری خاموشی دے رہی ہے اب ہمیں لگ رہا ہے ہم نے ہندوستان سے ہجرت کر کے شاید بکھوڑے والا کام کیا ہے۔ ہمیں وہاں رک کر ایک منظم فورس بنا کر لوگوں کو ہجرت کرنے میں مدد کرنا چاہیے تھی۔ شاید ہماری اس کوشش سے کم نقصان ہوتا یا کئی گھرانے محفوظ رہ سکتے۔ دکھ اس بات کا نہیں کہ بلوئی ایسا کر رہے ہیں۔ بلوائیوں کی آڑ میں کئی اپنے بھی شب خون مار رہے ہیں۔ مجھے ایک بزرگ کی زبانی سن کر بے حد شرم آئی کہ انہوں نے اپنے داماد کے ہاتھوں اپنی چھوٹی بیٹی کو لے لیا برو ہوتے دیکھا۔ داماد نے بیوی اور سرس کو کمرے میں بند کر دیا تھا۔ تیرہ برس کی بچی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور پھر کنویں میں پھینک دیا اور کہہ دیا کہ جانے کس نے ایسا کر دیا۔ الزام بلوائیوں کے سر لگانے سے کیا ضمیر ملامت نہ کرے گا؟ فقط بلوئی نہیں جو قیامت ڈھا رہے ہیں وقت یہ ہے جس میں لوٹ کھسوٹ بچی ہے اور جس کو موقع مل رہا ہے، ہتی گڑگا میں ہاتھ دھو رہا ہے۔ جیسے کوئی کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔ یہ کیسا وقت ہے جس میں اپنا ہی اپنی حرمت کا پاس بننے سے انکاری ہے؟ چچا جان ہم کیوں یہ سب دیکھنے کو باقی ہیں اس وقت ہم کسی کے ہاتھ کیوں نہیں روک رہے۔ کس کو زیادتی کرنے، قتل و غارت گری کا بازار کرم کرنے سے روک کیوں نہیں رہے، کسی کے

ہاتھ کیوں نہیں پکڑ رہے، کسی کا رستہ کیوں نہیں روک رہے، ہمارا خاموش رہنا کسی کی ہمت بڑھاتا ہے ناں، تو ہم خاموش کیوں ہیں، ہجرت ایسی ہوتی ہے، ایسی انسانیت سوز؟ ان لوگوں نے ہجرت کو داغ لگایا ہے۔ انسانیت کو مجروح کیا ہے۔ موقع کا فائدہ اٹھایا ہے ایک تقسیم کے عمل کو نسخ کر کے پیش کرنے کا جرم کیا ہے۔ انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہجرت ایک ظلم ہے سو دوبارہ ہجرت نہ کی جائے نہ تقسیم کے متعلق سوچا جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نظریات کا مذاق بنا رہے ہیں انسانیت کو اغدار کر کے اپنے فائدے اٹھا رہے ہیں۔ ہم سوچ کر شرمندہ ہیں ان کو ملال نہیں یہ کیا کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے اپنے رب کو جواب دہ نہیں ہونا؟ ”جہا نکیر سخت طیش میں تھا آیت کتاب چہرے کے سامنے سے ہٹا کر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جہا نکیر کو یکدم احساس ہوا تو وہ خاموش ہو گیا اور گردن پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ غالباً وہ ایسی گفتگو ایک خانوں کے سامنے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نازیبا واقعات اور الفاظ وہ کسی دو شیزہ کے روبرو ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ کوئی اسے سن رہا ہے۔ اگر ہوتا تو شاید وہ اس ضمن میں ایک حرف نہ کہتا۔ آیت نے اس کے چہرے پر عجب عجلت بھرے تاثرات دیکھے تھے وہ شخص اخلاقیات کا پابند دکھائی دیتا تھا وہ جانے کیوں جہا نکیر کی سمت دیکھتا رہا تھا۔



سیاہ چادر سے چہرہ چھپاتے ہجوم کو چیرتی ہوئی وہ آگے بڑھی اور اندراج کرنے والے تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ہجوم اس قدر تھا کہ راستہ نہ مل رہا تھا اور وہ آگے بڑھنے کی ہر راہ مسدود پارہی تھی۔ کوشش کر کے وہ آگے بڑھے مگر اس کوشش میں نقاب اس چہرے سے سرک گیا اور وہ جو فاصلے پر کھڑا تھا حیرت سے ششدر رہ گیا۔ چہرہ مسخوں سے شدید زخمی تھا۔ کیا یہ وہی چہرہ تھا اسے پہچاننے میں دقت ہوئی۔ یکدم نگاہوں میں وہ دلکش اور رعنائی سے بھر اچہرہ آن اتر۔ جو خوب صورتی میں یکتا اور بے مثال تھا کیا یہ وہی چہرہ تھا جو آنکھوں کے رستے دل میں اترتا تھا جیسے وہ دیکھتے نہ تھکتے تھے۔

”نہیں..... یہ..... وہ چہرہ نہ تھا.....“ وہ خود آپ انکاری ہوئے۔ ماننے کو دل مائل نہ ہوا، یہ وہ چہرہ کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ چہرہ تو یکتا و بے مثال خوب صورتی سے بھرا تھا، اس سے زیادہ حسین چہرہ آنکھوں نے دیکھا نہ تھا۔ خوب صورتی ایسی کہ نگاہ خیرہ کر دے۔ دھڑکنیں روک دے وقت ساکت کر دے یہ چہرہ وہ چہرہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس کو دیکھنے سے نہ وقت تھا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی خاص کشش نہ دکھائی دی مگر وہ آنکھیں۔ وہ آنکھیں جوان کی طرف بغور تیک رہی تھیں ایک شناسائی کا پتا دیتی تھیں۔ وہ اس شناسائی کو چاہتے ہوئے بھی نظر انداز نہ کر سکتے تھے۔ نگاہ کہتی تھی کہ گہرا ربط تھا۔

”نہیں یہ وہ نہیں۔ شاید اس کا کوئی پرتو تھا۔“ وہ پلٹے اور قدم اٹھائے اور دور ہٹنے لگے۔

”نوا بزاہہ۔“ کسی نے بے قراری سے پکارا۔ وہ آواز، وہ لہجہ نظر انداز کرتے تو کیسے، یہ آواز بھولنے والی کہاں تھی۔ یہ لہجہ ساعیتیں کہاں بھول سکتی تھیں، یہ فاطمہ ناظم الدین کی آواز تھی۔ وہ بے اختیار پلٹے اور فاطمہ بی بی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

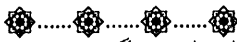
(باقی ان شاء اللہ سہ ماہ)





تمہارے ساتھ ہی موسم بھی رخ بدلنے لگے  
ہوا تھمی ہے تو بارش کے تیر چلنے لگے  
رہ حیات میں یوں تم نے میرا ساتھ دیا  
کہ جیسے چاند مسافر کے ساتھ چلنے لگے

ایک دن پہلے جب خوشیوں بھرا فون آیا تھا، جس نے شیز کے دل کے موسم کو یکسر بدل دیا خزاں پر بہار چھا گئی تھی۔ کیوں کہ اس کا دلبر، اس کا محبوب، اس کی چاہت، آج رات کی فلائٹ سے امریکا سے وطن واپس لوٹ رہا ہے۔ پیار کر کے ہار جانا، پیار نہ کرنے سے بہتر ہے، ایک طرفہ چاہت بے لوث ہے اور بدلے میں کچھ نہیں ملتی تو کندن بن جاتی ہے اور عشق کے درجے تک پہنچا دیتی ہے، اس کی زندگی کے ایک لمحے نے محبت کا ایسا ہی ذائقہ شیز الملک کے منہ میں گھول دیا تھا جو منہ سے چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اسی لیے وہ کئی امتحانوں سے گزرنے کے بعد بھی ثابت قدم رہی مگر وجود میں اڑتی تیلیوں نے احساس دلایا کہ شاید جزا ملنے کا وقت آن پہنچا ہے۔



شیز الملک ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی تو سوچا کیوں نا تیار ہو جائے۔ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔  
”کیا..... پہنوں؟“ وارڈ ورہ کھول کر تلاشی لگا ہوں سے نکلے گی، ادھر ادھر دیکھا اور پھر ہاتھوں سے

یاد تمہاری آئی، موسم نے لی انگڑائی اور رت بدل دی، فضاؤں میں رنگ سے بکھرنے لگے ہر سو ہر جا بہار ہی بہار، پھول ہی پھول مسکراتے محسوس ہوئے اور شیر الملک کو تو جیسے کسی نے زندگی لوٹا دی تھی۔ اس کے توکل سے پیر ہی زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، وہ تو گویا بالوں پہ چل رہی تھی، اتنی بڑی خوشی جو ملنے والی تھی۔ اس نے فون کر کے ایک ایک کو یہ خبر سنائی جو خود اس سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ وقت تھا کہ جیسے قسم سا گیا تھا گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا، ماسی کے ساتھ لگ کر پورے گھر کی صفائی کروائی، خاص طور پر اپنے کمرے کی حالت درست کی جو پچھلے کئی دنوں سے انتہی کا شکار تھا پھر کچن کی طرف چل دی، اس کی بھوک تو اڑ گئی تھی، بس ایک کپ گرما گرم چائے کا بنا کر پیاد اور پھر بڑے دل سے ابراہن ملک کے پسند کی کئی قسم کے کھانے پکائے، روٹی شام کو تازہ پکے کا سوچا اور آٹا گوندہ کرفرنج میں رکھ دیا، لاؤنج کی طرف آئی تو بے ساختہ گھڑی کی طرف نگاہ گئی، اتنا کام کرنے کے باوجود ابھی صرف چار بجے تھے جبکہ ابراہن کو رات دس بجے پہنچنا تھا، وقت تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

چھو کر نرمی محسوس کرتے ہوئے ابراز کی لائی ہوئی گلابی شیفون کی ہلکے کام والی ساڑھی نکال لی۔

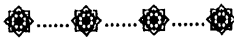
”یہ ٹھیک رہے گی۔“ اس نے آئینے کے سامنے خود سے لگا کر چیک کیا اور مطمئن ہو کر کرسی پر پھیلا کر رکھ دی۔ اس کے بعد نہانے چلی گئی، واپس آئی تو پہلے ڈرائیئر سے لمبے گھنے بالوں کو سکھایا اور پھر کتنے دنوں بعد سنگھار کا سوچا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے آئینے میں خود کو بہت توجہ سے دیکھا تو سوچا کہ ایک دم سے اتنی حسین کیسے ہو گئی۔ خود کو پہچاننا مشکل ہو رہا ہے۔ شاید وہ ستم گر مہربان ہونے والا تھا۔

”شکر ہے میرے مالک..... تو نے میری لاج رکھ لی۔“ بے ساختہ آنکھوں میں اُمڈ آنے والی نمی کو انگلی سے پونچھا۔

اف یہ خوشی اسے سنبھالی نہیں جا رہی تھی، کیسے اپنی سرشاری، دل کی خوشی کو سب سے چھپائے۔ وہ ساڑھی اٹھائے کپڑی بند لے کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ساڑھی پہن مگر باہر نکلی تو گویا اس کی حجب ہی نرالی ہو گئی۔ شیزا نے مسکراتے ہوئے کانوں میں سنہری آدیزے پہنتے ہوئے، آئینے میں ایک بار پھر اپنا عکس دیکھا، چہرہ شرم سے گلابی ہو رہا تھا یہ سوچ کر ہی گھبراہٹ طاری ہونے لگی کہ وہ اتنے دنوں بعد ابراز ملک کا سامنا کیسے کرے گی۔ اس کے ہجر میں گزرے دو مہینے کیسے گزرے، اس کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔

شیزا نے تو اس کو امریکا بھیج کر زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلا تھا۔ وہ بہت بہادر تھی ہارنے سے بالکل نہیں ڈرتی بس ابراز ملک کو کھونے کا ڈر اس کے دل میں چھپا بیٹھا تھا مگر ڈاکٹر کے مطابق اس کے اندر کی تنہائی اور خوف کا حل شاید وہیں تھا، شاید وہاں اس کے زخموں کا مرہم دستیاب ہوگا۔ اسی وجہ سے اس نے خاموشی سے ابراز کا دیرینہ اہلائی کیا، ملک، بخویا اور اس کا بیگ تیار کر کے امریکا جانے کی التجا کی۔



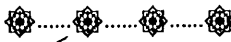
شیزا اپنے تئیں یہ سوچے بیٹھی تھی کہ اس کے بغیر تھوڑے سے دن بھولت سے کٹ جائیں گے گزرتو گئے مگر اتنے مشکل ہو جائیں گے، اس کا اندازہ شیزا کو پہلے بالکل بھی نہیں تھا۔ ابراز کے جانے کے بعد اس کا دن تو معمولات زندگی نمٹانے میں گزر رہی جاتا مگر رات بڑی بھاری ثابت ہوئی۔ ابراز کے بناء سائیں سائیں کرتا خالی کمرہ اسے کاٹ کھانے کو دوڑاتا، وہ لیٹ کر تکیہ میں منہ چھپا لیتی اور روتے ہوئے ابراز کو زور زور سے پکارتی مگر خود سے کیے گئے عہد کی پابندی کرتے ہوئے ایک بار بھی فون کر کے اس پر لوٹنے کے لیے زور نہیں دیا تھا۔ وہ صبر سے منتظر تھی کہ کب وہ اپنی خوشی سے واپسی کا سوچتا ہے۔ اب جبکہ اس نے خود سے فون کر کے اسے واپسی کا عندیہ دیا تو وہ خوشی سے پاگل ہو اٹھی تھی۔ وجود میں توانائی کی ایسی لہر دوڑی کہ وہ ایک ساتھ سارے کام نکال کر بیٹھ بیٹھی۔ خوشی کے مارے ویسے ہی پچھلی رات نیند نہیں آئی تھی، اب جو فراغت نصیب ہوئی تو اس پر تھوڑی سی تسکین سوار ہونے لگی اور وہ لاؤرنس میں رکھی آرام دہ کرسی پر براہمان ہو گئی جس پر بیٹھ کر ابراز اخبار پڑھا کرتا تھا۔ کرسی پر جھومتے ہوئے، خیالوں کی رو جھٹکتے ہوئے

ایک بار پھر ابراز اور اس کی ازدواجی زندگی کی طرف مڑ گئی جو عام شادی شدہ جوڑوں سے بہت ہٹ کر تھی۔ شیزا ملک نے اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے کتاب زندگی پھر سے پڑھنا شروع کر دی جس میں چونکا دینے والی باتیں مخفی تھیں۔

اس دن شیزا ملک نے بلیو شیفلون کا اسٹاکش سا سوٹ زیب تن کیا اور بلکے میک کے ساتھ گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگائی تھی۔ نفیس پرفیوم کا چھڑکاؤ کیا تھا شاید ہلکی مہک سے طبیعت پر طاری ٹھکان دور ہو جاتی۔ گھنے بالوں کی آرائش کرنے کے بجائے سمیٹ کر اونچے سے جوڑے کی شکل دے دی۔ تقریب کا وقت رات آٹھ بجے تھا مگر اسے اپنے بیٹوں کی بے چینی اور جوش و خروش

کی وجہ سے گھر سے جلدی نکلنا تھا۔ دراصل اس کی چھوٹی بہن عیناں کے بیٹے کی سالگرہ تھی اور اس کے بیٹوں اور بہن کے بچوں میں بہت دوستی تھی، اسی وجہ سے وہ ہر وقت خالہ کے گھر جانے کو بے چین رہتے مگر شیزا ابراز کے مزاج اور اپنی ذمہ داریوں کو نمٹانے کے چکر میں پورے مہینے بعد ہی بہن سے مل پاتی تھی۔ اس وقت تو وہ ابراز ملک کی آمد کی منتظر تھی اس کے بعد ہی وہ لوگ گھر سے نکل پاتے۔ وقت کی بچت کے لیے اس نے وارڈ روب کھولی اور جلدی سے شوہر کی استری شدہ بلیو شرٹ اور بلیک پینٹ نکال کر کمرے میں ٹانگ دی تھی۔ اس کے بعد بچوں کو پیار سے سمجھانے لگی جو اس کی تیاری کے دوران کوئی دس بار پوچھ چکے تھے۔

”ممما..... آئی کے گھر کب چلیں گے؟“ ان کی معصومیت پر اس نے دونوں کے گال چوم لیے جنہیں جلدی جا کر اپنے کھیلنے کی فکر ہلکان کیے دے رہی تھی۔ ادھر شیزا کا دل ابراز ملک کو اپنے میکے کے فکشن میں لے جاتے ہوئے ہمیشہ کی طرح ڈر رہا تھا کہ کہیں پھر سے کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے اور اس کا موڈ آف ہو جائے۔



ابراز ملک کو دفتر سے آنے کے بعد کہیں جانے میں بہت آکسی ہوتی اس وقت اگر اس کا اپنا کوئی ذاتی کام ہوتا تو شاید وہ کسی قیمت پر گھر سے نہ نکلتا، تاہم اسے لوگوں کی خوشی اور غم میں نہ چاہتے ہوئے بھی شرکت کرنی پڑتی تھی اور لوگ بھی وہ جو پرانے نہیں اس کے قریبی عزیز تھے۔ ویسے بھی انکار کرتے ہوئے ہمیشہ سامنے دو معصوم بچوں کا چہرہ آجاتا جن کا اپنی خالہ کے گھر جانے کی بے تابی ایک دن پہلے سے عروج پر جا پہنچی تھی۔ ویسے تو ابراز ملک شروع سے ہی بھیڑ بھاڑ اور ہجوم سے بھاگتا تھا مگر کچھ دنوں سے کچھ زیادہ ہی تنہائی پسند ہو گیا تھا۔ حالات زندگی نے اسے حساس، زور درج اور تنگ مزاج بنا دیا تھا، زندگی کے محاذ پر لڑتے ہوئے وہ

داخل ہوئے۔ بڑا سا کڑھائی والے حسین شیون کے دوپٹے کا نیلا آٹچل شانے پر پھیلائے پیچھے پیچھے شیزا ملک مسکراتی ہوئی اندر آئی اور اپنی ماں خدیجہ بیگم کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ خدیجہ بیگم تخت پر براجمان آنے والے مہمانوں کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہتے ہوئے ساتھ پھولوں کا گجر اتھار ہی تھیں۔

”آگئی میری بچی۔“ بڑی بیٹی کو دیکھ کر ان کا چہرہ کھل اٹھا، اس کا ہاتھ چوم اور جھانک کر پیچھے آتے داماد کے سلام پر مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر خیریت پوچھی۔

عیناں نے گھر میں ہی چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا تھا مگر بہت دنوں بعد شیزا نے فیملی والوں کے ساتھ خوب انجوائے کیا تھا۔ کھانا اور کیک بہت مزیدار تھا۔ کھانے کے بعد قہوہ پیتے ہی ابراز کو بے چینی محسوس ہوئی، اس نے شرٹ کا اوپری بٹن کھولا اور بیوی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ صبح اس کو کام پر جانا تھا، بچوں کا اسکول تھا۔ اس کے باوجود میکے کی تقریب تھی، شیزا کا دل ابھی مزید رکنے کو مچلنے لگا مگر اس نے ہمیشہ کی طرح مسکرا کر سر ہلایا اور بچوں کو آواز لگائی۔

”ابھی..... نہیں جانا..... ہمیں کھیلنا ہے۔“ وہ دونوں انکار میں سر ہلانے لگے۔

”چلو..... سمجھ میں نہیں آ رہی ایک دفعہ کی بات۔“ وہ خفگی سے دونوں جڑواں بیٹوں کا ہاتھ تھام کر گھسیٹتے ہوئے بولی۔

”کیا..... آپو ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“ عیناں مہمانوں کے بچ سے نکل کر اس طرف آئی اور ناراضی دکھائی۔

”بس..... وہ صبح بچوں کا اسکول ہے۔“ شیزا نے کہا۔

”افہ..... آپ صرف آپ کے بچے ہی پڑھنے والے ہیں کیا اور کون سا یہ یونیورسٹی جاتے ہیں۔“

”ویسے بھی میں سب سمجھتی ہوں۔“ اب کی بار اس کی

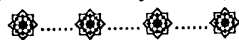
کامیابیوں کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا نمایاں مقام تک تو پہنچ گیا تھا مگر اب تھوڑا ٹھکنے لگا تھا۔ قسمت نے ایک معاملے میں اس کے ساتھ ہاتھ نہ کیا اور ایسی شریک حیات ملی جو دکھوں پر مرہم ثابت ہوئی اور بناء کچھ کہے اس کی ذمہ داریوں کا آدھے سے زیادہ بوجھ اپنے نازک کاندھوں پر اٹھائے پھرتی تھی۔ خاص طور پر جب سے ابراز ملک نے شیزا کو شادی کی سالگرہ پر نئی گاڑی خرید کر تحفے میں دی اور اس نے چند ہفتوں کی کلاسز کے بعد ڈرائیونگ لائسنس بھی لے لیا تو آنے جانے کے لیے شوہر کی محتاجی بھی نہ رہی۔ اتنا کچھ دینے کے بعد اب وہ جو کچھ کھوں کے لیے اپنی خوشی کے لیے اس پر انحصار کیے ہوئے تھے، ان سب کا دل توڑنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔ اپنے اندر اتنی ناگواری پر قابو پاتے ہوئے وہ لباس تبدیل کرنے کے بعد باہر نکلا تو سرد در سے پٹا جا رہا تھا، ابھی برش سے بالوں کو سنوارا ہی تھا کہ ایسے میں ہلکی سی دستک ہوئی۔

”آ رہا ہوں..... بھئی۔“ وہ سمجھا جانے کے لیے بلایا جا رہا ہے زور سے کہا مگر قدموں کی چاپ اپنے پیچھے محسوس ہوئی۔

”بس میں تیار ہوں۔“ ابراز ملک نے مڑ کر چہرہ پر شگفتگی طاری کرتے ہوئے بیوی سے کہا۔

”اپنی..... پہلے..... یہ چاہے پی لیں۔“ شیزا نے نازک ہاتھوں میں تھام گ آگے بڑھایا تو ابراز کو اپنی بیوی پر بے تحاشہ پیار آیا۔ وہ بن کیے اس کی بہت ساری ضرورتوں کو پتا نہیں کیسے جان جانی مگر اس معاملے میں وہ کورائی رہا تھا۔

”اوہ..... تھیں گس جان۔ خوش رہو پھولو پھلو..... سدا سہاگن رہو۔“ اس نے گت تھامتے ہوئے جان بوجھ کر مزاحیہ انداز اختیار کیا مگر شیزا نے دل سے آمین کہا۔



”نانو..... ہم آگئے۔“ سنی اور ہنی ہاتھوں میں گفت اٹھائے تیزی سے خالہ کے گھر میں شور مچاتے ہوئے

طنز یہ نگاہیں بہنوئی کی طرف اٹھیں۔  
 ”بھئی..... کیا سمجھتی ہیں ہماری سالی صاحبہ؟“ ابراز  
 نے ماحول گرم ہوتا دیکھا تو چہرے پہ زبردستی کی  
 مسکراہٹ سجا کر پوچھا۔  
 ”یہ ہی کہ آپ ہمارے اماں بابا کے انوکھے داماد ہیں  
 جن کا بالکل دل نہیں لگتا سسرال میں۔“ سدا کی منہ  
 پھٹ عیناں نے صاف گوئی کی انتہا کر دی۔ ابراز کا چہرہ  
 ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔  
 ”کیا تک رہی ہو..... انہوں نے کچھ نہیں کہا میں  
 خود بہت تھک گئی ہوں۔“ ہمیشہ کی طرح شیراز شوہر کی مدد  
 کو آگے آئی۔

”تم بھی ناں آپو..... چلو ٹھیک ہے مگر اس سنڈے کو  
 ہم سب بابا کے گھر منع ہو رہے ہیں..... یاد ہے ناں۔“  
 ”ہاں..... ہاں۔“ شیراز غصے میں بولی۔  
 ”چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ آپ لوگ نا بھی  
 آئیں تو بچوں کو چھوڑ دیجیے گا۔“ اس نے ہار مانتے  
 ہوئے بہن کو نئے امتحان میں ڈالا۔  
 ”اچھا..... پوری کوشش کروں گی ابھی تو اجازت  
 دو۔“ شیراز نے سہولت سے مسکرا کر کہا اور شوہر کے پیچھے  
 لپکی جو لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا تھا۔  
 ”اماں سے مل کر جانا ورنہ ہلوتی رہیں گی۔“ پیچھے  
 سے بہن کی نصیحت کانوں میں پڑی تو وہ ناچار ماں سے  
 ملنے لاؤنج کی طرف بڑھ گئی، ابراز کو نہ چاہتے ہوئے بھی  
 بیوی کے پیچھے ساس کو سلام کرنے آنا پڑا تھا۔

.....  
 ”ٹھیک ہے اماں پھر میں چلتی ہوں۔“ ماں کے  
 قریب ٹہر کر اجازت طلب کی۔  
 ”آئے ہائے تم تو ہمیشہ..... ہوا کے گھوڑے پر سوار  
 رہتی ہو۔ اب ایسا بھی کیا؟ ابھی تو مہمان بھی نہیں  
 گئے۔“ ان کے لہجے میں ناگواری اتر آئی۔  
 ”اماں..... پھر آؤں گی ناں۔“ اس نے ماں کا ہاتھ  
 دباتے ہوئے تسلی دی۔

.....  
 ”اماں..... پلیر آپ کیا بے وقت کی راگنی چھیڑ کر  
 بیٹھ گئی ہیں۔“  
 ”وہ تو تمہاری دادی ساس سے جان چھوٹ گئی ورنہ  
 زندگی اور مشکل بنی ہوئی تھی۔“  
 اماں..... مرحوم کو تو بخش دیں۔“  
 ”ہاں..... انہوں نے بھلے زندہ لوگوں کو مار دیا تھا۔“  
 ”اب میں چلوں؟“  
 ”اچھا ابھی جاؤ جاؤ..... جہاں رہو خوش رہو۔“  
 خدیجہ بیگم نے بیٹی کے تیور بدلتے دیکھا تو گھبرا کر اسے  
 جانے کا اشارہ کیا۔  
 ”اچھا بیٹا ابراز سے کہنا..... گاڑی ذرا دھیان سے  
 چلائیں..... اللہ کی حفاظت میں۔“  
 ”جی امی..... اللہ حافظ۔“ وہ کہہ کر بیٹوں کے ہمراہ  
 پوریج میں آگئی جہاں گاڑی اشارٹ کے لیے ابراز ان لوگوں  
 کے منتظر تھے۔ شیراز چپ چاپ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی اور

اس نے تیزی میں گاڑی بھگائی۔  
کچھ نہ کرتے ہوئے بھی وہ ایک پار پھر ابراز کی

نگاہوں میں مجرم بن گئی تھی۔ وہ شوہر کو سمجھتی تھی اسے پتا تھا کہ وہ اوروں سے مختلف مزاج رکھتا ہے مگر یہ بات وہ سب کو نہیں سمجھا سکتی تھی، وہ اماں کے گھر جا کر اکھڑا اکھڑا سا رہتا حالانکہ اس کے میکے والے دوسرے دامادوں کے مقابلے میں ابراز کو اپنیشنل پروڈیوٹر بھی دیتے تھے تب بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ اس کا موڈ آف ہو جاتا۔ شیزا نے سرد آہ بھرتے ہوئے کارڈ رائیٹر کرتے ابراز کے وجہ چہرے کو نکا جس پر چھائے ہوئے اجنبی تاثرات اسے اندر ہی اندر زخمی کیے دے رہے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ اب دو چار دنوں تک ابراز ملک پر خاموشی کا دورہ پڑے رہے گا، وہ گھر سے یوں لاتعلیق ہو جائے گا جیسے ان کے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔

”زندگی کے امتحان کب ختم ہوں گے؟“ شیزا نے منہ موڑ کر کھڑکی کے پار بھاگتے ہوئے نظاروں پر نگاہیں جمائیں مگر آنکھوں میں آنے والے پانی کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دیا۔

ابراز ملک کے چلتے ماضی کی راکھ اڑا کر اس کی آنکھوں میں آ جاتی تھی۔ بار بار منظر دھندلا رہا تھا مگر وہ مضبوط بنی بیٹھی رہی، اس کی محبت تو راجی کا جیبال بنتی جا رہی تھی مگر کیا کرے اس کے بغیر گزارا بھی نہ تھا۔

گھر واپسی تک اس کا موڈ آف ہی رہا۔ کارپورج میں کھڑکی کی اور خاموشی سے اتر کر اندر چل دیا۔ شیزا تھک کر چور ہو گئی تھی۔ سنی برابر والی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ ہنی بیک سیٹ سے ٹیک لگائے ماں کی گود میں چڑھنے کو تیار تھا ایسے میں بچوں کو اٹھانے کے لیے اس کی ضرورت تھی مگر وہ بیگانہ بنا اندر چلا گیا تھا۔

شیزا ملک نے بڑی مشکلوں سے بچوں کو کمرے تک پہنچایا اور شب خوابی کا لباس بدلوانے کے بعد بیڈ پر لٹایا۔ تھکے ہوئے تھے فوراً ہی سو گئے۔ شیزا نے ان کے معصوم

چہروں کی طرف دیکھا تو قدرے پرسکون ہوئی۔ کمرے کی لائٹ آف کر کے باہر نکل آئی تھی۔

شادی کے شروع دنوں میں ابراز کے مزاج کے چلتے بچتے فتنے اسے بہت اذیت پہنچاتے تھے مگر اس نے خود کو آخر کار سمجھ لیا تھا۔ دل کو یہ خیال مضبوط کرتا تھا کہ وہ جیسا بھی ہے صرف اس کا ہی ہے مگر اس کے ناراض ہو جانے پر وہ ماہی بنے آب کی طرح تڑپتی رہتی۔ محبت کا جواب اگر محبت سے ملے تو بہت اچھا ہوتا ہے، محبت اسی وقت بنتی ہے جب دوطرفہ ہو۔ جوتن ہو جائے تو کیا ہی بات ہے، بد قسمتی سے محبت ایک طرفہ ہو تو تکلیف دہ اور رنجیدہ کر دیتی ہے۔ وہ خود بھی اس خیال سے لیٹ گئی کہ ذرا سا آرام کر کے اطراف کا جائزہ لے لی مگر کس وقت آنکھ لگی اسے کوئی ہوش نہ رہا تھا۔ جیسے مسلسل رت جکوں کے بعد نیند مہربان ہو جائے۔

صبح ناشتہ کرتے ہوئے اس کا دماغ گھوما ہوا تھا۔

”تمہیں..... اسد یاد تو آتا ہوگا؟“

”کون اسد؟“ وہ چونک کر چائے نکالنا بھول گئی۔

”ظاہر ہے میں تمہارے چچا زاد کی ہی بات کر رہا ہوں۔ وہ ایک ہی تو منگیتر تھا ناں تمہارا۔“ ابراز نے سلاکس کو بے دلی سے کھاتے ہوئے منہ بنایا۔

”ابی..... اگر وہ یاد آنے والی چیز ہوتا تو میں مگنی توڑ کر آپ سے شادی نہیں کرتی۔“ شیزا نے اس کے مضبوط ہاتھوں کو اپنے نرم ہاتھوں میں دبا کر محبت بھری تسلی دی۔

”سچ بول رہی ہوں نا؟“ ابراز نے مشکوک انداز میں بیوی کو دیکھا۔

”کیا ہو گیا ہے ابی..... اپنی بیوی پر شک کر رہے ہیں۔“ وہ کھسائی سی ہنسی کر دھر دھر دیکھنے لگی۔

”تم..... بھی مجھے چھوڑ کر کہیں چلی تو نہیں جاؤ گی؟“

اب اس کے دماغ میں ایک اور شک ابھرا۔

”ہماری شادی کو دس سال ہو گئے، ابھی تک گئی کیا؟“ شیزا پر بھی جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی، حالانکہ



جانتی تھی کہ نفسیاتی امراض کے معالج نے سمجھایا تھا کہ جب کبھی بھی ابراز پر ایسا فیئر آئے تو وہ بڑی نرمی سے اسے ڈیل کرے مگر وہ بھی انسان تھی کبھی کبھی تھک جاتی تھی۔

”اچھا..... اگر وہ تم کو اچھا نہیں لگتا تھا تو اس سے متکلفی کیوں کی تھی؟“  
”نہیں اسدا مجھے تھے۔“

”اچھا..... تو پھر کیا ہوا؟“ ابراز نے خٹکی سے پوچھا۔

”مگر مجھے آپ سے محبت ہو گئی تھی ناں ابی۔“ وہ جانتی تھی کہ لاشعوری طور پر ابراز یہی سننا چاہتے تھے۔  
”اچھا..... ٹھیک ہے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے چائے کا سب لینے لگا۔

”ویسے تو تم مجھے کبھی چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی ناں؟“ اچانک کپ ٹیبل پر پٹختے والے انداز میں رکھنے کے بعد اس نے شیراز کو گھورا۔

”میں نہیں نہیں جارہی۔“ شیراز نے اس کے قریب کھڑے ہو کر بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی۔  
وہ لمبا چوڑا مرد آنکھیں بند کیے یوں سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے اپنی پسندیدہ شے کھونے کا خوف سوار ہو، تھوڑی دیر تک اس کی بڑبڑ جاری رہی اور پھر میکا نیکی انداز میں بچوں کو اسکول چھوڑنے چلا گیا۔

شیراز کو پتا تھا کہ اب جب وہ لوٹے گا تو سب کچھ بھول کر نارمل ہو گیا ہوگا، ویسے ہی جیسے اس نے یونیورسٹی میں اسے پر پوز کیا، ہاتھ پکڑ شادی کی التجا کی اور وہ اس کے سحر میں مبتلا ہو کر اپنے گھر والوں کے سامنے ڈٹ گئی تھی، ایک اعصاب شکن جنگ لڑنے کے بعد جب سب مان گئے تو ابراز کو یاد بھی نہیں تھا کہ اس نے شیراز کو شادی کے لیے پر پوز کیا تھا۔ وہ صاف مگر گیا تھا۔

”ابی..... سنیں۔“ شیراز نے چکن بوٹی منہ میں رکھتے ہوئے اسے پکارا۔

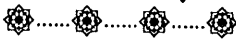
”ہونہہ.....“ وہ چپ چپ سا تھا۔  
”کیا آپ ناراض ہیں؟“ دھیرے سے پوچھا۔  
”نہیں تو۔“

”پھر کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟“  
”یار سوری میری وجہ سے تمہیں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔“ خود احتسابی نے اسے شرمندہ کر دیا تھا تو بیوی سے معافی طلب کی۔

”ابی..... آئی لو یوناں۔“ اس نے جان بوجھ کر اپنی محبت کا احساس دلایا۔

”سچ میں..... میری اتنی غلطیوں کے بعد بھی؟“ زخمی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔  
”محبت ہو تو سب کچھ برداشت ہو جاتا ہے۔“ وہ دل سے مسکرائی، آج وہ دونوں بہت دنوں کے بعد ریٹائونٹ میں ڈنر کے لیے آئے تھے۔

ایک بہت اچھا وقت گزار کر جب وہ گھر لوٹے تو شیراز کا وجود ملکا پھلکا ہو گیا تھا، بچے اپنی چھٹیوں کی وجہ سے نانی کے گھر گئے ہوئے تھے۔ وہ ابراز کی وجہ سے نہیں گئی اسے بیوی کی قربانیوں کا احساس تھا، اسی لیے وہ اس کو لے کر آؤ تنگ پر نکل گیا تھا۔



شیراز ملک اس دن کے بعد سے مزید محتاط ہو گئی تھی، میکے سے آنے والے ہر بلاوے کو نال دیتی یا اکیلے ہی بچوں کو لے کر چلی جاتی۔ اس کے مقابلے میں جب سے عیناں کی شادی ہوئی تھی وہ اپنے شوہر نار کے ساتھ ہر ہفتے ماں کی طرف چکر لگاتی تھی۔ ماں کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود وہ صبر و خاموشی سے وقت گزار رہی تھی۔ وہ اپنی شادی شدہ زندگی میں نئے طوفانوں سے نبرد آزما ہونا نہیں چاہتی تھی اسی لیے اس نے خدیجہ بیگم کو دبے لفظوں میں سمجھانے کی کوشش کی مگر ماں کا دل جب سب بچوں کو اپنے ارد گرد ہنستا کھیلتا دیکھتی تو بڑی بیٹی کے لیے دلی اداس ہو جاتا، جس نے ایک محبت کی خاطر اپنی ہستی بچ نہی تھی۔ شادی کے شروع دنوں میں وہ

# مہنامہ حجاب کراچی

محبت و عزت کی آئینہ نشیں سے ہر دم کا قائل فرماں گویاں

عشق دی بازی

خاندانی رسم و رواج کس طرح لڑکیوں کو باغی کرتا ہے  
ریحانہ آفتاب کے نوک قلم نگلی ایک خوب صورت تحریر

عشق نگر کے ماسٹر

ایک حادثے نے اسے عشق نگر کا ماسٹر بنا دیا  
ندائیں کی دلکش اور مسرتوں یاد رہے جانے والی بھائی

آنگن کی چڑیا

قارئین کے تعارف پر مبنی سلسلہ

عالم میں انتخاب

ہر ماہ ایک شاعر کا انتخاب

اس کے علاوہ

بزمِ سخن کچن کا زرد و ست کا بیفام آئے منتخب  
اشعار غزلیں اقتباسات اور دیگر  
تاریخین کی دلچسپی کے مد نظر مستقل سلسلہ

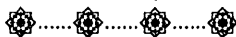
Info@naeyufaq.com

(021)35620771/2

0300-8264242

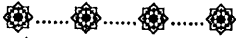
اصرار کر کے ابراز کو امی کی طرف لے آتی مگر اس ناممکن  
بات کا ادراک آہستہ آہستہ شیزا کو ہونے لگا کہ وہ اس کی  
فیملی میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ شاید شادی کے وقت  
ہونے والی چپقلش اور اس کے بابا کا ابراز ملک کے  
ساتھ قدرے جنک آئیز رویہ اس کے دل پر گہری چوٹ  
لگا بیٹھا تھا۔ اس میں صدیقی صاحب کا بھی قصور نہ تھا۔  
بڑے بھائی کو بیٹی کی خواہش پر انکار کرنا سویانہ روح  
ثابت ہوا تھا، خاندان بھر میں ان کی تھوڑھو ہوئی تھی۔ اسی  
وجہ سے وہ ابراز ملک کو شروع شروع میں دامادوں والی  
عزت نہ دے سکے، گزرتے وقت کے ساتھ حالات  
بہتر ہوتے چلے گئے، ہنی سنی کی پیدائش پر توانا نانی اپنے  
نواسوں پر داری صدقے جانے لگے مگر ابراز کے دل پر  
لگی گرہ نہ ٹھل سکی، جس کا خمیازہ شیزا ملک کو بھگتنا پڑتا  
تھا۔ وہ بچکی کے دوپاٹوں میں پسے لگی تھی۔

ویسے بھی ان سب بھائی بہنوں میں بہت پیار تھا۔  
جب وہ سب ایک ساتھ صدیقی ہاؤس میں جمع ہوتے تو  
خوب ہلا گلا مچاتے تو وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا، ایک  
بروکن فیملی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ایسے وقت میں  
اس کے اندر کی ساری حساسیت عود آتی، ایسے ماحول میں  
وہ خود کو مس فٹ محسوس کرتا لا شعوری طور پر یہاں سے  
بھاگنے کے لیے برتنے لگتا مگر صرف شیزا اور بچوں کی  
خوشی کے لیے اندر پھیلی اذیتوں کو چپ چاپ برداشت  
کیے رہتا۔ ایسے وقت میں بیوی کی نگاہیں اس کے ارد گرد  
گھومتی رہتی اور انجانے میں شیزا خود کو مجرم سمجھنے لگتی، اس  
کا دل بھی میکے کی رنگینوں سے اچاٹ ہونے لگتا اور وہ  
بھانے والوں سے چل دیتی۔ ایسے میں بد مزگی پھیل جاتی  
اور خدیجہ بیگم کا منہ پھول جاتا تھا۔



شیزا کے ساتھ بھی قسمت نے کچھ ایسا ہی انوکھا کھیل  
کھیلایا تھا۔ اس کی ممکنہ اپنے تیار ادا سعد علی خان سے ہو گئی  
تھی جو شہر کے مقامی اسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ شیزا کی اپنی  
کوئی پسند ناپسند تو تھی نہیں تو خدیجہ بیگم کے پوچھنے پر اس

دوری پر رہتا تھا، اسی وجہ سے اس کو ”لیڈی کلر“ کا خطاب مل گیا تھا۔ پوری یونی میں صرف شیز ای ہی ایسی تھی جسے اپنے نئے یونی فیلو کی رتی برابر پرواہ نہیں تھی، ویسے بھی وہ خود کو اسد کا ہاوند سمجھتی تھی مگر قسمت کے کھیل نزلے، انسان سوچتا سمجھتا ہے اور ہو کچھ جاتا ہے۔ یہ بات وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ جس لڑکے کو وہ مغرور سمجھ کر گھاس ڈالنا بھی پسند نہیں کرتی، ساری عمر اسی کے ناز و نخرے اٹھانے میں گزرنے والی تھی۔



اس دن شہر کے حالات خراب ہونے کی وجہ سے جلدی چھٹی ہو گئی تھی۔ شیز ابھی گھر جانے کی جلدی سوار ہوئی مگر اس کی پڑوسن اور یکلاس میٹ صائمہ ڈھونڈنے پر بھی مل کر نہیں دے رہی تھی۔ وہ دونوں ساتھ گھر جاتے تھے، شیز اس کو ڈھونڈتے ہوئے جب لائبریری میں داخل ہوئی تو وہ خالی ہو چکی تھی، اس نے پلٹ جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک کونے میں سے دھیمی سی سرگوشیوں کی آواز آئی۔ انسانی جبلت اور جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کونے کی طرف بڑھی جہاں سے آواز آرہی تھی میز پر سر رکھ کر ”لیڈی کلر“ اسے بڑبڑاتا دکھائی دیا۔

”مما..... آپ مجھے چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟“ وہ نم پڑتی سرخ آنکھوں کے ساتھ فضاء میں ایک طرف دیکھتے ہوئے یہی بات دہرا رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے انسانی ہمدردی کے تحت ابراز ملک کے قریب پہنچ کر دھیرے سے پوچھا تھا۔ وہ جانے کس فیز میں تھا کہ اس کی موجودگی کارنی برابر نوٹس نہ لیا۔ ”ہیلو..... یو نیڈ اینی ہیلپ؟“ شیز نے ڈرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”وہ..... ممما..... چلی گئی ناں۔“ اس کے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کپکپاتے وجود پر ترس آنے لگا۔

”کہاں..... چلی گئیں؟“ شیز نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا تو تو پورا دھیرے سے ان اداسیوں میں ڈول گیا۔

نے مسکرا کر رضا مندی دے دی تھی۔ شادی کی تقریب اگلے سال اس کے فاضل ایئر کے ایگزامز کے بعد رکھنے کا سوچا گیا تھا۔ زندگی میں سکون ہی سکون تھا، وہ بھی بڑی دھبی سے تعلیمی سرگرمیوں میں مشغول ہو گئی اچانک یونیورسٹی میں بڑی بڑی اداس آنکھوں والے مردانہ وجاہت کا پیکر ابراز ملک کی آمد ہوئی اور اس کی منفرد شخصیت نے جیسے ایک ہلچل سی مچادی۔ ابراز شروع سے ہی ذرا الگ تھلک رہنے والا بندہ ثابت ہوا، اسی لیے شیز نے بھی اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ ویسے بھی وہ اسے مغرور ہونے کے ساتھ ساتھ بدمزاج بھی لگا، یوں سہیلیوں کی محفل میں جب بھی اس خوبرو شہزادے کا تذکرے ہوتے وہ ناک بھوں چڑھا کر ناگواری سے وہاں سے اٹھ جاتی۔

ابراز کو بھی زیادہ دوست بنانے کا شوق نہ تھا، خاص طور پر لڑکیوں سے تو جیسے اسے خاص قسم کی الرجی تھی۔ کلاس کے بعد اس کا زیادہ وقت لائبریری میں کتابوں کے درمیان گزرتا۔ وہیں چند پڑھا کو نائپ لڑکوں کی طرف سے بڑھایا گیا دوستی کا ہاتھ اس نے بخوشی تقام لیا تھا۔ چند دنوں میں ہی اس کا شمار قابل اور اساتذہ کے پسندیدہ اسٹوڈنٹ میں ہونے لگا۔ ویسے بھی اس میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو اسے مقبول بنانے میں کار فرما تھیں۔

جب بھی مشاعرہ ہوتا تو اس کی دل گداز شاعری میلہ لوٹ لیتی، یونی کا نرسٹ میں اگر وہ اسٹیج پر گنگنا تا بھی تو تالیوں کی گونج دور تک سنائی دیتی، پڑھائی کھائی میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھا جلد ہی ڈیپارٹمنٹ میں اپنی ذہانت کا لوہا منوایا اور سب سے بڑھ کر دلوں کو مار دینے والی وجاہت ایک دفعہ اس کی طرف دیکھنے پر مجبور ضرور کرتی، دھیرے دھیرے یونیورسٹی میں اس کا جادو سرچڑھ کر بولنے لگا اور بہت جلد ہی وہ ہر دلچیز شخصیت کے طور پر ابھرانے لگا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود وہ لڑکیوں سے سوگزی کی

”وہ..... بس چلی گئیں۔“  
”مگر کہاں؟“

”انہوں نے مجھے دادی اماں کے پاس چھوڑا اور چلی گئیں۔“ شیزا کو اس پر کسی ایسے بچے کا کمال ہو رہا تھا جو میلے میں اپنی ماں کی انگلی تھاٹھ گھوم رہا ہو اور وہ اچانک غائب ہو جائے۔

”بتائیں ناں..... آپ کی ماما کو کیا ہوا؟ کیا اناں کی ڈیٹھ ہو گئی۔“ اس نے ایک خدشے کے تحت کا ندھے پر ہاتھ رکھا۔

”شٹ اپ.....“ اس نے شیزا کا ہاتھ جھٹکا۔ وہ سہم کر پیچھے ہوئی۔

”یار..... وہ زندہ ہیں۔“ اس کی غصے سے اہلٹی آنکھیں پینا پر جم گئی تو اس کو اپنے غلط اندازوں پر ایک دم سے شرمندگی ہوئی۔

”اوکے..... اکیں سوری مگر پھر وہ کہاں ہیں؟“ تجس کے تحت پوچھا۔

”وہ سیف انکل سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے امریکا شفٹ ہو گئیں۔ پلٹ کر کبھی مجھے پوچھا بھی نہیں اپنی نئی زندگی میں مست ہو گئیں..... کیا ساری عورتیں ایسی ہوتی ہیں..... انہیں تو پاپا سے بہت پیار تھا پھر بھی چلی گئیں۔“ ابراہان نے بے اختیار اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

”اور..... آپ کے پاپا؟“ اس کی ٹریجڈی شیزا کے دل پہ جا گئی۔

”ان کو کینسر ہو گیا تھا اسی وجہ سے ڈیٹھ ہو گئی۔“ وہ لمبا چوڑا مرد بے حد تباہ دکھائی دیا۔

”میرا کوئی نہیں ہے۔“ شیزا کو یوں لگا کہ اگر اس نے تھا ماہو ہاتھ چھوڑا تو کہیں اس کی ہستی بکھر ہی نہ جائے۔

”اوہ سوری..... چلیں آپ مجھے اپنا دوست بنالیں۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”اچھا..... مگر ان سب کی طرح تم تو مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گی ناں؟“ جانے اس کے ذہن کی روکیسے بہکی

شیزا کے ہاتھ پر دباؤ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... جاؤں گی۔“ اس نے یقین دلایا۔

”کیا..... تم مجھ سے شادی کرو گی؟“ وہ اس طرح سے پوچھنے پر ہکا بکا سی اسے تنکے لگی۔

”پر اس کرو..... ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی۔“ ابراہان نے بڑے مان سے پوچھا، آنکھوں میں بچوں جیسی معصومیت تھی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

”بولو..... ناں؟“ اس کا اصرار بڑھ رہا تھا۔

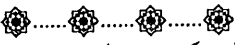
”ہاں کرو گی۔“ وہ اس ایک لمحے کے سحر میں یوں مبتلا ہوئی کہ بلا سوچے سمجھے اقرار میں گردن ہلا دی تھی۔

”کبھی چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی؟“ وہ اتنا خوش ہوا کہ چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے تھے۔

”نہیں جاؤں گی۔“ شیزا نے مسکرا کر کہا اور آج تک اس کے ساتھ کیے گئے عہد سے دامن نہ چھڑپائی تھی۔

”تم بہت اچھی ہو۔“ ابراہان کے چہرے سے پھوٹی خوشی اسے مسحور کر گئی تھی۔

شیزا نے خود سے وعدہ کیا کہ وہ اس لمبے چوڑے مرد کے دل پر لگنے والے زخموں کو اپنی محبت کے مرہم سے بھر دے گی۔



اس نے گھر آ کر ماں سے کہا کہ وہ اسد سے نہیں بلکہ ابراہان ملک سے شادی کرے گی، خدیجہ بیگم نے بیٹی کو دو ہٹڑ مار کر رونا شروع کر دیا مگر وہ دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔ اس کے بعد پہلی بار ”صدیقی ہاؤس“ میں ایسا طوفان آیا جس نے اس گھر کے کینوں کے ارمانوں اور خوشیوں کو ہنس نہس کر دیا۔ ایسی بربادی ہوئی کہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ آہ و بکا کرے، ماتم یا سوگ منائے۔ سب کے دباؤ اور غصے اور ڈانٹ ڈپٹ کو ایک ہفتے برداشت کرنے کے بعد بھی جب وہ اپنی بات نہ منوا سکی تو اس نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کی، بھکی کمر کے ساتھ صدیقی صاحب جوان بیٹی کو لے کر

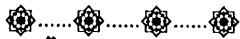
لوگوں کو معاف کر دو۔ اللہ ان کے اور ہمارے لیے آسانیاں پیدا فرمائے۔“

”کسی کا دل توڑنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے بابا؟“ اسد نے دیکھی نظروں سے باپ کو دیکھا۔

”دیکھو بیٹا اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

”نہیں..... بابا میرا اتنا بڑا دل نہیں مگر صرف آپ کے کہنے پر میں اس رشتے سے دست بردار ہو جاتا ہوں مگر اس کے بعد چچا جان کی فیملی سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔“ اسد جو بھی باپ کے آگے نہیں بولا تھا انہیں سخت لہجے میں جواب دے بیٹھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو، اس طرح خاندان ٹوٹ جائے گا۔“ انہیں اسد کے قطعیت بھرے لہجے سے خوف محسوس ہوا مگر وہ انگلی میں پہنی چاندی کی انگلی انہیں تھما کر اپنے کمرے میں بند ہو گیا تھا۔



ابراہیم نے گاڑی اسٹارٹ ہی کی تھی کہ ڈیش بورڈ پر رکھے اس کے سیل کی اسکرین چمکنے لگی۔ گویا کوئی کال آرہی تھی۔

”دادی جان ہوں گی۔“ اس نے نمبر دیکھنے کے لیے سیل فون اٹھایا اور اسکرین پر اجنبی نمبر دیکھا۔ ابراہیم نے تذبذب کی کیفیت میں کال وصول کی۔

”ہیلو.....؟“ اس کے انداز میں بہت احتیاط تھی۔ ہیلو کے جواب میں خاموشی رہی۔ رابطہ بھی بحال تھا۔ شاید اس کی آواز نہیں جا رہی۔

”ہیلو..... ہیلو.....“ اس نے بلند آواز سے تین مرتبہ ہیلو کہا اور ابھی رابطہ منقطع کرنے والا تھا۔

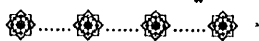
”ہیلو..... آپ ابراہیم ہیں ناں؟“ دوسری جانب سے مہین سی آواز میں سوال کیا گیا۔

”لیس..... اسپیکنگ۔“ ابراہیم کی نظریں بے اختیار باہر کی طرف اٹھیں۔ فون کے دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا اس سے پل بھر کے لیے وجود میں بہتے خون کو

ہسپتال بھاگے۔ اسد نے اپنی منگیتر کی اس حالت پر مشکوک ہو گیا تھا۔

عیناں آئی سی یو کے سامنے بے قراری سے ٹپکتے رہی تھی..... ذرا رک کر شیشے کے پار جھانک لیتی تھی پھر ماں کو نسل دیتی جن آنسو لڑیوں کی صورت رخساروں پر لڑھک رہے تھے۔ شیراز زندگی کا آخری معرکہ لڑ رہی تھی مگر قسمت اچھی تھی جو وقت پر اسپتال پہنچ گئی تھی اور بچ بھی گئی تھی، اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ۔ اسد کا دل مچلا اس نے کورڈور میں رک کر چاچا چچی کو دلا سہ دیا اور خود کشتی کی حقیقت جاننے کے لیے آئی سی یو میں چلا آیا۔ شیراز کی مدھوشی میں کی جانے والی بڑبڑاہٹ سے وہ پوری کہانی سمجھ گیا اور ٹوٹے اور بکھرے وجود کے ساتھ گھر روانہ ہو گیا تھا۔

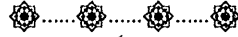
عیناں کو، بہن کی حالت سمجھ میں نہیں آرہی تھی معاس کے ہاتھ میں تھامے سیل کی واہریشن محسوس ہوئی۔ شیراز کا موبائل وہ اپنے ساتھ لینی آئی تھی، اس کی یونیورسٹی کی سیمپلی صائمہ کا فون تھا، وہ ایک ہفتے سے شیراز کی غیر حاضری پر پریشان تھی، عیناں نے اسے ٹال دیا اور بہانے سے ابراہیم کا نمبر مانگا پہلے تو وہ حیران ہوئی مگر پھر اس کے اصرار پر صائمہ نے ایک لڑکے سے مانگ کر عیناں کو ٹیکسٹ کر دیا تھا۔



ان کا دل بیٹے کی حالت پر کڑھ رہا تھا لیکن وہ مرد تھے۔ خاندان کے سربراہ تھے۔ اسی لیے وہ خاندان کو ٹوٹنا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے اور شیراز بھی ان کو اتنی ہی عزیز تھی جتنا کے اسد اسی لیے خاندان کو ٹوٹنے سے بچانے کی خاطر وہ بیٹے کو سمجھانے بیٹھ گئے۔

”بس بعض اوقات اولاد قابو میں نہیں رہتی۔“ وہ اسد کو سمجھانے لگے۔ ”ماں باپ بے بس ہو جاتے ہیں یا اولاد مجبور کر دیتی ہے۔“ وہ باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ ”مجھے پتا ہے تمہارے چچا نے بہت کوشش کی ہوگی مگر بیٹی کی محبت نے مجبور کر دیا۔ بس بیٹا تم..... ان

منجد کر دیا۔ مشرق سے اٹھتے گرد و غبار کے طوفان کو دیکھنے لگا جو اسے اپنے گھیرے میں لے رہا تھا۔ اس نے ناچاہتے ہوئے بھی گاڑی بھگائی اور اسپتال پہنچ گیا تھا۔



”اتنا خود غرض انسان..... کتنے آرام سے اپنی محبت سے دستبردار ہو گیا ہے۔“ عیناں کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ شریانون میں جوار بھانا سا اٹھ رہا تھا۔

اس کے انکار پر شیزا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔ ذہن بالکل ماؤف ہو گیا تھا احساس زیاں نے سانس اکھاڑنی شروع کر دی تھی۔ ابراہان ملک کے لیے وہ ساری باتیں انتہائی معمولی سی تھی جو ایک خاص فیز میں منہ سے نکل گئی تھی، وہ تو بھول گیا تھا اور شیزا دل سے لگا کر بیٹھ گئی اور ابراہان سے کیے گئے اپنے عہد کی خاطر جان دینے کو بھی تیار ہو گئی تھی۔ وہ سب باتوں سے انکاری ہو گیا تھا۔

”آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“ شیزا اس کی بے رخی پر ہکا بکا سی رہ گئی اور اب جو صورت حال ہی یکسر تبدیل ہو گئی تو عیناں اسے ہرگز معاف کرنے کو تیار نہ تھی۔

شیزا کے ہوش میں آنے کے بعد شکر ہے اماں بابا آرام کرنے گھر چلے گئے تھے ورنہ اس کی کتنی سکی ہوئی۔

”سوری..... شیزا مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“ اس نے بیڈ پر بیٹھے ہوئے اسے دوبارہ سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”مگر..... آپ کی وجہ سے ہی آپ نے.....“ عیناں کا بس چلتا تو اسے قل ہی کر ڈالتی اور شیزا کا حال تو ایسا ہو گیا کہ سچ مچ مر جائے گی۔

”نہیں..... یہ بات نہیں کہ یہ اچھی نہیں مگر مجھے عورت ذات پر اعتبار نہیں۔“ وہ اپنی ہی بات کر رہا تھا۔

شیزا کی تو جان ہی نکل گئی، وہ نڈھال ہو کر تکیہ سے سر ٹکا کر لیٹ گئی مگر عیناں سیدہ ٹھوک کر بہن کا مقدمہ لڑنے میدان میں اتر آئی۔

”ایک منٹ، آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں؟ کسی فلم کا

ہیرو۔ آپ کو پتا بھی ہے کہ آپ نے ایک چھوٹے سے عہد کے پیچھے اپنی زندگی تباہ کر دی۔ اسد بھائی ڈاکٹر ہیں اور یہ سب کچھ جان گئے ہیں انہوں نے کل رات گھر جاتے ہی تاپا ابا سے جانے کیا کچھ کہا، وہاں سے کوئی آپ کو دیکھنے بھی نہیں آیا، کسی بھی وقت مکنی کی انگوٹھی واپس آسکتی ہے۔“ ابراہان نے بے یقین نگاہوں سے شیزا کی طرف دیکھا۔

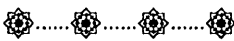
”آپ کی خاطر انہوں نے خود کسی کی کوشش کی۔ آپ کی حالت کو دیکھتے ہوئے اب تو اماں بابا بھی اس رشتے پر راضی ہیں اور آپ نے میری آپ کو بچ منجھدار میں چھوڑ دیا۔ تھ ہے آپ کے مرد ہونے پر۔“ اس کا انداز ایسا ہو گیا جیسے طوفان کے سامنے ہر طرح کا شور دب جاتا ہے۔

”کوئی مجھ سے اتنا پیار بھی کر سکتا ہے؟“ وہ سر جھکائے ایک ہی بات کی گردان کر رہا تھا۔

عیناں جو اسے کھری کھری سنا کر بڑا سکون محسوس کر رہی تھی اس کی بڑبڑا ہٹ پر مڑ کر حیرت سے دیکھا۔

”میں تمہارے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گا۔“ شیزا۔ ہاں میں تم سے ہی شادی کروں گا۔“ اس نے بڑے جوش سے کہا اور شیزا کا ہاتھ تھام کر پیار سے تننے لگا۔

اس کے چہرے پہ پھیلے جنونی تاثرات نے عیناں کے اندر خطرے کی گھنٹی بجادی مگر بہن کے چہرے سے پھوٹی روشنی نے خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔



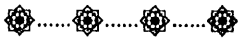
فردوس بیگم نے پوتے کی پسند کی شادی کے لیے بہت مخالفت کی مگر زندگی میں پہلی بار ابراہان ملک ان کے سامنے ڈٹ گیا کہ شادی کرے گا تو صرف شیزا سے، اس کی خواہش حقیقت کے روپ میں ڈھل گئی۔ وہ بڑی دھوم دھام سے اسے رخصت کرا کر کے اپنے گھر لے آیا تھا۔ جملہ عروسی میں داخل ہوتے ہی گلابوں سے سجی تاج پر

چاہتی تھی۔ شیرا جیسی بڑھی لکھی حسین و جمیل طرح دار بہو پہلے دن ہی ان کی آنکھوں میں چھینے لگی تھی۔ شادی کی صبح ناشتے کی میز پر جب شیرا کی دادی ساس سے پہلی ملاقات ہوئی تو ایک عجیب سا تاثر اس کے من میں ابھرا تھا۔

”ارے میرا بچہ خوشیوں کو ترسا ہوا ہے۔ ماں بھی ایسی بے وفائی کے پلٹ کر دیکھا نہیں، اللہ کسی کو ایسے دن دیکھنے نہ پڑے جو ان شوہر کی موت کے بعد اس کی بیوہ پسند کی شادی کر کے اپنے روتے بلکتے بچے کو چھوڑ کر چل دے۔“ وہن..... امید ہے کہ تم میرے بچے کو سنبھال لو گی؟“ وہ ایک دن کی وہن کے سامنے اپنی بہو کو کونے دینے سے باز نہ آئی اس نے نگاہ اٹھا کر شوہر کو دیکھا، اس کے چہرے کے تاثرات میں سختی کھل گئی تھی۔

”اللہ بخشتے ہم نے تو اپنے شوہر کی خدمت اور ناز برداریوں میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ابراہن کی ماں کے جانے کے بعد بھی ہم نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی..... ساری ساری رات جاگ کر اسے پلا پوسا..... اب تو خیر بڑھاپے کی وجہ سے دوسروں کی محتاج ہوں، زیادہ چل پھر نہیں سکتی۔“ انہوں نے لگے ہاتھوں نئی بہو کو جتایا کہ وہ ان کی خدمت کے لیے آئی ہے۔

”ماشاء اللہ..... بہت قسمت والی ہو جو ملک ہاؤس کی بہو بنی ہو۔“ وہ سر جھکا کر ناشتے میں مصروف رہی مگر دماغ میں بہت سارے سوال گونج رہے تھے، جس کے جواب اس نے خود ہی ڈھونڈنے تھے۔



چند دنوں بعد جب ابراہن نے دفتر جانا شروع کیا تو اس کا دادی ساس کے ساتھ تھوڑا سا تکلفات کا پردہ اٹھا۔ ایک دن کچھ سوچ کر شیرا نے باتوں میں باتوں اپنی ساس کے بارے میں پوچھا۔

”ناستہ..... آئی سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔“ فردوس بیگم بہو کی بات پر لمحے بھر کے لیے تو بھونچکی سی رہ گئی۔

بٹی شیزارا اسے بے اختیار ہمارا آیا جو اس کے لیے سارے زمانے سے لڑکرائی کی زندگی میں آئی تھی۔

”شیرا..... پلیر کچھ تو بولو۔“ وہ شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے بولا۔

جی..... کیا بولوں؟“ وہن بنی شیرا نے شرما کر گردن جھکا دی۔

”تم مجھ سے محبت کرتی ہونا؟“ ابراہن نے اقرار چاہا۔

”ہاں نہیں۔“ وہ ناز سے مسکرائی۔

”کیا..... پھر تم نے مجھ سے شادی کی کیوں کی، کہیں تم بدل تو نہیں جاؤ گی..... مجھے چھوڑ تو نہیں جاؤ گی؟“ اس کے انداز میں بے چینی سی سی لگا تا سوالات کرتا رہا۔

”کیا ہو گیا ہے ابراہن؟ میں مذاق کر رہی تھی۔“

”اچھا..... تو پھر کہو ناں مجھ سے پیار ہے؟“ وہ بڑے اشتیاق سے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر بولا۔

”ہاں کر کے بتاتی ہوں۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”ہاں کرو ناں۔“ ابراہن کا اصرار بڑھا۔

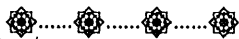
”کس سے پتا کروں؟“ شیرا نے پوچھا۔

”اپنے دل سے پوچھ کر بتاؤ ناں۔“

”ہاں..... اس دل میں آپ کے سوا کوئی نہیں۔“

شیرا نے اس کا مضبوط ہاتھ تھام کر اقرار کیا۔

”ہمیشہ میری ہی رہنا۔“ اس کے جواب نے جیسے ابراہن کی پیاسی روح کو سیراب کر دیا تو وہ مسکرا کر اسے تھکنے لگا تھا۔



شادی کے بعد بہت شیراز کو سارے تلخ حقائق کا پتا چلا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا شوہر نہ صرف اپنی دادی فردوس بیگم کے زیر اثر ہے بلکہ بھی بھی انی سے خائف بھی ہو جاتا۔ وہ اس شادی سے خوش نہیں تھی بس ابراہن ملک کی وجہ سے انہیں خاموشی اختیار کرنا پڑی ورنہ تو وہ کوئی دیو قسم کی سیدھی سادی لڑکی کو اس گھر کی بہو بنانا

”بہو بیگم تم نے ابراز سے نہیں پوچھا..... اس بارے میں؟“ فردوس نے منہ بنا کر طنز کیا۔

”کم بخت کھون رہی ہے۔ کہیں ابراز نے اسے کچھ تو نہیں بتا دیا یا شاید مجھ سے کچھ اگلوانا چاہتی ہے۔“ فردوس بیگم کی نگاہوں نے اس کے وجود کا ایسرے کیا۔

”مجھے خود سے پوچھنا کچھ اچھا نہیں لگا۔“ اس نے گھبرا کر صفائی دی۔

”اف یہ آج کل کی لڑکیاں..... پوری فتنہ ہیں اب نیا ڈرامہ کرنا پڑے گا۔“ وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر ماتھے پر ہاتھ رکھ کر فتنہ آمیز آواز میں شروع ہوئیں۔

”میری بیٹے کا کفن بھی میلانا نہیں ہوا تھا کہ شائستہ نے دوسری شادی رچا لی۔“

”دادی اماں کیوں؟“ شیزا نے انہیں بے یقینی سے گھورا۔

”مجھے کیا پتا بہو۔“

”اچھا..... مگر کوئی بھی عورت ایسے ہی اپنی اولاد کو چھوڑ کر نہیں جاتی کوئی تو وجہ ہوگی۔“ اس نے شک بھرے انداز میں کہا۔

”آئے..... مجھے کیا پتا ان میں وفا کی کمی ہوگی۔“

فردوس بیگم کے نگاہیں چرانے پر شیراز کو لگا وہ کچھ چھپا رہی ہیں۔

”میں تو اپنے بیٹے کے مرنے کے بعد ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔“ یہ کہہ کر فردوس بیگم بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ابراز ایک فائل گھر بھول گیا تھا وہ لینے واپس آیا تو دادی کے نساو سے تڑپا گئے۔

”کیا ہوا دادی اماں کو..... شیراز تم نے کچھ کہا ہے کیا؟“

”نہیں بیٹا..... میں اپنی قسمت کو رو رہی ہوں۔“ وہ پونے کو دیکھ کر مزید سوے بہانے لگیں۔

”جاؤ..... پانی لے کر آؤ۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور کچن کی طرف دوڑ لگا دی۔

”دادی..... پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے سے میری زندگی کے دکھ کم نہیں ہو جائیں گے..... میری وجہ سے ہمت

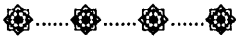
کریں ناں۔“

”تمہاری وجہ سے تو ہمت پکڑی ہوئی ہے ورنہ تو میں کب کی مر گئی ہوتی۔“ فردوس بیگم نے آچل سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

”میں اس عورت سے نفرت کرتا ہوں جسے دنیا میری ماں کہتی ہے۔“ اس پر پھر دورہ پڑ گیا تھا۔

”مجھے بس آپ کی ضرورت ہے اور کسی رشتے کو میں نہیں جانتا۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی انگلیوں کی پوروں سے ان کے آنسو صاف کرنے لگا۔

”وہ کم بخت تو چلی گئی..... اللہ تمہیں سلامت رکھے..... ہماری تو زندگی گزر گئی۔ تم سے سوچ ہی نہیں ہٹتی۔“ فردوس بیگم نے بے اختیار ابراز ملک کو اپنے سینے سے لگایا۔ شیزا کو اس گھر کے ماحول سے ڈپریشن ہونے لگی، زنجیر کی کوئی تو کڑی گم تھی۔



ابراز ملک ایک ہفتے کے لیے پنڈی گیا تھا۔ کہہ کر گیا تھا کہ آفس کے کسی ضروری کام سے جا رہا ہے۔ شیزا کو خالی ڈھنڈا گھر کھانے کو دوڑ رہا ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر دادی ساس سے اجازت لی اور میکے چل آئی۔ سب اس کو دیکھ کر کھل اٹھے، اسے بھی لگا جیسے یہاں آ کر تازہ سانس لینے کا موقع ملا ہو، وہ ماں سے لپٹ گئی۔

”اب ایک ہفتے تک یہیں رہنا، میں جانے نہیں دوں گی۔“ خدیجہ بیگم نے بیٹی کو دیکھ کر کہا۔

”ایک ہفتہ..... مجھے تو رات تک واپس جانا ہے۔“ ورنہ دادی ساس نے ابراز کو کال کر کے میری شکایتیں لگا دی ہیں۔“ شیزا کے منہ سے صاف کورا جواب سن کر انہوں نے برا مانیا۔

”تمہاری دوسری بہنیں بھی تو ہیں مگر تم تو بھی ہم نے بیٹی دی ہے بیٹی تو نہیں ناں۔ پتا نہیں تم کیوں ہر وقت ڈری سہی رہتی ہو۔“

”میری پیاری اماں..... جب بھی موقع ملتا ہے تو یہاں دوڑی چلی آتی ہوں مگر ابھی ابراز شہر سے باہر گئے



”چھوڑیں..... بیٹا کیوں راکھ میں چنگاریاں ڈھونڈنے چلی ہیں۔“

”اگر آپ چاہتے ہیں کہ ابراہان نائل زندگی کی طرف لوٹ آئیں تو پکیز مجھے سب کچھ بتادیں۔“ اس کی التجاؤں کے جواب میں ابراہان کے ماموں نے جو کچھ بتایا، وہ اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

”ان شاء اللہ میں ابراہان کو لے کر ضرور آؤں گی۔“

شیزانے بغیر سوچے سمجھے جذبات میں آ کر وعدہ کر لیا۔ ”مجھے اپنے بھائی کی بہت پرواہ تھی مگر فردوس بیگم کی وجہ سے دل مسوس کر رہ جاتا تھا، اکثر خیال آتا اچانک ماں کی شفقت سے محروم ہونے والے میرے بھانجے کا کیا حال ہوگا لیکن آپ سے بات کر کے بیٹا اب میں پرسکون ہو گیا ہوں کہ اسے آپ جیسی نیک اور اچھی بیوی ملی ہے۔“ ناصر علی بہت محتاط انداز میں اسے سراہ گئے۔

”شکریہ انکل..... بانی داوے شائستہ آنٹی..... میرا مطلب ہے میری ساس کا امریکا کا فون نمبر مل سکتا ہے۔“

”انکل نہیں ماموں اور میں آپ کو شائستہ بہن کا نمبر نیکسٹ کرتا ہوں اس بیجاری نے بہت دکھ اٹھائیں ہیں شاید اب اسے کچھ سکون میسر آ جائے۔“

”بہت دنوں بعد سکون کا احساس من میں جاگا ہے۔ جس کے لیے ایک بار پھر میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔“ شیزا اس خیال سے ہی ہلکی پھلکی ہو گئی کہ وہ ابراہان ملک کی بے چینی اور ڈپریشن کا حل ڈھونڈ نکالے گی۔

”جیتتی رہو بیٹا..... اللہ حافظ۔“ ناصر علی کی طرف سے فون بند ہو گیا مگر سیل ابھی بھی شیزا کے کان سے لگا ہوا تھا۔ ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ دل میں سکون کی کیفیت ابھر کی صورت دوڑ رہی تھی۔

”شیزا..... میری جان مجھے ایسے رخصت نہ کرو۔“ ابراہان ملک نے اس کا ہاتھ تھام کر اس کی ٹھوری کو اوپر

ہوئے ہیں، اس وجہ سے میں ابھی رہ نہیں سکتی۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”تو یہ ہے لوگوں کی ساس ہوتی ہیں یہاں تو دادی ساس نے جان عذاب میں ڈال رکھی ہے، بڑی لی تو جیسے قیامت کے بورے سمیٹیں بیٹھی ہیں۔“ خدیجہ بیگم نے سارا غصہ فردوس بیگم پر نکالا تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر تو بڑبڑا کر نکل گئی۔

شیزانے ماں کو رام کیا اور پھر عیناں کے ساتھ کمرے میں گھس گئی جو اس کی حالت پر کچھ دیر بیٹھی کڑھتی رہیں۔ کچھ سوچ کر اس نے ابراہان کی ماں کے حوالے سے بہن سے بات کرنے کا سوچا۔ بہن کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے، عیناں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ابراہان کی غیر موجودگی میں اس کے ننھیال سے رابطہ کرے اور سچائی کا پتا لگے۔ بہن کی بات اس کے دل کو لگی اور وہ گھر جانے کو پرتو لے گئی۔

شیزانے ایک دن موقع دیکھ کر بالائی منزل کا چکر لگایا اور ابراہان کے مرحوم والد کے کمرے میں چلی آئی، درازوں کی تلاشی لینے کے دوران اسے چھوٹی سی فون ڈائری ملی جس میں مختلف نمبروں کے ساتھ اسے ابراہان کے نانی کے گھر کا نمبر مل گیا، وہ اتنی خوش ہوئی جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔ فردوس بیگم کو کھانا کھلانے کے بعد ان کے کمرے میں قیلولہ کے لیے لٹایا اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے فون ملایا، وہاں سے کسی صاحب نے فون اٹھایا، اس نے ڈرتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

”بہت شکریہ بیٹا کہ آپ نے ہمیں اتنے سالوں بعد یاد کیا۔“ ناصر علی حیرت و خوشی سے فون پر بات کرنے لگے۔

”شکریہ تو میں آپ کا ادا کروں گی اگر ابراہان کے بچپن میں ہونے والی ٹریجڈی کے بارے میں کچھ پتا چل سکے۔“



ناپیشا نامہ

لفظ لفظہ نگارے سطر سطر تحس سے بھرہ لود تحریریں  
ایسی کہانیاں اس سے قبل آپ نے نہیں دیکھی ہوں گی

مغربی ادب سے انتخاب  
جرم و سزا کے موضوع پر ہر ماہ منتخب ناول  
مختلف ممالک میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کے پس منظر میں  
معروف ادیبہ زینب قمر کے قلم سے ناول  
ہر ماہ خوب صورت تراجم و دس پینس کی شاہکار کہانیاں

اس کے علاوہ

خوب صورت اشعار منتخب غزلوں اور اقتباسات پر مبنی  
خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی کے عنوان سے مسلسل سلسلہ

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

پہنچنے والے کی صورت میں رجسٹر کریں (03008264242)

Info@naeyufaq.com

(021)35620771/2

0300-8264242

اٹھایا۔

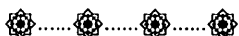
”دیکھو اگر تم اتنا روو گی تو میں کیسے جاؤں گا۔“  
”اچھا ٹھیک ہے میں نہیں جاتا۔“ ابراز ملک نے  
اپنے سینے پر ہاتھ باندھ کر اسے دیکھا۔  
”نہیں میں رو تو نہیں رہی..... یہ تو خوشی کے آنسو  
ہیں۔“ شیزا نے یک دم سے اسے آنسو صاف کیے۔  
”دیش مائی ڈارلنگ۔ شیزا تمہیں پتا ہے کہ مجھے بھی  
تمہارے اور بچوں کے بغیر رہنا بہت مشکل لگتا ہے۔“  
”نہیں..... ہم آپ کے لوٹنے کا انتظار کریں  
گے۔“

”شادی کے بعد تم نے پہلی بار مجھ سے کچھ مانگا پھر  
میں تمہاری بات کیسے مان سکتا تھا ورنہ اس عورت جس کو تم  
میری ماں کہتی ہو اس سے ملنا میرے لیے سوہان روح  
ہے۔“

”ابراز..... بعض حقیقتیں بہت تلخ ہوتی ہیں، دادی  
اماں اس دنیا سے چلی گئی ہیں، ان کا پردہ رکھنا ضروری  
ہے، اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ اپنی والدہ سے ملیں  
شاید اس طرح آپ دونوں کو سکون مل جائے، ویسے بھی  
شائستہ آئی سسرالی سیاست کا شکار ہوتی ہیں، ان کا اتنا  
قصور نہیں جتنا آپ کے کان میں انڈیلا گیا۔“  
”اوکے تم دعا کرنا کہ میں لوٹ آؤں۔“

”اگر میری محبت میں طاقت ہوگی تو آپ ضرور  
لوٹیں گے۔“

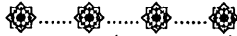
”تمہاری یاد اور تمہاری دعائیں مجھے ہر گھڑی نیا  
حوصلہ دیں گی اور پھر دیکھنا جلد ہی میں تمہارے پاس  
ہوں گا۔“



بیٹے کے انتقال کے بعد فردوس بیگم کے دل میں  
خوف جاگ اٹھا کہ کہیں بہوان کے پوتے کون سے دور  
نہ کر دے، جس کے نام بڑا سا گھر اور لاکھوں کا بینک  
بیلنس تھا۔ اسی وجہ سے ان کے دماغ میں ایک منصوبہ  
پلنے لگا، انہوں نے اٹھتے بیٹھے بیٹے کی جوان موت کی

کے بعد شائستہ نے بیٹے سے ملنے کی بہت کوشش کی مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ اپنی داوی کے ٹرانس میں تھا۔ ماں سے اس کی نفرت دن بہ دن بڑھتی چلی گئی۔ ان حالات میں شائستہ اتنی پیار ہو گئی کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ سیف کو اپنے گھر کی فکر ہوئی اور وہ شائستہ کو زبردستی اپنے ساتھ امریکا لے گئے۔ وہ یہاں رہتی تھی تو کس کے آسرے پر۔ فردوس بیگم نے ماں و دولت کے ساتھ اپنے بڑھاپے کا سہارا بھی ڈھونڈ لیا تھا۔ شائستہ کے جانے کے بعد ابراز کو احساس دلایا کہ اس کی ماں کس قدر خود غرض عورت ہے جو شادی کر کے اسے چھوڑ کر خوشی خوشی برائے دیں چلی گئی۔ اس کے بعد سے ان سب کا رابطہ منقطع ہو گیا۔

شیز کو یہ ساری باتیں اپنی ساس کے ذریعے پتا چلی جن کا اب اس سے ٹیلو فونک رابطہ بحال ہو گیا تھا۔ وہ اس عورت کی قربانیوں سے بہت متاثر ہوئی۔ اس نے کوشش کی کہ وہ ابراز کو اپنی ماں کی طرف دوبارہ مائل کرے مگر فردوس بیگم اس کی راہ میں ایک بڑی دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں۔ ابراز ملک بظاہر تو اپنی ماں کو بھول گیا تھا مگر اس وجہ سے اسے نفسیاتی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک عام زندگی سے ہٹ کر زندگی گزار رہا تھا۔ اگر شیز اس کی زندگی میں شامل نہ ہوئی ہوئی تو وہ اتنا نارمل بھی نہیں رہتا جتنا اس کی محبت کی وجہ سے ہو گیا تھا۔



وقت کا کام گزرتا ہے اور وہ گزرتا ہی چلا جاتا ہے۔ فردوس بیگم نے اپنا بڑھاپا بچانے کے لیے یہ پورا کھیل تو کھیلنا سیکھ لیا تھا۔ وقت احساس ہوا کہ قبر میں تو خالی تھا ہی جانا ہے۔ بستر مرگ پر ہاتھ جوڑ کر پوتے سے معافی مانگی۔ ابراز کے لیے اب کسی کی بات پر بھی یقین کرنا مشکل تھا۔ کون سچا ہے اور کون جھوٹا، وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی لیے شیز جو شائستہ سے مسلسل رابطے میں تھی کچھ سوچ کر اور نفسیاتی معالج کے مشورے سے شوہر کا امریکا جانے کا منصوبہ بنایا اور اس سے ایک بار شائستہ

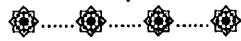
دہائیاں دینے کے ساتھ اپنی بہو کے کم عمری میں بیوہ ہونے پر دکھاوے کے آنسو بہانے شروع کر دیئے۔ آہستہ آہستہ وہ شائستہ کو دوسری شادی کی طرف مائل کرنے لگیں، بائیس سالہ شائستہ بہت بھولی بھالی سی تھیں، انہیں اپنے بیٹے کے مستقبل کے لیے باپ کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ سیف ان کا امریکا پلٹ کر نہ لڑتا تھا جو شروع سے انہیں پسند کرتا تھا مگر شائستہ کی شادی جب منصور ملک سے ہو گئی تو وہ دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ اب جبکہ وہ پاکستان میں تھا تو شائستہ پر ہونے والے قسمت کے وار سے افسردہ ہو کر اسے حوصلہ دینے ملک ہاؤس چلا آتا تھا۔ اس کی ننھے ابراز سے بھی بہت دوستی ہو گئی تھی۔ جہان دیدہ فردوس بیگم سب دیکھ رہی اور پرکھ رہی تھیں بلکہ یہ کہا جائے تو بچا نہ ہوگا کہ وہ در پردہ سیف کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں، ایک دن جب اس نے شائستہ سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے فوراً ہی شائستہ کی والدین سے بات کر کے انہیں راضی کیا اور یوں دونوں کا سادگی نکاح پڑھوایا گیا۔

شائستہ منع کرتی رہی مگر انہوں نے ابراز کا واسطہ دے کر اسے بھی منایا اور پھر نکاح کے بعد انہیں سیف کے ساتھ گھومنے بھج دیا۔ جاتے ہوئے شائستہ نے ابراز کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا مگر فردوس بیگم نے بہانے سے روک لیا۔ ہر طرف ان کی اعلیٰ ظرفی کی مثال دی جانے لگی مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ ماں بیٹے کے بیچ میں دڑاڑ ڈالنے کے لیے فردوس بیگم نے یہ منصوبہ بندی کی ہے۔ شائستہ جب ایک مہینہ باہر گزار کر واپس آئی تو بے قراری سے ابراز سے ملنے ملک ہاؤس پہنچی، تب اس پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ تو فردوس بیگم کی سازش کا شکار ہو گئی ہیں۔ انہوں نے روتی دھوتی شائستہ کو دروازے سے ہی لوٹا دیا۔ ایک مہینے میں فردوس بیگم نے ماں کے خلاف جانے کی ساز ہر ابراز کے کانوں میں گھولوا کہ وہ ماں کی شکل دیکھنے کا روادار نہ رہا تھا۔ سیف کی تو اس نے یک دم بے عزتی کی اور نوکروں سے کہہ کر انہیں باہر نکلوا دیا۔ اس

بیگم سے ملنے کی استدعا کی۔ وہ بیوی کے مجبور کرنے پر خالی دل کے ساتھ امریکا جا تو رہا تھا مگر واپسی کا نہیں بتایا تھا بلکہ اسے دھمکی دی کہ اگر مزید دھوکا کھایا تو اس کی زندگی سے بھی دور چلا جائے گا۔ شیراز نے بھی ابراز کی صحت یابی کے لیے یہ جو اکیلے کا ارادہ کر لیا تھا اور اسے بھیج دیا اور آج جبکہ وہ پورے دو مہینے اپنی ماں کے ساتھ گزار کر نہی خوشی لوٹ رہا تھا تو وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

امریکا میں اسے ماں کے ساتھ چھوٹی بہن عیسیٰ بھی مل گئی۔ زندہ دلی تو اس گھر کے لوگوں کی پہچان تھی، اس نے دو مہینے بہت انجوائے کیا۔ خاص طور پر عیسیٰ کی شرارتیں اسے مسکرانے پر مجبور کر دیتی۔ آج زندگی بھی ان لوگوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ ابراز ملک کی پیاسی روح ماں سے مل کر سیراب ہو گئی تھی۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ اگلے سال ماں اور بہن کو پاکستان اپنے گھر رہنے کی دعوت دے کر واپسی کا قصد کیا تھا۔

شیراز کو تو لمحہ لمحہ گزرتا مشکل ہونے لگا۔ وہ پاؤں رکھتی کہیں اور پڑ کہیں رہے تھے۔ شیراز کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے آج ہوا بھی بے قابو ہے مگر ہوا نہیں بلکہ وہ خود بے قابو ہو رہی تھی۔ یہ دو مہینے اس پر دو صدیوں کی طرح گزرے تھے۔ اس کی واپسی کی گھڑی نے شیراز کا دل، اس کی دھڑکن اور زندگی تو ابراز کے لیے ہی تھیں مگر اتنے دنوں کی جدائی نے جیسے محبت کی شدت کو بڑھا دیا تھا۔ وہ اتر پورٹ کی راہ پر گامزن تھی، شوپر کو لینے جا رہی تھی۔ دونوں بچوں کی شوخیوں بھی عروں پر تھیں، باپ سے ملنے کی خوشی میں وہ بے قابو ہو رہے تھے۔



”پتا ہے شیراز

نہیں پتا

تو پتا کرونا

کس سے

اپنے دل سے

میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں

اپنی جان سے بھی زیادہ۔

جب بھی وہاں آنکھیں بند کرتا تھا تو تمہاری مسکراتی شبیہ نگاہوں کے سامنے آ جاتی تھی اور جب آنکھیں کھولتا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ تم میرے پاس آ کر بیٹھ گئی ہو۔ پتا ہے غیر نے تمہارے اور بچوں کے لیے بہت سارے گفٹ دیئے ہیں، میری بہن بہت پیاری ہے۔ تمہاری چاہت نے ہی مجھے اتنا سہارا دیا اور تمہارے دیئے ہوئے اعتماد نے مجھے اچھا بیٹا اور بھائی بننے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ماما سے اپنی تمام کوتاہیوں کی معافی مانگ لی، وہ مجھ سے لپٹ کر بری طرح سے رو دیں اور میرے دل کی بے چینی ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ اس وقت تمہاری جانی پہچانی سی خوشبو میرے آس پاس بکھر گئی تھی اور شیراز.....“

ابرار ملک بول رہا تھا اور اس کی ہتھیلیاں بھیگ رہی تھیں اور وجود پور پور شوہر کی محبت میں بھیگتا چلا گیا تھا۔ اس کی خمار آلود آنکھیں مدھ برسائے لگی اور اس کا دل ابراز کی چاہتوں پر سجدہ ریز ہو گیا تھا۔

عشق ایک جزوقتی نہیں کل وقتی جذبہ تھا، اسے دنیا سے بیگانہ کر دیتا ہے، محبت بس بے غرض محبت چپ چاپ جب تک چاہیں کرتے چلیں جائیں کرتے چلے جائیں، کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ چاہت میں چاہے جانے والے کی خوشی مقدم رکھیں، جس کو چاہتے ہیں تو اس کو قید کرنے کی جگہ آزاد کر دیں، اگر آپ کا ہوگا تو لوٹ آئے گا اور اگر آپ کا نہیں ہوگا تو کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ لوٹ آیا تھا ہمیشہ کے لیے آپ کا ہو جانے کے لیے۔ وہ ستم گر ہمیشہ کے لیے زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا، شیراز نے آسودگی سے آنکھیں موند لی تھیں۔



# لوہے قندیلوں کی

## صبا ایشل

میں اس حصار سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں  
تمہارے پیار سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں  
رچا ہوا ہے تیرا عشق میری نس نس میں  
میں اس غبار سے نکلوں تو اور کچھ سوچوں

پورے پانچ بجے پڑھنے بیٹھنا ہے نہیں اٹھے تو پانی ڈال کر  
اٹھا دوں گی۔“

”کیا.....! چار بج کر دس منٹ ہو گئے۔“ دس منٹ  
اوپر ہونے کا سنتے ہی دماغ بھک سے اڑ جاتا۔ سینکڑے  
ہزاروں حصے میں چندی مندی آنکھیں پوری کی پوری کھل  
جاتیں اور سینکڑے سوویں حصے میں جوتا پیر میں اور ہم  
کمرے سے باہر نکل چکے ہوتے۔

جاسن کے قطار میں لگے چار گھنٹے پیرزوں کے نیچاس  
وقت میلے کا سماں ہوتا تھا ہر بجہ اس وقت خصوصی طور پر  
آزادی محسوس کر رہا ہوتا۔ آزاد فضا میں سانس لینے کا سرور  
ہی انوکھا ہوتا تھا۔ اس کچھ دیر کی آزادی کا ہم چوبیس گھنٹے  
انتظار کیا کرتے تھے صبح اٹھنے سے لے کر رات سونے تک  
ہمارے خواب شام کے اس ایک گھنٹے تک محدود تھا۔ کل یہ  
کھیلیں گے..... فلاں کو ساتھ نہیں کھلائیں گے..... فلاں  
نے چیز اکیلے کھائی تھی تو اسے تو بھی بھی ساتھ نہیں کھینے  
دینا۔ پکڑن پکڑائی، گلے ڈنڈا، کرکٹ، شاپو، سہو پنجوا اور کوکلا  
چھپائی کے ساتھ درجنوں کھیل تھے اور کھیلنے کو بس ایک  
گھنٹہ..... ننھا سا ذہن گھوڑے دوڑا دوڑا کر پریشان ہو جاتا  
کہ کیا کیا خواب نہ دیکھا کرتے تھے اور وقت تھا کہ پر لا کر

شدید گرمیوں کی شام تھی۔ جب اسکول سے آنے کے  
بعد سب بچے شام تک اپنے اپنے گھروں میں قیدی کی سی  
زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یہاں کوئی بچہ  
دروازے کی جانب جانے کی غلطی کرتا اور وہاں اس کی اماں  
کا ہاتھ چپل تک جا پہنچتا اور ماؤں کے نشانے کے بارے  
میں تو مشہور ہی ہے کہ کسی نشانہ باز کا نشانہ بے شک چوک  
جائے ماں کی بھیجی ہوئی جوتی کا نشانہ خطا نہیں جاتا۔ اماں  
کی چپل اور استاد کے ڈنڈے کا ڈر ہی ہم جیسے ڈھیئوں کو  
انسان بنائے رکھتا ہے ورنہ ہم بچوں کے تو بس تین ہی شوق  
تھے..... کھانا، کھیلنا اور پھر سے کھانا لیکن ماں کے جوتے  
اور استادوں کے ڈرنے یہ ترتیب کچھ یوں بنادی تھی۔ بہت  
سارا پڑھنا، تھوڑا سا کھانا، اس سے بھی کم کھیلنا اور گھنٹوں  
سونانا..... تو بھلا یہ بھی کوئی سائنس تھی کہ اسکول سے آکر سوپا  
جائے تو دماغ تازہ دم ہو جاتا ہے۔ میں تو سونے کے بعد  
اٹھتا تو سونے سے پہلے والی ساری تازہ دہی ہو جاتی۔  
چندی مندی آنکھیں کھلنے کا نام نہ لیتیں اور ادھر اماں ہلا ہلا  
کر ہوش دلاتی رہتیں۔

”چار بج کر دس منٹ ہو گئے۔ کھیلنے کا وقت ختم ہونے  
میں صرف پچاس منٹ باقی ہیں نہیں کھیلنا تو موت اٹھو لیکن

جانتا تھا کہ میں ہر کھیل کا ماہر ہوں اور اسی لیے ہر کھیل میں ہر بار ہر ٹیم مجھ سے ساتھ شامل کر لیتی تھی۔

اللہ جانتا ہے مگر اس قسم کے شوق کہاں سے چرائے تھے مجھے اس کے فضول شوق بھی اس کی خاطر اچھے لگنے لگے تھے۔ وہ بہت کم بولتی تھی چھوٹی سی عمر میں وہ ہم سب سے زیادہ سلیجھی ہوئی بچی تھی۔ سوائے اپنے فضول سے شوق کے وہ کبھی کسی سے لڑتی تھی نہ ہی کوئی شرارت کیا کرتی تھی۔

”ایک بات تو بتاؤ..... تم درختوں کو کھود کر، ٹیلے پر آ کر یوں نیچے جھک جھک کر کیا ڈھونڈتی رہتی ہو؟“ وہ اب بھی خاموش رہی۔

”کچھ ڈھونڈتی ہوں نا؟“ مجھے لگا کہیں میں نے غلط سوال نہ پوچھ لیا ہو تو دوبارہ سوال کیا۔

”تم میرا مذاق تو نہیں اڑاؤ گے؟“

”میں تمہارا کچا دوست ہوں اور دوستوں کا مذاق نہیں اڑاتا بری بات ہوتی ہے۔“ میں نے گردن اکڑا کر جواب

اڑ جاتا۔ ایک گھنٹہ..... بس ایک گھنٹہ جو منٹوں میں گزر جاتا اور ہم سب منہ لٹکائے ایک آواز پر گھروں کو روانہ ہوتے، دو چار منٹ تاخیر کی تو خیر مگر اس سے زیادہ پرماں ڈراؤھیل نہ دیتی تھیں جتنے زیادہ منٹ اوپر چلے جاتے اتنی ہی زیادہ دیر کے لیے مرغابنا دیتیں اور درد کرتی ٹانگوں کے ساتھ پیٹھ کر پھر پڑھنے کا خیال ہمیں کبھی مقررہ وقت سے آگے نہ جانے دیتا تھا اور ہم سب میں ایک وہ عجیب و غریب، گم صدم، اور خود میں کمن رہنے والی بلی تھی جو خاموشی سے کسی کو نے میں بیٹھی زمین کریدتی رہتی۔ اس کا نام تو کچھ اور تھا لیکن آنکھوں کی رنگت کی وجہ سے سب اسے بلی کہا کرتے تھے۔ ہم کھیل رہے ہوتے تو وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی۔

”ٹیلے پر چلیں۔“ وہ اتنی معصومیت سے کہتی کہ میں بلا چوں چراں اس کے پیچھے بولیتا۔ سارے دوست پیچھے سے چلاتے رہ جاتے کہ آئندہ تمہیں نہیں کھلائیں گے اور میں نظر انداز کر کے بلی کے ساتھ ٹیلے کی طرف چل دیتا۔



”بس چلنے لگی کتر کتر زبان بجالا ہے کبھی کسی کام کو غلطی سے ہاتھ لگا لیا ہو۔ سارا دن یہ مولیٰ مولیٰ کتابیں اور اس کے علاوہ یہ گز بھر لمبی زبان، ارے مجھے کیا پتا تھا کوئی سبیل بیٹھی ہے۔ میں من کی بھڑاس باہر نہ نکالتی۔“ دادی کو غصہ پہلے ہی سہا یا ہوا تھا اب اس نے بول کر اپنی شامت کو خود آواز دے لی تھی۔

”بونے ہوتے ہیں..... واقعی تمہیں کیسے پتا؟“ میں حیران ہوا۔ اماں نے تو یہی بتایا تھا کہ بونے اور پریاں قصے کہانیوں میں ہوتے ہیں اور بلی آج کچھا ور کھر رہی تھی۔ ”دیکھا تمہیں یقین نہیں آیا..... اسی لیے میں کسی کو بتاتی نہیں ہوں۔“ وہ ناراضی سے بولی، ابھی تو بات کا پتا چلا تھا اور سچ ہاتھ بھی نہیں آیا کہ وہ جارہی تھی۔ ”ارے سنو..... مجھے تمہاری بات کا یقین ہے لیکن بتاؤ تو تمہیں یہ کیسے پتا چلا۔“ میں ٹیلے سے تیزی سے اتر کر اس کے پیچھے چل گیا۔

”کسی نے نہیں بتایا۔ بس مجھے یقین ہے کہ بونے ہوتے ہیں، اب تم کسی سے مت کہنا سب میرا مذاق اڑائیں گے۔“ اسے یقین تھا تو اس کے یقین پر مجھے بھی یقین کا مل ہونے لگا کہ بونے واقعی ہوتے ہیں، سب بچے گھر والوں کو لوٹ رہے تھے میں بھی گھر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

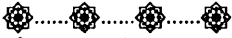


کئی دنوں سے فضا میں جس کا راج تھا۔ موسم کا یہ رنگ دادی کے موسم پر بھی حاوی ہو رہا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد وہ آنگن کے اونچے لمبے ساپہ دار درختوں کی جانب نظر کرتیں اور مایوسی سے سر ہلا کر گویا ہوتیں۔ ”غضب خدا کا..... ایک پتا تک نہیں بل رہا کہ موا شہر تو موسم کو بھی لے بیٹھا ہے۔“

”دادی ماں پتا نہیں بل رہا تو اس میں شہر کا کیا تصور؟ یہ تو ہوا کی غلطی ہے۔ وہ چلتی رہتی ہے تو پتے بھی ملتے رہتے۔“ وہ کافی دیر سے دادی کی سن رہی تھی اب رہانہ گیا تو کتاب سے نظر ہٹا کر جواب دیا۔

سے ہنستے ہوئے اپنی ساتھی دوست کو بتا رہی تھیں۔

”ہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“ چھٹی ہونے کی بیل بجی تو وہ تینوں اپنی چیزیں سیٹھیں ہوئے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔



اس دن رات بھر مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ آنکھ لگتی تو خواب میں بونے نظر آنے لگتے اور جو حل جانی تو سوچوں پر بولوں کا راج ہوتا۔ بونے کتنے چھوٹے ہوتے ہوں گے، کیسے نظر آتے ہوں گے اور اتنے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں تو وہ روٹی کتنی چھوٹی کھاتے ہوں گے اور اس جیسے سیکڑوں سوال تھے۔ آج پہلی بار میں اسکول جانے کے لیے وقت سے پہلے تیار ہو گیا تھا ورنہ صرف چھٹی والے دن ہی میں وقت سے پہلے اٹھا کرتا تھا۔ اگر مجھ پر تاریخ لکھی جاتی تو یہ دن یقیناً سنہرے لفظوں میں پڑھا جانا تھا۔ اسکول میں تفریح تک کا وقت بہت مشکل سے گزرتا تھا۔ تفریح کا گھنٹا بجا تو میں دوڑتے ہوئے بلی کے پاس پہنچا اور اس کا ہاتھ تھام کر کھینچتے ہوئے اسکول کے داخلی دروازے کے آگے بنی چوڑی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا ہے؟“ بلی کی آنکھیں مارے حیرت کے مزید بڑی ہوئیں۔

”تم نے کل بتایا تھا ناں کہ بونے ہوتے ہیں؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ مبادا کوئی اور میری بات نہ سن لے۔

”ہاں بتایا تھا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تم نے بھی دیکھے ہیں؟“ میں اشتیاق سے پاگل ہو رہا تھا۔

”ہاں دیکھے ہیں ناں.....“ وہ فخر سے بولی تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔

”واقعی دیکھے ہیں.....! کیسے ہوتے ہیں، کتنے بڑے ہوتے ہیں؟“ میرے چہرے کے رنگ دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔

”اتنے سے.....“ وہ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے دوا نچ کا فاصلہ بنا کر بولی۔

”ان کو تو ہاتھ پر بھی اٹھا سکتے ہیں۔“ وہ ہتھیلی کھول کر

”ارے واہ..... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں بھی سوچ رہی ہوں کہ اپنے بچوں کو یہ رسالہ لگوادوں۔ ان کو بھی کہانیوں میں بہت دلچسپی ہے۔“ سائنس کی ٹیچر صائمہ نے کہا۔

”کیا باتیں ہو رہی ہیں بھئی؟“ وہ اسٹاف روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ ہاتھ میں پکڑے ٹیسٹ پیپر میز پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”بچوں کی نفسیات اور ان کو کنٹرول کرنے پر بات کر رہے تھے۔ ایک رائٹر ہیں جو بچوں کے لیے لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں..... یقین کر لوں تم بھی ان کو پڑھو گی تو اسیر ہو جاؤ۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہماری ہی کہانی لکھ رہے ہوں۔ ہمارا بچپن، بچپن کی یادیں، سوچیں ایک ایک چیز بالکل اپنی اپنی لگتی ہیں۔“ کے جی کی ٹیچر مسکان بہت جوش میں بولی۔

”بی۔ کے۔ بی کی بات کر رہی ہو؟“ ملی ٹیسٹ پیپر پر نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”تم نے پڑھا ہے ان کو.....؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”ہاں..... ایک دن ہمیں تمہارا میگزین اٹھا کر سرسری نظر ڈالی تھی تو کہانی کا عنوان دلچسپ لگا اور میں نے بیٹھے بیٹھے پوری کہانی پڑھ لی۔ اچھی لگی تھی مجھے لیکن ایک بات عجیب ہے اتنا اچھا لکھنے والے نے اپنا نام اتنا عجیب سا کیوں رکھا ہے۔ بی۔ کے۔ بی کیا مطلب ہو سکتا ہے اس کا؟“ ملی مسکان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”یار..... بہت سے خطوط میں اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہوتا ہے لیکن لکھاری نے اس کی بھی وضاحت نہیں دی۔“ مسکان کندھے اچا کاتے ہوئے بولی۔

”چلو چھوڑو ہمیں کیا، ویسے یہ توجہ حاصل کرنے کے طریقے ہیں اس طرح لوگوں کو تجسس میں مبتلا کر کے اپنے فیز اور پڑھنے والوں کی تعداد بڑھانے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔“ ملی بولی تو مسکان اور صائمہ نے بھی گردن ہلا کر ہاں میں ہاں ملائی۔



لگا کر جاتی ہوں۔“ وہ پہلے ہی تھک ہوئی تھی اوپر سے دادی  
ماں کی نصیحت شروع ہوئی تھیں۔

”من کریم..... ارے یہ سب لوٹنے کے ڈھکوسلے  
ہیں۔ اللہ بخشے میرے اماں ماں کے پھلکے سکھا کر ان کو  
پیس کر یہ بڑا جا رہا کر تیں۔ سارا سال بیسن میں یہی  
سفوف ملا کر منڈھوتے رہتے۔ رنگت آئینہ سی دقتی شفاف  
اور خراج بھی کوئی نہیں۔ چہرہ حسین رکھنا ہے تو سویرے اٹھ  
کے کچے دودھ کی ملائی کا مساج کرو، ابٹن استعمال کرو، یہ  
گھر میں لیموں کے پودے ہیں، کوار گنڈل ہے اس کو  
استعمال کرو کیوں باپ کی کمائی کے ہزاروں روپے منہ پر  
لیپ کر ضائع کر دیتی ہو۔“ دادی ماں بولنا شروع ہوئیں تو  
بولتی ہی رہیں۔

”اف دادی ماں..... ابھی بالکل موڈ نہیں ہے۔ میں  
اندر اے سی والے کمرے میں جا رہی ہوں۔“ وہ بیچارگی  
سے بولتی کھڑی ہو گئی۔

”دومنٹ بیٹھو ادھر ہی، گرمی سے آتے ہی اے سی میں  
بیٹھ جاؤ تا کہ گرمی، ٹھنڈی ایک ہو جائے اور بیمار پڑ جاؤ۔  
فرتج میں ٹھنڈی ٹھڈا لسی بنا کر رکھی ہے۔ نکال کر پی لو پہلے  
سکون محسوس ہوگا۔ بہو کی طبیعت ذرا بوجھل ہے تو وہ آرام  
کر رہی ہے اندر جاتے ہی شور شراب نہ شروع کر دینا۔“ دادی  
ماں جتنا مرضی بول لیں یہ تو سچ تھا کہ وہ نہ روایتی ساس تھیں  
اور نہ ہی روایتی دادی، بس بولتی روایتی تھیں۔ لسی پی اور نہا کر  
کپڑے بدل کر کچن میں آ گئی۔ آگوشٹ کا ساسن پکا ہوا  
تھا۔ آگوشٹ پڑا تھا۔ اس نے پھلکے پکنے کے لیے تو  
چوبے لہے پر رکھا اور دادی ماں کی باتیں یاد آئیں تو اس کے قہقہے  
چہرے پہ ان کے لیے پیار بھرے احساسات نظر آنے  
لگے۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ دادی ماں، امی، ابو  
اور وہ گھر میں کل چار افراد تھے لیکن دادی ماں اور اس کی نوک  
جھونک سارا دن چلتی رہتی تھی۔ دونوں میں ایک فرد ہی گھر  
میں نہ ہوتا تو خاموشی کاٹنے کو دوڑتی۔ دادی ماں سارا دن  
بہانے بہانے سے پوتی کو چھٹیڑی زبانی اور کبھی چوہ

دوسرا ہاتھ اس پر دھر کر بولی۔  
”میں تو روزانہ کو دھکتی ہوں اور ہاتھ میں بھی اضافی  
ہوں۔ سچی میں بہت مزہ آتا ہے۔ تم نے کبھی دیکھا ہے؟“  
وہ بہت خوشی سے بولتے ہوئے آخر میں مجھ سے پوچھنے  
لگی۔

”نہیں..... کبھی نہیں لیکن اب تم مجھے ان سے ملوانا یہ  
اٹھنی بھی رکھ لو۔ بس مجھے ان سے ملوا دینا..... ملواؤ گی  
ناں؟“ میں نے سکھ اس کی طرف بڑھایا۔

”ارے بدھو..... پیسے کیوں دے رہے ہو۔ ان سے  
ملنے کے پیسے توڑی لگتے ہیں۔ تم ویسے ہی ان سے مل سکتے  
ہو۔“ میرے سر پہ ہلکی سی چپٹ لگاتے ہوئے وہ بولی تو مجھے  
وہ دنیا کی سب سے حسین لڑکی۔

”تم جب چاہو آ نکھیں بند کر کے ان کو دیکھ سکتے ہو۔  
میں تو ایسے ہی دھکتی ہوں۔“ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔  
”کیا!..... آ نکھیں بند کر کے..... بنڈا نکھوں سے  
کیسے بونے نظر آتے ہیں؟“ میری ساری امیدوں پر پانی  
پھر گیا تھا۔

”شام کو ٹیلے پر چلیں گے۔ میں تمہیں دکھاؤں گی۔  
ابھی تفریق کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ استانی جی دیر سے کلاس  
میں آئے پر کھڑا کر دیتی ہیں۔ ابھی جانی ہوں۔“ وہ دوڑتی  
ہوئی کلاس میں چلی گئی اور میرے جیس کو مزید بڑھائی گئی  
تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو سپینے اور گرمی سے برا حال تھا۔  
آنگن میں سایہ دار درخت کے نیچے تخت پر دادی ماں نیم  
درا تھیں، سر ہانے ٹیبل فین چل رہا تھا۔ وہ سلام کر کے ان  
کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ چہرے کے گرد لپٹا ہوا اس کا رخ اتار  
کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔

”چہرہ بدھو ذرا گرمی سے کیا کملا گیا ہے۔ اتنی خوب  
صورت رنگت گرمی میں تب کر کسی سیاہ ہو گئی ہے۔“ دادی  
تشویش سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”دادی ماں..... کچھ نہیں ہوتا رنگت کو..... میں سن مکرم

خاموش ہو جاتیں تو ان کی پوتی انہیں خاموش رہنے ہی نہ دیتی۔ پیار محبت اور خلوص کے یہ رشتے دلوں سے جڑے ہوئے تھے اور دلوں کے بندھن تب جڑتے ہیں جب ایک دوسرے کے لیے دل میں محبت، احترام اور مان ہو۔

فون کی مسلسل گھنٹی بج رہی تھی لیکن کوئی اٹھا نہیں رہا تھا آخر کار تیسری کوشش پر فون اٹھا لیا گیا تھا۔  
 ”ہیلو..... السلام علیکم؟“

”وعلیکم السلام! کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“  
 ”میں الحمد للہ بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں مدیر صاحب آپ کیسے ہیں پرچا ٹھیک چل رہا ہے؟ ابھی کہانی مکمل کرنے کی مصروفیت میں ہی آپ کا فون دیر سے اٹھایا۔ ان شاء اللہ شام تک آپ کو مل جائے گی۔“  
 ”میں جانتا ہوں آپ کی طرف سے کبھی تاخیر نہیں ہوتی۔ میں نے کہانی کے لیے نہیں بلکہ کسی اور غرض سے فون کیا ہے۔“  
 ”ایک مدیر“ مصنف سے تحریر کے علاوہ بات کرنی ہے۔ اللہ خیر کرے۔“ ہلکا سا قہقہہ دونوں طرف سے برآمد ہوا۔

”بی۔ کے۔ بی۔ جی ایسا ہے کہ آپ کے قارئین نے خطوط اور فون کے ذریعے ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ سب جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کون ہیں۔ میں چاہ رہا تھا اگر آپ اجازت دیں تو میں نام نہ بتاؤں صرف اتنا ہی بتا دوں کہ آپ مرد ہیں یا عورت؟“ مدیر صاحب نے جھجکتے ہوئے بات مکمل کی۔

”ایسا ہے کہ مدیر صاحب میری تلاش ابھی ادھوری ہے۔ جس دن اس تلاش کا معرہ حل ہو جائے گا مجھے اپنے قارئین کے سامنے آنے میں تاخیر نہیں ہوگی۔ اس وقت تک پلیز مجھے یکسوئی کے ساتھ اپنی سوچوں اور سوچوں سے بنی تحریروں کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں لوگوں کے شور اور محبتوں میں کھو کر اپنی تخلیقات اور تلاش دونوں گنوا دوں..... آپ سمجھ رہے ہیں ناں؟“ دوسری

طرف چھائی مکمل خاموشی کو توڑنے کے لیے پوچھا۔  
 ”جی بالکل..... میں سمجھ گیا ہوں۔ دعا ہے کہ آپ اپنی تلاش کا الجھاسرا جلد پالیں۔“  
 ”سلامت رہیں۔ اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ فون رکھ دیا گیا۔ اس نے صوفے کی پشت سے ٹپک لگا کر دونوں ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے سر کے پیچھے گردن پر رکھ لیے اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔

ہم دونوں بہن بھائیوں کو سلا کر اماں اپنی چڑی گیلی کر کے ہمارے اوپر ڈال دیتی تھیں۔ یہ گیلی چڑی دراصل ہمارا اے سی تھا۔ گیلی چڑی لے کر نکلتے کے آگے لیٹ جاتے اور چلتی دیر چڑی گیلی راتی عچھے کی ہوا، اے سی کی ٹھنڈک کو مات دیتی راتی۔ اپنی دانست میں اماں ہمیں سلا کر خود بھی کچھ دیر آرام کی خاطر لیٹ جاتی تھیں اور بونے دیکھنے کا خیال میری نینداڑائے ہوئے تھا۔ اماں کے ہلکے ہلکے خراٹے سنائی دینے لگے تو کئی بار جی میں آیا کہ باہر جا کر دیکھاؤں شاید بلی تھیلے آگئی ہو لیکن میں اماں کو جانتا تھا وہ سو رہے میں بھی آنکھیں کھلی رکھتی تھیں۔ ادھر میں چار پائی سے نیچے اترا ادھر ان کا جوتا ان کے ہاتھ میں ہوتا اسی لیے مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق گھڑی پر نظر میں جمائے لیٹا رہا اور صدیوں کے انتظار کے بعد چار بجے تو گولی کی سی رفتار سے گھر سے نکل گیا۔ گھٹے پیڑوں کے نیچے ٹولیوں کی صورت سب بچے اپنے اپنے کھیل میں مگن تھے اور بلی سب سے الگ تھگ ہاتھ میں پکڑے تنکے کی مدد سے زمین پر ٹریس میٹریس لکیریں بنا رہی تھی۔ میں بیتابی سے اس تک پہنچا۔

”چلو بونے دیکھنے چلیں۔“  
 ”بونے؟“ اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔  
 ”تم نے کہا تھا ناں شام کو دکھاؤ گی؟“  
 ”میں بھول گئی چلو چلتے ہیں۔“ اپنے مٹی والے ہاتھ جھاڑتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

واپس رکھ کر وہ منہ بنا کر بولی۔

”اچھا بس یہ ایک لے رہی ہوں باقی رکھ دی ہیں۔“ وہ اتنی معصومیت سے بولی کہ دادی ماں اسے ایک قاش منہ بجائے دو اٹھاتے دیکھ کر بھی خاموش رہیں۔



”چلو آنکھیں بند کر لو۔“ جامن کے درختوں سے کچھ فاصلے پر موجود مٹی کا چھوٹا سا نیلہ تھا جہاں بچے کم ہی کھیلنے آتے تھے۔ نیلے کی چوٹی پر ہم بیٹھ گئے اور اس نے مجھے آنکھیں بند کرنے کا کہا۔

”غور سے دیکھو تمہیں ایک ایسی جگہ نظر آ رہی ہے جہاں درخت، گھرا لوگ سب چھوٹے چھوٹے ہیں۔“

”کہاں ہیں؟ میری آنکھوں کے آگے تو سب اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔“ میں مایوسی سے بولا۔

”ارے بدھو ایسے نہیں دیکھو ناں..... تم یہ سوچو کہ تمہیں یہ سب نظر آ رہا ہے پھر نظر آئے گا۔“ وہ ہمیشہ کی طرح سر پہ چھت مار کے گویا ہوئی۔

”غور سے دیکھو ایک بڑا سا میدان ہے..... نظر آ رہا ہے؟“

”ہاں تھوڑا تھوڑا نظر آیا۔“

”میدان میں چھوٹی چھوٹی بہت ساری جھونپڑیاں ہیں۔“

”ہاں یہ تو سچ میں نظر آئیں۔“ اب کے میں کچھ پُر جوش ہوا۔

”یہ بونوں کے گھر ہیں۔“

”اب دیکھو تمہیں ایک گھر سے بونا نکلتا دکھائی دے گا۔“ پھر ایک چھوٹے سے گھر کا چھوٹا سا دروازہ کھلا اور بونا باہر آیا۔ ”آیا ہے ناں؟“

”ہاں..... ہاں نظر آیا وہ یہ تو بہت چھوٹا سا ہے۔“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور بند آنکھوں کے پیچھے ننھا ننھا بونا دیکھنے لگا۔

”دیکھا میں نے کہا تھا ناں اتنے چھوٹے ہوتے ہیں۔“

”اچھا..... دادی ماں جب بازار میں ہر چیز تیار کرتی ہے تو ان بکھیروں میں کیوں خود کو تھکاتی ہیں؟“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بہت معصومیت سے کیری کی ایک قاش منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

”آئے ہائے..... پوری قاش چبا گئی لڑکی کتنی بار منع کیا ہے کھٹی چیزیں نہ کھایا کر پر مجال ہے جوکان پر جوں رنگ جائے۔ اللہ بخشے میری اماں مرحومہ مجھ کو خشک ناریل، ہر گرم میوہ اور ہر کھٹی چیز ہماری دسترس سے دور رکھا کرتی تھیں اور اگر کبھی ایسا کچھ غلطی سے میسر آ جاتا تو اماں کو کہیں نہ کہیں سے خبر ہوتی جاتی۔ ہم لاکھ چھپاتے لیکن یوں معلوم ہوتا تھا گویا اماں کوئی ساحرہ ہیں چہرہ ہی دیکھتے ہی پہچان لیتیں اور پھر وہ لئے لیتیں کہ اگلے کچھ ماہ اس قسم کی بے احتیاطی کرنے کا سوچتے بھی نہ تھے۔“ ملی جونمک ہلیدی لگی کیری کی دوسری قاش اٹھا کر منہ میں رکھنے والی تھی۔ اب آنکھیں پھاڑے منہ کھولے دادی ماں کی داستان سن رہی تھی۔

”چل اب بند کر منہ..... جیسے مجھے پتا نہیں ہے۔ یہ باتیں میں نے ہزار بار بتائی ہوئی ہیں اور تو ایسے آنکھیں پھاڑ رہی ہے جیسے پہلی بار سنی ہو۔“ دادی ماں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا منہ بند کیا۔

”ہا ہا ہا..... جب پتا ہے کہ یہ باتیں مجھے ازبر ہیں تو بار بار کیوں دہرائی ہیں۔“ دادی اچار کے لیے لیموں کاٹنے میں مصروف ہوئیں اور وہ ایک ٹکڑی میں کیری کی چند قاشیں بھر کر اس کو پیٹھ پیچھے چھپا گئی۔

”بار بار اس لیے دہرائی ہوں کہ شاید تجھ پر کچھ اثر ہو جائے۔“ لیموں کے دو ٹکڑے کر کے پرات میں ڈالتی دادی ماں نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا۔ اس عمر میں بھی دادی ماں کی رنگت سرخ و سفید اور صحت قابل رشک تھی۔

”یہاں سے اٹھنے سے پہلے پیٹھ پیچھے چھپائی کیریاں واپس رکھ جانا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی تو دادی ماں کی آواز پر آنکھیں سٹک گئیں۔

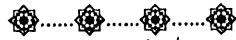
”داو آپ کوئی پر دادو جان سے کم ہیں۔“ کیریاں ہیں۔“

”تم سن رہے ہو۔“ اس نے میرا کندھا ہلایا۔  
 ”واہ یہ تو بہت اچھا طریقہ ہے۔“ میں نے آنکھیں کھول کر اس سے سراہا۔

”میں تو دن رات ایسے ہی بہت کچھ دیکھتی ہوں۔“ وہ آواز بھاری کر کے بولی۔  
 ”اور کیا کیا دیکھتی ہو؟ مجھے بھی بتاؤ میں بھی دیکھوں گا۔“ میرے لیے یہ طریقہ نیا تھا اور میرا جس اپنے عروج پر تھا۔

”جو بھی میرا دل چاہے..... پریاں دیکھتی ہوں۔ اپنی گڑیا کی شادی کروا دیتی ہوں، الدین کا چراغ دیکھتی ہوں پھر اس کو ایسے رگڑ کر اس میں سے جن نکال کر، دنیا کی سب سے خوب صورت اور امیر شہزادی بن جاتی ہوں۔“ وہ انگلیوں پر نوائے گناتے چراغ پر پہنچی تو دونوں تھیلیوں کو یوں رگڑنے لگی گویا چراغ رگڑ کر ابھی جن حاضر کر لے گی۔  
 ”واہ پھر تو بڑا مزہ آتا ہوگا..... اسی لیے تم اکیلی کھیلتی رہتی ہو۔“ گردن ہلا کر میں نے آنکھیں پٹپٹنائیں۔  
 ”ہمیں بہت دیر ہو گئی ہے اب گھر چلیں۔“ دن ڈھلتا دیکھ کر ملی نے کہا۔

”اوہ..... میں تو بھول ہی گیا کہ کل حساب کے دس پہاڑے استاد نے فر فر سننے ہیں۔ اماں نے کہا بھی تھا جلدی آ جانا۔“ ہم دونوں آگے پیچھے جاؤں کے گھنے پیڑوں کے نیچے سے ہوتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔



”کیا بات ہے ملی تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔ کب سے دیکھ رہی ہوں کہ خاموش خاموش ہو۔“  
 ”کچھ نہیں امی جان..... یونہی خاموش رہنے کو جی چاہ رہا تھا۔“ لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائے وہ دھیسے سے مسکراتی۔

”مٹی زونوں سے دیکھ رہی ہوں تمہارے لہجے کی شکفتگی اور چہرے کی بشاشت دونوں مر جھائے ہوئے ہیں۔ اسکول میں کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ وہ بھی ماں تھیں اور ماں

کا دل آسانی سے مطمئن نہیں ہوتا۔

”ایسا تو کچھ نہیں..... چھٹیوں سے پہلے آج اسکول کا آخری دن تھا۔ شاید کام کی زیادتی نے موڈ پر بھی اثر کیا ہو آپ فکر نہ کریں مجھے اور میرے موڈ کو بدلنے والی وجہ ابھی وجود میں نہیں آئی۔“ بات کے آخر میں بشاشت سے کہتے ہوئے اس نے امی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

”واہ بھئی ماں بیٹی میں بڑے لاڈ ہو رہے ہیں۔ میں بوڑھی جان باہر اکیلے دھوپ کی تپش سینک رہی ہوں اور کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔“ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر دادی ماں نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

”اماں ابھی تو آپ کو فالسے کا شربت پلا کر آئی ہوں اور کہا بھی تھا کہ باہر گرم ہوا چل رہی ہے اندر آ جائیں لیکن آپ نے کہا کہ آپ کو برآمدے میں کولر چلا دوں۔“ زاہدہ حیرانی سے بولیں۔

”امی جان..... آپ سمجھی نہیں۔ یہ جو کچھ انہوں نے ارشاد فرمایا سب میرے لیے تھا۔“ وہ ماں کے گلے سے بانہیں نکال کر مسکرا کر بولی۔

”تو دشمن میری اور امی جان کی محبت سے جلتے ہیں۔“ دادی ماں کے قرب جا کر وہ ان سے لپٹ کر بولی۔  
 ”چل بدمعاش..... اس گھر میں ایک تیری محبت ہی تو ہے جس کا وجود مجھ بوڑھی جان کو بھی جینے پر مجبور کرتا ہے ورنہ تیرے ابا کے جانے کے بعد میرے زندہ رہنے کے لیے اس دنیا میں بچا ہی کیا تھا۔“ بیٹے کو یاد کرتے ہوئے دادی ماں آبدیدہ ہو گئیں۔

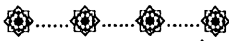
”دادی ماں یہاں بیٹھیں۔“ اس نے ان کو شانے سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔  
 ”نکنی بار کہا ہے کہ جو یادیں تکلیف دیتی ہوں ان کو یاد نہ کیا کریں۔“ ان کی عینک اتار کر انگلیوں کی پوروں سے مٹی صاف کرتے قاس نے کہا۔

”یادیں اچھی ہوں یا بری..... زندگی کی کتاب سے مٹائی جاسکتی ہیں اور نہ بھلائی جاسکتی ہیں۔ تمہیں بھی تو اپنا باپ یاد آتا ہے ناں، ہمارے سامنے زیادہ بولنے اور خود کو

مطمئن ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہو ورنہ ہم تینوں جانتے ہیں یہ درود آخری سانس تک ہمارے جسم میں رہنے والا ہے۔ وہ جوان کو بہلانے کی کوشش کر رہی تھی اب اس کی اپنی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت بہہ نکلے تھے۔ ادھر زائدہ کی آنکھیں بھی برسنے کو تیار تھیں۔

سکندر اور تبریز دونوں بھائی تھے۔ بڑے سکندر اور چھوٹے تبریز دونوں بھائی اپنی والدہ کے ساتھ دیہاتوں کے طویل سلسلے کے ساتھ جڑے ایک چھوٹے دیہات نما قصبے میں رہائش پذیر تھے۔ قصبے کے قریبی گاؤں میں ان کی کئی مربع پر پھیلی ہوئی فصلیں اور اراضی تھی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود دونوں بھائیوں نے شہر میں نوکری کرنے کے بجائے زمینوں کے معاملات سنبھالنے کو ترجیح دی تھی۔ سکندر کی شادی اپنی کزن زائدہ سے ہوئی تھی جو میٹرک کے بعد آگے نہیں بڑھ سکی تھی کیونکہ قصبے سے باہر جا کر پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ شادی کے کچھ سال بعد ملیجہ پیدا ہوئی، ملیجہ سات برس کی تھی تو زائدہ کی اس کو بڑھانے کی خواہش زور پکڑ گئی۔ بیوی کی خواہش پر بیٹی کے مستقبل کی خاطر شہر آنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی والدہ جہاندیدہ اور بچوں کی خوشی میں خوش رہنے والی ماں تھیں۔ وہ ان کے فیصلے میں آڑے نہیں آنا چاہتی تھیں۔ لہذا خوش دلی سے اس فیصلے کو قبول کیا۔ ملی شہر میں پڑھنے لگی، زمینی معاملات تبریز کے ہاتھوں میں آ گئے اور سکندر شہر میں ایک کمپنی میں اعلیٰ پوسٹ پر نوکری کرنے لگی۔ چھٹیوں میں ہمیشہ ملی اپنی دادی ماں کے پاس رہنے چلی آتی۔ اس کی اسکول کی پڑھائی مکمل ہوئی اور چھٹیوں میں ہمیشہ کی طرح زائدہ اور سکندر اسے اس کی دادی کے پاس دیہات چھوڑنے آئے تھے۔ واپسی سے ذرا پہلے سکندر زمینوں کا چکر لگانے گئے، پیروں سے چل کر گئے تھے لیکن واپسی چار کندھوں پر ہوئی۔ کسی زہریلے سانپ نے اپنا زہران کے بدن میں ایسا اتارا کہ وہ منٹوں میں دم توڑ گئے۔ جہاں کچھ دیر پہلے قہقہوں اور خوشیوں کا راج تھا وہیں اب موت کا سناٹا چھایا گیا تھا۔ جانے والا جاچکا تھا ملیجہ اور زائدہ کی زندگی میں

اندھیرا ہو گیا تھا۔ انہی حالات میں دادی ماں نے بیٹی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مشکل لیکن درست فیصلہ کیا، زائدہ اور ملیجہ کے ساتھ شہر آ گئیں۔ زمینوں سے ہونے والے منافع کا آدھا حصہ ہر سال زائدہ کے اکاؤنٹ میں آتا رہا۔ سکندر کو گزربے چار سال ہو چکے تھے۔ سب سے بڑا صدمہ ملی کو لگا تھا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود ملی دوبارہ اپنے آبائی گھر کبھی نہیں گئی تھی۔ وہاں جانے کے خیال سے ہی اس کے اندر شعلے بھڑکنے لگتے۔ اسے وہ قصبہ، وہ گاؤں اپنے باپ کے قاتل لگتے تھے۔ آخری سمسٹر کے بعد نتائج آنے اور نئی کلاسی شروع ہونے میں کافی وقت تھا تو اس نے ایک دوست کی فرمائش پر اس کی والدہ کے اسکول میں پڑھانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اسکول کے بعد جو وقت ملتا وہ ہنس بول کر گزار دیتی یا کچھ کتابوں میں سر دیے بیٹھی رہتی تھی۔



”میں وہاں نہیں جانا چاہتی اور چاہتی ہوں کہ آپ لوگ مجھے مجبور بھی نہ کریں۔“ وہ نظریں جھکا کر آہستگی سے بولی۔

تبریز بچا کو ملی کی چھٹیوں کا علم ہوا تو وہ انہیں لینے خود آئے تھے۔ ملی نے وہی جواب دیا جو متوقع تھا۔ زائدہ اور دادی ماں کوشش کر رہی تھیں لیکن وہ اپنی ضد پراڑی رہی۔

”اس جگہ سے میری زندگی کی بدترین یاد جڑی ہے دادی ماں..... میرا عزیز ترین رشتہ، میرا سہارا، میرا باپ..... اس دن ہم وہاں نہ جاتے تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ دادی ماں پلیز مجھے مجبور نہ کریں۔“ ضبط کا بیانا نہ لبریز ہو گیا تو اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

دادی ماں نے تبریز بچا کی طرف دیکھ کر دکھ سے نفی میں سر ہلایا گویا کہہ رہی ہوں کہ اب یہ موضوع ختم کر دیا جائے۔

”ڈرکا سامنا نہ کیا جائے تو ڈر ختم نہیں ہوتا، زندگی میں جو کی آجائے اسے محسوس نہ کی جائے تو زندگی کی رونقیں اور پچھل بھی کبھی محسوس نہیں کی جاسکتی۔ اپنے اندر کے ڈر کا

# حجاب کرکچی

محبت لغزت کی آمیزش سے مومن ناقابلِ غمراہ بن گئیں

## عشق دی بازی

خاندانی رسم و رواج کس طرح بڑکیوں کو باغی کرتا ہے  
ریحانہ آفتاب کے نوکِ قدم نکل ایک خوب صورت تحریر

## عشق نگر کے مفسر

ایک حسد اٹنے نے اسے عشق نگر کا مفسر بنا دیا  
ندائیں کی دلکشی اور مسد توں یاد رہے جانے والی مہمان

## آنگن کی چڑیا

قارئین کے تعارف پر مبنی سلسلہ

## عالم میں انتخاب

ہر ماہ ایک شاعر کا انتخاب

اس کے علاوہ

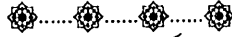
بزمِ سخن، چکن کا نرزدوست کا بیٹھام آئے منتخب  
اشعار غزلیں، اقتباسات اور دیگر  
قارئین کی دلچسپی کے مد نظر مستقل سلسلہ

Info@naeyufaq.com

(021)35620771/2

0300-8264242

سامنا کرنا، اپنے ڈھول کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے اور زندگی میں پیدا ہونے والے خدا کو محسوس کر کے آگے بڑھنا ہمیں مضبوط کرتا ہے۔ تمہیں بھی اب یہی کرنا ہے۔ میں تمہارا باپ نہیں ہوں لیکن ان کے جیسا ضرور ہوں۔ میں چاہتا ہوں میری بیٹی اوپر سے نہیں اندر سے خوش رہے۔ آبائی علاقے انسان کا اصل ہوتے ہیں ان سے دور نہیں ہوا جاسکتا۔ یہ انسان کو سیکڑوں اور میلوں دور سے بھی واپس لے آتے ہیں۔“ تبریز چچا اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر اس کے قریب بیٹھ گئے اور پیار سے سمجھانے لگے۔  
”ٹھیک ہے میں جاؤں گی لیکن زیادہ دن نہیں رکوں گی۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی تو سب کے مرجھائے چہرے یک دم کھل اٹھے۔



بلبل نے بونے دیکھنے کا طریقہ کیا بتایا میں تو کھیل کود، کھانا پینا سب بھول کر جاگتے میں نئی نئی دنیا کی سیریں کرنے لگا تھا۔

”کھیلنے نہیں جانا؟“ اماں نے شانہ زور سے ہلا کر پوچھا۔

”مجھے نیند آئی ہے آج نہیں جانا۔“ میں نے جھنجھلا کر آنکھیں کھولے بنا جواب دیا۔ اچھا خاصا آسمان میں تیر رہا تھا اماں نے سارا خیال خراب کر دیا۔ سارا مزہ کر کر کر دیا۔

”کمال ہے..... آج تو معجزہ ہو گیا، پر دیکھ لیتا پڑھنے کے وقت اٹھ جانا۔ اس کی کوئی رعایت نہیں ہے۔“ اماں دھمکی دے کر چلی گئیں اور میں دھیرے سے اٹھ کر سامنے والی دیوار پر لگا پردہ اٹھا اس کے پیچھے کھس گیا۔

دراصل یہاں دیوار کے درمیان گہری جگہ تھیں جہاں سردیوں کے بستر اوپر تلے رکھ کر ان کے علاوہ اور غیر ضروری نیکیے ترتیب سے رکھ دیئے گئے تھے جو کسی مہمان کے آنے پر نکالے جاتے۔ میں نہیں چاہتا تھا اماں پھر کچھ دیر بعد آ کر میرے خیال میں خلل ڈالیں اسی لیے بہت دھیان سے ان بستروں کے اوپر چڑھ کر سمٹ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ خیالوں ہی خیالوں میں جانے کتنی دیر

دادی ماں تبریز چاچو کے ہمراہ اس گھر میں آ گئے جس گھر سے اس کے باپ اور زہدہ کے شوہر اور دادی ماں کے بیٹے کا جنازہ اٹھا تھا۔ رستے بھر وہ خاموش رہی تھی۔ گاڑی سے اتری تو قدم من من بھر کے ہو گئے تھے۔ دہلیز پر کھڑی ہوئی تو حویلی کے کھن میں رکھے بے جان لاشے کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے ٹھوم گیا تھا۔

”اندر چلو بیٹا۔“ تبریز چاچو کی آواز نے اسے ماضی سے نکال کر حال میں واپس لا کر رکھا۔

اپنے اندر کے ڈر سے نکلنے کے لیے ڈر کا سامنا ضروری ہے۔ تبریز چاچو کی بات یاد آئی تو وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اندر داخل ہوئی۔ چچی جان اور ان کی دونوں بیٹیاں والہانہ انداز میں آگے بڑھیں اور باری باری سب ایک دوسرے سے گلے ملے۔ دکھ بیٹے کتنی ہی صدیاں بیت جا میں جب جب یاد آئے وہی پرانا احساس، وہی کرب جاگ اٹھتا ہے جو پہلی بار محسوس ہوا ہوتا ہے۔ زندگی کی مصروفیات، شب و روز کے معمولات، ارد گرد کی کہانیاں، مناظر، لوگ، سب مل کر وقتی طور پر غالب آ جاتے ہیں لیکن تیز آمدنی کی شدت کی طرح یادوں کا تیز طوفان بھی ہر چیز اڑالے جاتا ہے اور ذہن و دل کی سلیٹ پر دھندلے دکھ کو واضح کر کے، آنکھوں کے عین سامنے لے آتا ہے، ایسے میں نظریں چرانا مشکل ہو جاتا ہے، خود کو چھپانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

وہ بھی اس وقت ایسے لمحوں سے گزر رہی تھی جہاں برسوں سے چڑھایا خول اتر گیا تھا۔ برواشت سے باہر ہو گیا تو وہ عین اس جگہ زمین پر بیٹھ گئی جہاں اس کے باپ کا بے جان وجود پڑا تھا۔ دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر اس نے جانے کیوں محسوس کرنا چاہا۔ وہ جھوٹی ہنسی ہنستے ہنستے تھک گئی تھی۔ اسی لیے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی اس حالت پر سب بیٹابی سے اس کی طرف بڑھے لیکن تبریز چاچو کے اشارے پر رک گئے۔ پتا نہو یہاں اس کے لیے ضروری تھے۔ ورنہ وہ شاید عمر بھر بوٹی جھوٹا خول چل چائے گزار دیتی۔

تک با دلوں کے درمیان تیرتا رہا..... دونوں ہاتھوں سے بادل توڑ توڑ کر زمین کی جانب جھینکتا رہا۔ اچانک تیز شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں غور سے دیکھا تو وہ ہوائی جہاز تھا جو میری طرف ہی آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اس جہاز پر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔ جہاز میرے قریب آ رہا تھا اور میں تیرتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا..... قریب پہنچ کر میں عین جہاز پر پہنچ کر اس کے اوپر ایسے بیٹھ گیا جیسے گھوڑے کی سواری کرنے بیٹھتے ہیں جانے کیوں گری بڑھنے لگی۔ شاید جہاز سورج کے قریب جا رہا تھا میں پسینے سے شرابور تھا کہ اچانک جہاز کو آگ لگ گئی اور میں دھڑام سے جہاز سمیت زمین بوس ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو اماں اور چھوٹی بہن سر پر کھڑی تھیں۔ اماں کے ایک ہاتھ میں رضائی تھی جو انہوں نے پہنچ کر بستروں کے درمیان سے نکالی تھی، جس کے نتیجے میں، میں اوپر والے بستروں سمیت نیچے گر گیا تھا۔

”اتنی گرمی میں یہاں کیا کر رہے تھے؟“ اماں کا غصہ وہیں پہنچا ہوا تھا جہاں کچھ دیر پہلے میں سیر کر رہا تھا۔

”وہ مجھے نیندا کی تھی تو سو گیا تھا“ میں منمنایا۔

”حال دیکھو اپنا،“ اماں نے میرے پسینے سے شرابور وجود کی طرف اشارہ کیا۔

”ننگے سے ٹھنڈے پانی کی باٹی بھر کر فنافٹ نہا لو اور خبردار جو آئندہ یہ حرکت کی۔“ قسمت اچھی تھی کہ اماں کی شامت سے بچ گیا۔ ورنہ اماں سے کیا عید کہ میرے پسینہ سے شرابور وجود کو سیکنڈ کی کر کے دھکتے انگاروں میں دھک دیتیں۔ پہلی بار ہونے والے شاندار تجربے کے بعد دوسرے تجربے نے مجھے جی بھر کر بد مزہ کیا۔ میں نے سوچ لیا کہ آئندہ ہلی کے ساتھ ٹیلے پر جا کر ہی خیالوں اور خوابوں کی دنیا کی سیر کیا کروں گا۔



کھلے علاقوں میں گرمیوں کی شائیں دن بھر جھانکی گرمی اور جس کا راج ختم کر دیتی ہیں، کبھی ہلکی اور کبھی تیز ہوا کے جھونکے دن بھر چھائے رہنے والی کسلندی دور بھگا کر لے جاتی تھیں۔ یہ بھی ایسی ہی ایک شام تھی ملی اس کی امی اور

کام کے علاوہ کسی کو مخاطب کرتے نہ دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہمیشہ مسکرا کر حال پوچھا کرتی تھی لیکن اتنے دنوں میں اس نے میری موجودگی کو بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ میں روز اس امید پر دن کا آغاز کرتا کہ آج تو وہ میری طرف دیکھے گی، مجھ سے ہم کلام ہوگی، بچپن کی طرح اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کہہ دے گی لیکن اب وہ بچپن تھا نہ وہ ملی، جس کی نیکی آنکھوں کی وجہ سے ہم اسے بلی کہتے تھے۔ پھر وہ چل گئی اور ایک عرصے تک نہ لوئی۔ میرے پاس شہر میں ان کے گھر جانے کی کوئی وجہ نہ تھی اور اس کے پاس یہاں آنے کی معقول وجہ موجود تھی۔ زندگی بے کل و اداس گزر رہی تھی۔ تیریز چچا سے تقریباً ہر روز ملنا اور ان کے پاس کچھ دیر بیٹھنا میرا معمول بنتا گیا۔ ان کی ہر بات، ایک ایک جملہ، ہر جملے کا ایک ایک لفظ بغور سنتا کہ شاید اس کا کوئی ذکر آجائے اور ہر بار ناامید لوٹ آتا پھر ایک دن میری خوش قسمتی کہ عین اس وقت تیریز چچا سے ملنے ان کے گھر پہنچ گیا جب زاہدہ چچی کا فون آیا تھا۔ ملی نے بھی چچا سے بات کی چچا نے ہنستے ہوئے اسے بتایا کہ تمہارے بچپن کا دوست بھی یہی میرے پاس موجود ہے اس نے آگے سے جانے کیا کہا کہ بچانے فون میری طرف بڑھا دیا تھا۔

”کیسے ہو بدھو؟“ سلام کے بعد وہ چھوٹے ہی بولی۔ میں سب کچھ سوچ سکتا تھا لیکن وہ اتنے اچھے موڈ میں بات کرے گی یہ نہ سوچ سکا تھا۔ وہ مسلسل بولتی رہی، میں ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اس سے بات کرنے کی خوشی اپنی جگہ لیکن وہ کم گو، سنجیدہ، بردبار ملی، ایسی شوخ و چٹیل، اتنا زیادہ بول رہی تھی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایک طرف میں اس کی آوازیں کر مطمئن ہو رہا تھا تو دوسری طرف اس کے بولنے کے پیچھے کی وجہ خود ہی سوچ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا۔ چچا تیریز سے کہوں اسے چند روز کے لیے جا کر لے آئیں پھر سوچنا کہ چچانے پوچھ لیا کہ تم یہ کیوں کہہ رہے ہو تو کیا جواب دوں گا۔ جی جی کرنا ایک بار اسے خود جا کر دیکھاؤں پھر سوچتا وہاں جانے کی وجہ کیا بیان کروں گا۔ اسی شش و پنج میں چار برس گزر گئے تھے۔ کل رات جو خبر میں نے سنی وہ

ملنا، پچھڑنا کسے کہتے ہیں اس کی سمجھ انسان کو اکثر زندگی کی کئی دہائیاں گزارنے کے بعد سمجھاتی ہے مگر مجھے تو اگلے روز ہی سمجھ گئی تھی، جب یہ روح فرساں خبر سننے کو ملی کہ ملی شہر چلی گئی ہے۔ صبح معنوں میں اپنی کیفیت محسوس کرنے سے قاصر تھا لیکن عجیب کیفیت بھی کسی بات میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کھینے کا بھی دل نہیں کر رہا تھا اس کے سکھانے، طریقے سے کسی دلچسپی کا خیال پر نظر میں جمانے کی کوشش کرتا تو ہی نظر آتے لگتے، کچھ عرصے بعد اس صورت حال سے نکل آیا لیکن وہ اکثر یاد آتی پھر ہر برس وہ چھٹیوں میں آنے لگی اور میں سال بھر اس کی چھٹیوں کا انتظار کرنے لگا۔ جونہی چھٹیوں کا آغاز ہوتا میں دن میں کئی کئی بار اس کے گھر سے ہوتا۔ میرے اور بلی کے گھر والے بھی یہ جان گئے تھے کہ میں اس سے ملنے آتا ہوں۔ وقت گزرتا رہا اور ہم لوگ جوانی کے دہلیز پر آ کھڑے ہوئے۔ اب میں چاہنے کے باوجود پہلے کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہونے کی ہمت نہ کر پاتا تھا۔ وہ جب بھی آتی اماں اور چھوٹی نسرین سے ملنے ہمارے گھر آ کر کرتی تھی۔ میں اس سے حال چال پوچھ لیا کرتا۔ جواباً وہ بھی میری پڑھائی کا پوچھتی۔ میرے دوستوں کا پوچھتی کہ کون کون اب کیا کر رہا ہے۔ وہ اب بھی ویسی ہی کم گو، سنجیدہ، ہوئی اور معصوم تھی جتنی بچپن میں ہوا کرتی تھی اور پھر وہ حادثہ ہو گیا جس نے اس کے خاندان پر جو قیامت ڈھائی سو ڈھائی، میری بھی دنیا کا سارا سکون اپنے ہمراہ لے گیا۔ آخری بار میں نے اسے سکندر چچا کی وفات پر دیکھا تھا۔ سکندر چچا میرے ابا کے چچا زاد بھائی تھے اور رشتے میں میرے چچا تھے۔ ان کی ناگہانی موت پر سب غور میں آ رہا کہ کون سی تھیں میری نظر سب سے ہوئی دیوار سے ٹیک لگائے بلی پر پڑی تھی۔ وہ پھر بنی سکندر چچا کو دیکھ رہی تھی اور آنکھوں سے سیل رواں تھا۔ وہ روتے ہوئے بھی خاموش تھی اور اس کی یہ خاموشی مجھے سالوں ڈستی رہی۔ چالیسویں تک میرا ان کے ہاں مسلسل آنا جانا رہا۔ اس عرصے میں، میں نے اسے ضروری



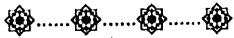
تھا۔

”پڑھ رہے تھے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”ہاں..... یہ کتاب پڑھ رہا تھا۔“ میں نے انگلی اشارہ کر کے کہا۔

”ایسے اٹارکھ کر پڑھتے ہیں۔“ اس نے کتاب اٹھا کر سیدھی کی۔

”میرا وہ بیان کہیں اور تھا۔“ میں شرمندہ ہوا۔  
 ”وہ بیان میں بونے اور ان کی جھونپڑیاں تو نہیں دیکھ رہے تھے؟“ وہ شرارت سے بولی اور میرا سارا وہ بیان اس کی شرارتی مسکراہٹ پر اٹک گیا۔  
 ”تم سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔“ وہ ادھر ادھر دیکھتی آہستگی سے بولی۔

”مجھ سے..... کیا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”کل ٹیلے پر ملتے ہیں پھر بتاؤں گی۔“ اس نے دھیرے سے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔



”کیا سوچ رہی ہو۔“ وہ لکڑی کے جھولے پر بیٹھی آ نکھیں موندے کسی سوچ میں گم تھی جب آواز پر چونک کر آ نکھیں کھولیں۔ تیز گلابی کرتے اور سفید پاجامے میں ملبوس تیر پز چچا کا اکلوتا بیٹا نفس تھا۔  
 ”تم نفیس ہونا؟“ چند ثانیوں میں ملی نے اسے پہچان لیا تھا۔

”ہاں جی..... آپ نے صحیح پہچانا۔“ دانت نکوستے وہ دیوار کے ساتھ رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ جی بھر کر بد مزہ ہوئی۔ اس کا صرف نام نفیس تھا ورنہ اس بھڑکیلے کرتے اور دانتوں کی بے زار کرنے والی نمائش دیکھ کر بلی کا دل خراب ہونے لگا تھا۔

”میں ذرا درودہ اور غمرہ کو دیکھ لوں۔“ وہ مروتا مسکرا کر بولی۔

”وہ تو جی کھانا پکا رہی ہیں، کام کر رہی ہیں۔ آپ بیٹھیں۔“ اسے جھولے سے اتارتا دیکھ کر اس نے ایک بار پھر دانتوں کی نمائش کر کے اسے روکنا چاہا۔

سن کر کانوں پر یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ سالوں بعد آ رہی تھی۔ تیر پز چچا نے خوشی میں مجھے فون کر کے بتایا تھا کہ مایجہ بھی ساتھ آ رہی ہے۔ یہ بات سن کر میری جو حالت ہوئی وہ الگ، دوسری طرف میری سوئی اس ایک بات پر اٹک گئی تھی کہ چچا نے یہ بات مجھے کیوں بتائی؟ کہیں وہ میرے دل کی بات سمجھ تو نہیں گئے؟ شام ڈھل رہی تھی وہ اب تک آ گئی ہوگی۔ میرا دل چاہا کہ میں بھاگ کر اسے دیکھا آؤں۔ لیکن اپنے دل کی حالت کا سوچ کر وہیں بیٹھا رہا۔ اگر اس نے میرے اندر کا حال میرے چہرے پر پڑھ لیا تو کیا ہوگا؟ میں خود اپنے کسمانے کھڑا اپنے تاثرات پڑھ سکتا تھا، لاکھ چھپاتا پھر بھی آشکارا ہوئی جانا تھا میں نے مناسب سمجھا کہ خود کو تھوڑا سا وقت دوں، بے قرار دل کی دھڑکنیں آہستہ ہو جائیں تو اسے دیکھا آؤں گا۔ گہری سانس لے کر میں اسٹڈی ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک کتاب اٹھا کر کھول لی۔ دھیان بنانے کی کوشش پوری کر رہا تھا بچپن میں بلی کے پھٹرنے پر دل آداس تھا اور اب اسے دیکھنے کو پھل رہا تھا۔ ان چار سالوں میں جانے وہ کتنا بدل چکی ہوگی۔ پتا نہیں اب اسے بچپن کی وہ باتیں یاد بھی ہوگی کہ نہیں۔ اس دن فون پر آواز نہ تھی تو آواز وہی تھی لیکن انداز و لہجہ بدلا ہوا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی لیکن معلوم نہیں وہ پہلے والی اپنائیت کہاں تھی۔ اگر اس کے لہجے کی طرح وہ پوری ہی پرائی محسوس ہوئی تو کیا کروں؟ میں عمر کے اس حصے میں جہاں خواہشیں جنم لینا شروع کرتی ہیں، ہر دوسری لڑکی سے پیار ہو جاتا ہے، کسی بھی دوسری لڑکی کو سوجھنا تو دور کی بات آج تک دیکھ بھی نہ پایا تھا، کوئی بلی جیسی ہوتی تو دیکھتا ناں..... بلی سے تو اس عمر میں انسیت ہوئی جس عمر میں کاغذ کی کستی اور پلاسٹک کے کھلونے کے سوا کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔

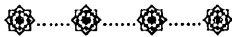
”کیسے ہو بدھو؟“ میں اپنے خیالوں میں گم تھا جب مانوس آواز پر میں نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر ہونٹ بنا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس میں کچھ نہیں سب ہی کچھ بدل گیا تھا۔ پیاری تو وہ پہلے بھی، بہت بھی لیکن اب تو بلا کا نکھار آ گیا

ممکن نہیں ہو سکے گا۔ بہر حال کوشش کرتی ہوں اب ان سب چیزوں کو جلدی سلجھایا جائے۔“ اللہ حافظ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا اور باہر نکل آئی۔ برآمدے میں چچی بیٹھی تھیں۔

”کس کا فون تھا؟“ انہوں نے خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے سوال کیا۔

”ایک دوست کا تھا۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔  
 ”خیریت تھی ناں؟“ انہوں نے ایک بار پھر پوچھا تو وہ کچھ حیران ہوئی۔

”کچھ خاص نہیں، اس کے کچھ ذاتی معاملات تھے جس پر اسے میرا مشورہ چاہیے تھا۔ میں ذرا ٹیلے تک جاری ہوں۔ پرانی یادیں تازہ کراؤں۔ امی انھیں تو بتا دیتے گا ورنہ وہ پریشان ہوں گی۔“ وہ دوپٹا ٹھیک کرتی باہر نکل گئی تھی۔



”یاد ہے تم اور میں یہاں بونے ڈھونڈنے آیا کرتے تھے۔“ وہ جو دو دن سے اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا کل رات کے بعد کچھ پرسکون ہو گیا تھا۔  
 ”ہا ہا ہا..... یہ بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”اگر اسے پتا چل جائے میں نے اسے کس شدت سے یاد رکھا ہے تو یہ تو حیرت سے بے ہوش ہو جائے گی۔“ وہ دل میں سوچ کر مسکرایا۔

”اور یاد ہے یہاں بیٹھ کر میں نے تمہیں بونے دیکھنا سکھایا تھا۔“ وہ ہاتھ کے اشارے سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”اچھی طرح یاد ہے۔ جب کبھی یہاں سے گزر ہوتا ہے ہمیشہ تمہیں یاد کرتا ہے۔“ وہ کہیں کھو رہا تھا۔  
 ”مجھے خواب دکھانا سکھا کر تم مجھ سے دور ہو گئی تھیں۔“ اس کے اندر کچھ جاگنے لگا۔

”پتا ہے میں اب تک ویسی ہوں، اب تک خواب دیکھتی ہوں، خوابوں کی نوعیت بدل گئی ہے لیکن حرکتیں ویسی

”میں دیکھ لیتی ہوں شاید انہیں میری مدد کی ضرورت ہو۔“ جان چھڑانے والے انداز میں کہہ کر ملی کمرے سے نکل گئی۔ شام کی ابتدا شروع ہوئی تو اس ٹیلے پر جانا یاد آیا۔ وہ اپنا فون اٹھانے کمرے میں آئی تو فون کی اسکرین جل بجھ رہی تھی۔ اس نے نمبر دیکھ کر فون اٹھایا۔

”میں نے آپ کو کہا بھی تھا ابھی کچھ دن میرا نام ممکن نہیں ہے پھر آپ نے ایسا کیوں کیا؟“ سلام اور حال چال کے بعد فون کرنے والے نے جانے کیا کہا جس پر وہ کچھ حیران ہوئی۔

”آپ سمجھ نہیں رہے ابھی ایسا ممکن نہیں ہے۔“ وہ جھنجھلائی۔

”ہیلو..... ہیلو۔“ آگے سے جواب نہ آیا تو اس نے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا۔ فون بند ہو چکا تھا۔ اس نے سر پہ ہاتھ مارا وہ جب سے آئی تھی فون چارج کرنے کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ موبائل چار جنگ پر لگا کر اس نے پرس سے فون نمبر والی ڈائری نکالی اور لینڈ لائن سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ ریسیور کرپڈل پر رکھ کر کمرے سے نکلے لگی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی، اس نے واپس آ کر فون اٹھایا۔

”معذرت خواہ ہوں فون بند ہو گیا تھا۔ اس لیے لینڈ لائن سے کر رہی ہوں۔“ اس نے رسمی معذرت کی۔

”کوئی بات نہیں..... ہم ملنے کی بات کر رہے تھے۔“ آگے سے مہذبانہ انداز میں جواب دیا گیا۔

”جی بالکل..... میں آپ کو یہی بتا رہی تھی کہ مجھے اچانک اپنے آبائی گھر آنا پڑا اور یہاں مجھے کچھ دن لگ جائیں گے، اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ کچھ دن رک جاتے۔“

”مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، یہ معاملات میں آپ سے پہلے بھی ڈسکس کر چکا ہوں اور آپ مجھ سے بہتر سمجھتی ہیں۔“

”مجھے گھر والوں کو بتانے کے لیے بھی کچھ وقت چاہیے۔ جب تک ان کو مطلع نہ کروں میرا وہاں جلدی آنا

ہیں۔“ وہ کندھے اچکا کر مسکرائی۔

”اور تمہاری بوٹوں کی تلاش؟ وہ جاری ہے یا بچپنے میں ہی چھوڑ آئی ہو۔“ وہ ٹیلے پر اس جگہ بیٹھ گیا جہاں کئی سال پہلے اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

”وہ ایک فنیسٹی تھی بالاج..... اس کے باوجود میرا ماننا ہے کہ دنیا میں کہیں کسی کو نے میں، زمین کی آخری تہہ میں، خشک کنوؤں کی دروزوں میں، کہیں نا کہیں ان کا وجود ضرور ہے۔“ بالاج کا دل کیا وہ اس سے کہے میں ایک بار پھر آنکھیں بند کرتا ہوں اور تم مجھے اپنی مرضی سے، اپنی آنکھوں کی دنیا دکھاؤ۔

”دنیا میں ہر وہ بات جو کہیں نہ کہیں ہو سکتی ہے اس کا خیال ہمارے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا۔“

”واہ بھی..... تمہیں تو بڑی بڑی باتیں بنانا آئیں گئیں ہیں۔“ وہ حیران ہونے کی اداکاری کرنے لگی۔

”ہاں..... لکھاری تم اور باتیں مجھے آتی ہیں۔“ وہ اس کی طرف دیکھ کر بنا بولا..... اس بار اس کی نیلی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کو ہوئیں۔

”کیا مطلب؟“ وہ بولی تو اس کی آواز وہ خود نہ پہچان سکی۔

”رسالے پڑھنے کا شوق تو بچپن سے ہی تھا۔ دو سال پہلے ردی میں کچھ کتابیں خریدیں ان میں وہ رسالہ بھی تھا جس میں تم مسمی ہو۔ ویسے تو بچوں کا رسالہ شاید نہ پڑھتا، لیکن بوٹوں پر لکھی کہانی تھی، بچپن کی کئی یادیں وابستہ تھیں، سو پڑھی اور پڑھ کر یقین ہو گیا کہ لی۔ کے۔ بی۔ بی کا ہی بچپن ہو سکتا ہے۔“ وہ تنجیدگی سے بات مکمل کر گیا اور پھر لی کے چہرے پر حیرانی کے جانے کتنے رنگ بکھر گئے تھے۔

”تم میرے نام کا مطلب بھی سمجھ گئے تھے؟“ وہ بے انتہا حیران ہوئی۔

”مجھ گیا تھا اور تب سے آج تک ہر مہینے تمہاری جاگتی آنکھوں کے لکھے خواب، دل سے پڑھتا ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھتا بھی ہوں۔“ گیمیر لہجے میں کہتا وہ ہنس

بارلی کی دھڑکنیں بے ترتیب کر گیا۔

”جانتے ہو میں تمہیں یہ بتانا چاہتی تھی۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”کیسی مدد؟“ اس نے استہمامیہ لہجے میں سوال کیا۔

”ابو جی کے دنیا سے جانے کے بعد مجھے یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ خود کو کیسے پرسکون رکھوں۔ ایک دن جانے کیا سوچھی کہ میں نے اپنے بچپن میں سوچنے والے خواب لکھنا شروع کر دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چھوٹے چھوٹے خیال کہانی میں بدل گئے، مجھے خود کو مصروف رکھنے کا بہانہ مل گیا اور اپنا لکھا اچھا بھی لگ رہا تھا۔ میں نے کسی کو بتائے بغیر کچھ کہانیاں ایک میگزین کو بھیج دیں جو قسمت سے ان کو پسند بھی آ گئیں۔ خوشی کو محسوس کرنا تو کب کا چھوڑ دیا تھا اس لیے تحریر کا شائع ہونا میرے لیے کوئی خوشی کی بات نہ تھی اور نہ میں اسے اس قابل سمجھتی تھی کہ ڈھنڈوراپٹوں کہ

میں ہی بی۔ کے۔ بی ہوں۔ وقت گزرتا رہا اور میں بچوں کے پسندیدہ ترین ادیب کے طور پر جانی جانے لگی تھی۔

سوائے اس رسالے کے مدیر کے آج تک کسی کو میرا اصل نام معلوم نہ ہو سکا۔ درمیان میں کئی بار خیال آیا کہ دادی ماں

اور امی کو بتا دوں پھر یہ ڈر لگتا کہ وہ تو میرے اسکول میں پڑھانے کے خلاف تھیں ان کو جب یہ پتا چلے گا کہ میں لکھتی ہوں تو کہیں مجھے روک نہ دیں۔ اب لگتا ہے غلط سوچتی تھی..... درمیان میں اتنا وقت آڑے آ گیا کہ اب

مجھے ان کو یہ بتاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ کس منہ سے انہیں یہ بتاؤں کہ میں ایک لکھاری ہوں اور میں نے

برسوں یہ سچ ان سے چھپائے رکھا ہے۔“ چہرے پر ندامت و شرمندگی کے رنگ لیے وہ ہنسنا شروع کر بولی۔ وہ

بنا کچھ کہ اس کی ہر بات خاموشی سے سن رہا تھا۔

”تمہیں بڑا چچا تمہیں بہت پسند کرتے ہیں، میں سوچ رہی تھی اگر تم کسی طرح ان کو یہ بتا دیتے تو وہ دادی ماں اور

امی جان کو خود بتا بھی دیں گے اور سمجھا بھی دیں گے۔ یہ

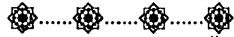
مشکل کام کتاب میرے بس میں نہیں ہے۔“ وہ دل گرفتہ ہوئی۔

”چاچو یہ بات جانتے ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ سے منہی جھاڑنے لگا۔

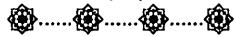
”کیا.....! چاچو جانتے ہیں..... مگر کیسے؟“ پہلے جھٹکے سے تو وہ سنبھل گئی لیکن دوسرا جھٹکا اس کو بہت زوردار لگا تھا۔

”تم نے بتایا ہوگا؟“ وہ ماتھے پر ہل لیے خشکیاں لگا ہوں سے اسے دیکھنی لگی۔

”جب پہلی بات ہماری کہانی پڑھی تھی تو سب سے پہلے ان کے پاس گیا تھا کہ وہ تم سے بات کر کے یہ کنفرم کر لیں، لیکن انہوں نے تم سے پوچھنے سے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا جب وہ خود بتانا چاہے گی بتا دے گی۔ ہمیں اس کی خواہش کا احترام کرنا چاہیے۔ کہانیاں پڑھ کر بچوں کی طرح خوش ہوتے رہے۔“ وہ بالاج کو شک دینے آئی تھی اور یہاں اسے جھٹکے پر جھٹکے لگ رہے تھے۔ سرکوفی میں ہلاتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ سب اسے ناقابل یقین لگ رہا تھا۔



آج میں حقیقی معنوں میں خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جس راز کو اس نے برسوں سب سے چھپا کر رکھا تھا، آج وہ اسے بتانے کے لیے سب سے پہلے میرے پاس آئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کہیں نہ کہیں اس کی زندگی میں، میں بھی اہم تھا۔ آج اس سے بات کرتے ہوئے پتا نہیں کیوں لیکن میں خود اعتماد تھا۔ ہم نے ڈھیروں باتیں کیں اور میں ایک بار بھی گھبراہٹ نہیں آج وہ دل کے بے حد قریب اور اپنی اپنی محسوس ہوئی تھی۔



وہ واپس آئی تو دیکھا چچا کے علاوہ سب بڑے حویلی کے صحن میں ایک قطار میں لگے ہوئے موڑھوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے، اسے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔

”آجا میری دہی..... یہاں بیٹھ۔“ چچی جان نے اسے پکارا وہ مسکراتی ہوئی ان کے قریب بیٹھ گئی۔ درمیان میں رکھی لکڑی کی میز پر چائے کا تھرماس اور خالی کپ رکھے تھے۔ اسے شدت سے چائے کی طلب ہو رہی تھی۔

اس نے سوال کیا۔ دادی ماں بھی امی کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ امی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے کپڑے اٹھا کر بیگ میں رکھنے لگیں۔

”آپ نے بتایا نہیں، ہم تو کچھ دن یہاں رہنے آئے تھے پھر اچانک کیوں جا رہے ہیں؟“ وہ وجہ جانتی تھی لیکن ان کی زبان سے سننا چاہا ہی نہیں۔

”ارے دماغ خراب ہو گیا ہے چھوٹی بہو کا..... پہلے تو ہر صبح غلط بات میں بیجا حمایت کر کے بچوں کو بگاڑ دیا اور اب چاہتی ہے کہ.....“ امی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی دادی ماں غصے سے بول اٹھیں۔

”کیا چاہتی ہیں وہ؟“ اس کے چہرے پر بے بسی کے سب رنگ دکھائی دینے لگے۔

”یہی کہ اپنے اس کھٹو بیٹے سے ہم تمہارا رشتہ طے کر دیں۔“ امی جان کپڑے رکھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

”اور میں کہہ دیتی ہوں بے شک وہ میرا پوتا ہے لیکن میرے جیتے جی میں ایسا بے جوڑ رشتہ کرنے کی حامی بھی نہ بھروں گی۔“ دادی ماں نے غصے میں امی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آئی کہ اس کے ذہن میں یہ خیال آیا بھی کیسے؟ نفیس عمر میں بھی ملی سے دو برس چھوٹا ہے اور اس فرق کو نظر انداز کر دیں تب بھی وہ کسی طرح ملی کے لائق نہیں ہے۔“ وہ دونوں اسی موضوع پر اظہار خیال کر رہی تھیں اور ملی خاموشی سے خالی ذہن کے ساتھ ان کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

رات کروٹیں بدلتے گزر گئی تھیں۔ صبح وہ نماز پڑھ کر چھت پر چلی آئی۔ ذہن دلد پر جمود طاری تھا۔ وہ زائدہ چچی کے آج تک کے پیٹھے روئے کو اب آ کر سمجھ رہی تھی۔ لوگ اور رشتے ایسے اچانک بھی بدل سکتے ہیں۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کرب سے ہلکا سا سسکرائی اور پھر کرسی پہنچ کر اس پر بیٹھ گئی۔ ناشتہ

جسے بولنے کی تیز ہے نہ پہننے کا ڈھنگ اور پائی داوے میری ترجیحات میں انہی شادی کہیں نہیں ہے۔“ اس کے تو سر پر لگی توڑوں پر آنکھیں بھی تھیں۔

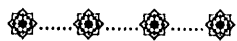
”جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو جیسے مرضی اپنے شوہر کو قتل دیتی رہنا۔“ نمرہ بے پروائی سے بولی۔

”آج تو یہ بات کر دی ہے، دوبارہ مذاق میں بھی کی تو میں برداشت نہیں کروں گی۔“ وہ غصے سے کھلتی ہوئی کچن سے باہر آ گئی۔

تبریز چچا جتنے سلجھے ہوئے اور دھیسے مزاج کے تھے۔

قسمت سے ان کی بیوی اتنی ہی تک چڑھی اور تیز مزاج کی تھیں۔ وہ اوپر سے تو ہر وقت میٹھی چھری بنی رہتی تھیں لیکن اندر ہی اندر ملیہ سے خار کھاتی تھیں۔ ان کے تینوں بچے بہت مشکل سے دسویں کا امتحان پاس کر پائے تھے۔ کچھ ماں نے ان کی تربیت بھی ایسی کی تھی کہ ان کے بٹرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تبریز یعنی ان کے شوہر بھی اٹھتے بیٹھتے ہر وقت ہر دم تنبی کا دم بھرے نظر آتے تھے۔

ایسے میں ان کے تیز دماغ نے اچانک یہ منصوبہ بنایا کہ ملیہ کو بہو بنا کر اس کو اس گھر میں لے آئیں۔ جس سے اس کی تعلیم بھی ادھوری رہ جائے اور جائیداد بھی گھر میں آجائے۔ شوہر کے مشورے کے بنا اس خیال کا اظہار انہوں نے جھفٹانی اور ساس سے بھی کر دیا تھا۔ جو مصلحتاً خاموش ہو گئی تھیں۔



”ہم صبح واپس جا رہے ہیں۔“ اماں نے زہر مار کر چند لقمے لیے اور اٹھ کر کمرے میں آ گئی تھیں۔ جو کچھ نمرہ نے کہا تھا اگر وہ سچ تھا تو وہ ناقابل برداشت تھا۔ جب تک امی سے اکیلے میں بات نہ ہو جاتی وہ کچھ بول کر خود کو بے وقوف ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب امی نے کمرے میں داخل ہو کر ایک جملہ کہا اور اپنے دھلے ہوئے کپڑے تہہ کرتے ہوئے خود کو مصروف ظاہر کرنے لگیں۔

”اچانک کیوں جا رہے ہیں؟“ گہری سانس بھر کر

تیار ہوا تو نمبر نے پھولے منہ کے ساتھ اسے آواز دی۔  
 ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ بے تاثر انداز میں کہہ کر  
 رخ موڑ گئی۔ اچانک موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ گود  
 میں دھرا فون اٹھا کر اس نے کال ریسیو کی۔

”نہیں نہیں۔ آپ وقت اور دن تبدیل نہ کریں، میں  
 آج واپس آ رہی ہوں۔ ان شاء اللہ وقت پر ملاقات  
 ہوگی۔“ وہ جو کوئی بھی تھا سلام دعا اور حال چال کے بعد  
 ملاقات کے لیے اصرار کر رہا تھا۔

”جی بالکل میری کوشش یہی ہے کہ اپنی فیملی کو بھی  
 ساتھ لے کر آؤں۔“ دو چار مزید رسمی باتوں کے بعد وہ نیچے  
 جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو سامنے زاہدہ چچی کھڑی  
 تھیں۔

”کس کا فون تھا؟“ ان کے چہرے پر عجیب سے  
 تاثرات تھے۔

”دوست کا تھا۔“ وہ سپاٹ انداز میں کہہ کر آگے بڑھ  
 گئی۔

”یہ وہی ہے ناں جو اس دن بھی تم سے ملنے کے لیے  
 کچھ کہہ رہا تھا؟“ وہ میزبیاں اتر رہی تھیں جب پیچھے سے  
 آئی ان کی تیز آواز پر آخری سیڑھی پر ساکت ہو گئی۔ اسے

یاد آیا کہ اس دن جب اس کے موبائل میں چار جنگ ختم  
 ہو گئی تھی۔ تو اس نے لینڈ لائن سے فون کیا تھا جو اٹھایا نہیں  
 گیا، جب دوبارہ فون آیا اور وہ سن کر باہر نکلی تھی تو چچی نے  
 اس سے کچھ سوالات پوچھے تھے اسے لگا کہ فون کی بیل کی  
 آواز آئی ہوگی اس لیے پوچھا ہوگا لیکن اب اسے یقین  
 آ گیا کہ اس دن بم آمدے میں دوسرے ریسیور سے انہوں  
 نے اس دن کی ساری گفتگو سن لی تھی۔

”آپ میری بڑی ہیں۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی  
 ہوں۔ میں کس سے بات کرتی ہوں، کس سے ملتی ہوں ان  
 معاملات میں باز پرس کرنے کا اختیار میری ماں اور دادی  
 ماں کو ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔ لہجے میں کہہ کر آخری سیڑھی  
 اتر گئی۔

”ایک بچپن سے یہاں پھنسیا ہوا ہے جو ہر وقت دم

ہلاتا آگے پیچھے گھومتا رہتا ہے اور دوسرا شہر میں ملنے کو ترس  
 رہا ہے اور خود بہت اعلیٰ چیز جتنی بھی ہے۔ تم سے تو ہماری بیٹیاں  
 اچھی ہیں۔ کم پڑھی لکھی ہیں لیکن غیر مردوں کو پھنسانی نہیں  
 پھر رہی ہیں۔“ وہ اپنے اندر کا زہر باہر نکال رہی تھیں۔

”بس چچی..... میرے کردار پر آپ انگلی نہیں اٹھا  
 سکتی۔ میں یہ برداشت نہیں کروں گی۔“ وہ بولی تو اس کا  
 ایک ایک لفظ قطع تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی سے اس  
 انداز میں بات کر رہی تھی اور ایسا کرنے پر اسے مجبور کر دیا  
 گیا تھا۔ اس کی آواز سن کر سب باہر آ گئے تھے۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ سب سے پہلے اس کی امی  
 آ گئی۔

”پوچھو اپنی بیٹی سے کس کے فون آتے ہیں اسے.....  
 دونوں طرف آگ لگی ہوئی ہے، ملنے کو ترسے ہوئے  
 ہیں۔ شہر پڑھانے لے گئی تھیں اس کو یا عشق محبت  
 سکھانے؟“ چچی کو جھٹانی کی خاموشی میں کل ہی انکار نظر  
 آ گیا تھا اور آج وہ اپنا اصلی روپ دکھا رہی تھیں۔

”میری بیٹی کیا ہے، کیسی ہے، کیا کرتی ہے، یہ سب  
 جاننے کے لیے مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ میں اتنا جانتی  
 ہوں کہ یہ کبھی ایسا کام نہیں کرے گی کہ میرا سر کسی دوسرے  
 کے آگے شرم سے جھک جائے۔“ زاہدہ نے لفظ دوسرے  
 پہ زور دیتے ہوئے آگے بڑھ کر ملی کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر  
 اسے احساس دلایا کہ وہ اس کے ساتھ کھڑی ہیں۔

”تو پھر اس سے کہو بتائے کہ وہ شخص کون ہے، جس  
 سے یہ یہاں سے جا کر ملنے والی ہے۔ ہمیں بھی تو علم ہو کہ  
 کتنا اعلیٰ کردار ہے اس کا۔“ وہ استہزائیہ انداز میں  
 مسکرائیں۔

”اب بس کرو فرزانہ..... بند کرو یہ تماشا۔“ تبریز چچا  
 غصے میں بیوی سے بولے۔

”کیوں بس کرووں، آپ بھی تو ہر وقت ملی ایسی، ملی  
 ویسی کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو بھی تو پتا چلنا چاہیے کہ ملی  
 کیسی ہے؟“ چچی دو ٹوک انداز میں بولیں۔

”یہ نہ ہو ملی کیسی ہے یہ جاننے کے بعد تمہارا سر شرم

سیکڑوں بچے کتاب کی تقریب میں بی۔ کے۔ بی یعنی ملی سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کا انوکھا لہجہ لہنا چاہتے ہیں۔ ملی یہاں آگئی اور اسے تقریب میں جانا مشکل لگ رہا تھا۔ اسی لیے وہ تسلی کرنے کے لیے بار بار نون کر رہے تھے۔ ملی اس بات پر شرمندہ تھی کہ وہ یہ بات خود دادی اور اماں کو بتا نہیں سکی، لہذا اس نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی کہ میں آپ دونوں کو یہ بات بتا دوں۔ تقریب میں یہ ہم سب کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی اس عورت کی جہالت اور غم عقلی نے یہ سب بکھیرا کھڑا کر دیا۔ ”اُدھر چچا کی بات مکمل ہوئی اور اُدھر زائدہ کی آنکھوں سے شکرانے کے آنسو جاری ہو گئے۔ ان کا اعتماد بچا نہ تھا۔ وہ کچھ لمحے کے لیے واقعی ڈر گئی تھیں لیکن شکر تھا کہ ان کی بیٹی نے انہیں سرخرو کر دیا تھا۔

”تمہاری تسلی ہو گئی ہو تو اب ہٹو راستے سے بالاج بیٹا، سامان گاڑی میں رکھو۔۔۔۔۔۔ کافی وقت ہر گیا ہے پہنچتے پہنچتے انہیں شام ہو جائے گی۔“

”آپ کو اتنا کچھ پتا تھا تو اتنا عرصہ چھبایا کیوں؟“ وہ عجیب عورت تھی جس کے لیے سب جان کر بھی تسلی کرنا مشکل ہو رہی تھی۔

”بچپن سے اب تک ملی بونوں کی تلاش کرتی رہی، ان کو سوچتی رہی، کہانیاں گھڑتی رہی۔۔۔۔۔۔ بونے دیکھنے کی خواہش نے اسے لکھاری بنادیا، ہو سکتا ہے میں سب کو بتا دیتا لیکن اگر میں نے بتا دیا ہوتا تو ملی یہ کیسے جانتی کہ بونے قد کے نہیں سوچ کے چھوٹے ہوتے ہیں۔“ انہوں نے آخری جملہ ادا کیا تو ملی چونکی۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں چاچو۔۔۔۔۔۔ آج میری تلاش کی حقیقت سامنے آگئی ہے۔ میں چھوٹے قد کے وہ لوگ ڈھونڈتی رہی جو خود سے زیادہ مضبوط، سچے اور بہادر ہوتے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ننھے وجود اپنے معمولات کیسے ادا کرتے ہوں گے، کیسی جان فشانی سے محنت مشقت کر کے زندہ رہتے ہوں گے لیکن آج سمجھ میں آ رہا ہے بونے قد سے چھوٹے ہوں یہ ضروری نہیں ہے۔

سے جھک جائے۔“ چچا نصیحتانہ انداز میں بولے۔

”مجھے باتوں میں نہ الجھائیں۔ اس سے کہیں اس شخص سے اپنا تعلق، یہاں سب کے سامنے بتائے۔“ انہوں نے ہاتھ نچاتے ہوئے تیز تیر لہجے میں کہا۔ اب تو دادی ماں اور امی کے چہرے پر بھی شک کے سائے نظر آنے لگے تھے۔ ملی مجرموں کی طرح خاموش کھڑی رہی۔

”میں بتانا ہوں اس شخص سے ملی کا کیا تعلق ہے۔“ بالاج بتا نہیں کب سے دروازے پر کھڑا یہ سب رہا تھا۔ ملی کو ایسے کٹہرے میں کھڑے دیکھ کر اس سے برداشت نہ ہوا تو وہ بول اٹھا۔

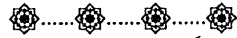
”نہیں بالاج۔۔۔۔۔۔ ایسے نہیں۔۔۔۔۔۔ چاچو منع کریں اسے۔“ وہ نہیں چاہتی تھی کہ امی اور دادی ماں کو ایسے اچانک علم ہوا اور انہیں دکھ ہو۔

”نہیں بیٹا۔۔۔۔۔۔ اسے بتانے دو۔ تم میری بیٹی ہو، ایک باپ کے لیے بیٹی کی عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ جس بات کو چھپانے سے تمہارے کردار پر حرف آ رہا ہے اسے چھپانے سے بتانا بہتر ہے۔“ ملی کے التحاشیہ انداز میں بات کرنے پر ان کا دل کٹ گیا۔ انہوں نے ملی کو شانے سے لگایا۔ زائدہ اور دادی ماں اس سب سے بالکل انجان تھیں۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ یہ سب کس بارے میں بات کر رہے ہیں اور اس بات کا ملی سے کیا تعلق ہے۔

”تم تو خاموش ہی رہو جیسے میں نہیں جانتی کہ تم اس آوارہ کے پیچھے کیسے پھرتے رہتے ہو۔“

”بس فرزانہ اب ایک لفظ بھی اور نکالا تو میں بھول جاؤں گا کہ تم میرے بچوں کی ماں ہو۔ سکندر بھائی کی وفات کے بعد اس بچی نے بچوں کے ایک رسالے میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ حالات ایسے بن گئے کہ وہ کسی سے یہ بات کہہ نہ سکی۔ بالاج کو بھی علم ہوا تھا اور بالاج سے ہی مجھے پتا چلا تھا۔ وہ شخص جو مسلسل نون کر رہا تھا وہ ایک معروف ادارے کا پبلشر ہے اور اس کی کتاب چھاپ رہا ہے چونکہ جس نام سے ملی لکھتی تھی وہ کسی نام تھا اور کوئی اس بات سے واقف نہیں کہ یہ لکھاری اصل میں ہے کون۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے پاس ہم میں ہی اونچے قد کے بونے لوگ پائے جاتے ہیں جو موقع ملنے پر اپنے اندر کا بونا باہر لانے میں دیر نہیں کرتے، میرے لفظوں سے کسی کو دکھ پہنچاؤ تو معافی چاہتی ہوں۔“ وہ چچی کی طرف دیکھتی آخری جملے میں اپنا ظرف دکھا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ فرزانہ کے پاس اب کہنے کے لیے اور کچھ نہیں بچا تھا۔



”مجھے بھی آؤ گراف ملے گا؟“ وہ بچوں کو آؤ گراف دے دے کر تھک گئی تو ہال کے تقریب والے حصے سے نکل کر لان کی طرف آ گئی۔ سنگی بچہ بیٹھ کر وہ کچھ دیر پہلے کے لمحات یاد کر کے مسکرا رہی تھی۔ تقریب میں ملک کے کئی نامی گرامی ادیب موجود تھے اور سب یہ جان کر کہ وہ بی بی کے۔ بی بی بہت حیران ہوئے تھے۔ کسی نے نہ سوچا تھا کہ اتنا اچھا لکھنے والا اور بچوں کا بے حد پسندیدہ یہ لکھاری ایک خوب صورت اور اتنی کم عمر لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔

دادی ماں اور اماں بھی تقریب میں شامل تھیں۔ تبریز، چچا، بالاج کے ہمراہ سیدھا ہال ہی آئے تھے۔ ملی کی اس قدر پذیرائی پر سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ ملی ان کے چہرے کی چمک یاد کر کے خوشی سے سرور ہو رہی تھی کہ اس کی آواز پر چونکی پھر کھل کر ہنس دی۔

”تم تو سب سے پہلے مجھے جان گئے تھے۔ تمہارا تو پہلا حق بنتا تھا۔ کتاب کھول کر انتساب پڑھو۔“ اس نے بچہ پر آ گے کھسک کر اسے بیٹھنے کی جگہ دی اور اس کے ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

”اس دوسرے کے نام جس کی آنکھوں میں دلی کے بچپن کے سب خواب جاگتے نظر آتے ہیں۔“ وہ پڑھ کر گنگ رہ گیا۔

”سمجھ نہیں آ رہی کیا کہوں۔“

”نہیں سمجھ آ رہی تو کچھ نہ کہو۔“ وہ پچلا ہونٹ دبا کر

شرارت سے بولی۔

”فرزانہ چچی نے اس دن میری وجہ سے بھی تم پر انگلی

اٹھائی، اس کے لیے دل سے شرمندہ ہوں۔“ وہ دھیمے لہجے میں اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”وہ سب باتیں میں پھلا بچکی ہوں۔ یہ سب اتنا خوب صورت ہے کہ میں کوئی نیا بات یاد رکھنا ہی نہیں چاہتی۔“ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی۔ بولتے وقت اس کی آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

”اب اندر چلیں۔ سب حیران ہو رہے ہوں گے۔ ہم کہاں چلے گئے۔“ ملی نے شکستگی سے کہا۔ بالاج نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ دونوں قدم سے قدم ملاتے ہال میں داخل ہوئے۔

”بات سنو۔۔۔۔۔“ ملی نے سرگوشی کی۔

”بولو۔“ وہ دل و جان سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں نے جب بھی کبھی شادی کرنے کے بارے میں سوچا تو صرف تمہارے بارے میں ہی سوچوں گی۔“ نظریں جھکائی، شرمیلی لہجائی وہ کہہ کر تیز قدموں سے اسٹیج کی طرف بڑھ گئی تھی۔ بالاج وہیں قہقہہ کر رہا تھا۔ وہ ابھی ہال میں داخل ہونے سے پہلے اس کے ساتھ چلتے ہوئے یہی بات سوچ رہا تھا کہ وہ ملی سے عمر بھر اس ڈر سے اظہار نہیں کر سکے گا کہ اگر اس نے انکار کر دیا تو وہ برداشت نہ کر سکے گا۔ وہ اس کی آنکھوں کے ساتھ اس کا دل پڑھنا بھی جانتی تھی۔ جب ہی تو اس کے اندر کے ڈر کو جان کر پہل کر گئی تھی۔ اس کا دل کیا خوشی سے اچھل کر خوشی کا اظہار کرے، دل کے شور کو دبانے کی کوشش کرتے اس کی نظر تبریز، چچا پر پڑی جو کچھ فاصلے پر موجود اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے انگوٹھا دکھا کر گلدک کا اشارہ دیا۔ وہ ایک بار پھر حیران ہوا یہ چچا اتنی دور سے کیسے سمجھ گئے تھے یہاں ابھی کیا ہوا ہے پھر سر جھٹک کر آنے والے وقت کو سوچ کر کھل کر ہنس دیا تھا۔





# فیصل الحسین

امید سان قاضی

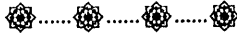
ہجر کی تمازت سے وصل کے الاؤ تک  
لڑکیوں کے جلنے میں دیر کتنی لگتی ہے  
بات جیسی بے معنی بات اور کیا ہوگی  
بات سے مکر نے میں دیر کتنی لگتی ہے

”مجھے تو اس کی خواہش سے کوئی مسئلہ نہیں ہے، ابہتاج کی ماں۔ آپ خود سوچیں کہ جس نے زندگی گزارنی ہے اگر زندگی کا ساسھی ہی اس کی پسند کا نہیں ہے تو فائدہ آپ صاف صاف جا کر اپنی بھالی کو یہ بات بتا دیجئے اور مریم کا رشتہ طلب کر لیجئے۔“ انہوں نے کمال اطمینان سے کہا۔ سعیدہ پھوپھو کو دکھ سے اپنے نصف بہتر کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”آپ کے نزدیک اتنی ہی آسان بات ہے یہ..... شاکستہ پر کیا گزرے گی آپ نے سوچا ہے اور پہلے تو میں ایسی کوئی حماقت نہیں کرنے والی آپ کے بیٹے کی بے وقوفی میں اس کا ساتھ دے کر باقرض ایسا ہو بھی گیا تو کیا قیامت نہ ٹوٹے گی میرے بھائی کے گھر پر..... میں تو آپ کے پاس یہ فریاد لے کر آئی ہوں کہ خدا را اپنے بیٹے کو سمجھائیں کہ چھوڑ دے یہ فضول کی ضد اور اس بات کو یہیں دل ہی میں دفن کر لے، مرد ذات تو ویسے بھی ڈال ڈال پھرنے والے بھنورے کی طرح ہوتا ہے۔ کسی کی ہنسی پسند آگئی تو کسی کا رکھ رکھاؤ اب سب سے شادی تو نہیں ہو سکتی ناں؟ اس عمر میں ہر نی اور انوکھی چیز بھائی ہی ہے۔ فوراً اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ دیکھئے گا کتنی جلدی یہ سب بھول بھال جائے گا اور آنے والے دنوں میں بیٹھ کر اپنی بے وقوفیوں پر ہنسے گا مجھے پتا ہے وہ آپ کی کتنی سنتا ہے، آپ بات کریں گے ناں اس سے..... سمجھائیں گے ناں؟“ وہ التجائے انداز میں بولیں۔

”دیکھو سعیدہ..... یہ کسی کپڑے کی یا کتاب کی بات نہیں ہو رہی۔ زندگی بھر کے ساتھ کا سوال ہے، آپ کہتی ہیں تو میں اس سے بات کر لوں گا لیکن مجھے نہیں لگتا کہ وہ آپ کی بات پر راضی ہوگا۔ اسے شروع سے ہی اس رشتہ پر اور آپ کی بیٹی کے انداز و عادات پر اعتراض تھا۔ میں کہتا رہا آپ سے کہ پھر سوچ لیں مگر نہیں آپ کی ایک ہی ضد کسی کہیں میری بیٹی اتنی خوب صورت ہے کہ وہ اس کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا اور اتنی خوب صورت اور سمجھ بوجھ رکھتی ہے کہ اسے اپنا بنالے گا دیکھ لیں اب..... میں صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ ہمارا وقت اور تھا بچے ماں باپ کی مرضی کے مطابق ان دیکھئے ان چاہے رشتوں میں بندھ بھی جاتے تھے رشتے نہ بھی جاتے تھے میں اپنے بیٹے کے ساتھ کسی قسم کی زور زبردستی نہیں کروں گا یہ بات آپ اپنے ذہن میں بٹھالیں۔“ انہوں نے صاف صاف جواب دے دیا تھا۔ سعیدہ پریشانی میں گھر گئی تھیں اور ایک بار پھر ابہتاج ملک سے بات کرنے کی ٹھانی مگر ہر قسم کا سمجھانا

قسمیں، منت و ترے سب بیکار گیا تھا۔ اس لڑکی کی ایک دو ملاقاتوں کا سحر، ابہاج ملک پر اتنا حاوی تھا کہ ایک عرصہ سے جڑے بندھن کو وہ لمحوں میں توڑنے کے لیے تیار تھے۔ آخری قسم سعیدہ بیگم نے اپنا مرا منہ نہ دیکھنے کی دی تھی، ابہاج ملک بغیر کچھ کہے چپ چاپ بیک اٹھا کر واپس ہاسٹل چل دیئے تھے۔



سلطانہ تائی بیچوں کے ساتھ آئی تھیں۔ منعہا کی شادی کا دعوت نامہ لے کر، ساتھ ہی یہ بھی کہنے کہ ان کو اماں جان نے بھیجا ہے کہ شادی میں ایک ہفتہ ہی رہ گیا ہے، اگر شیرہ شادی سے قبل آجائے تو ان کو بہت خوشی ہوگی مگر صفیہ تائی ان کو دیکھ کر بھڑک گئیں۔ شادی کا دعوت نامہ تنگ غصے سے پھاڑ دیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ ان کا اب ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔ سدرہ چچی کو ہی عقل آئی اور وہ بھاگ کر اماں، جی کو ان کے کمرے سے جگلا لیں کہ زکام اور بخار کے باعث وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے دوا لے کر لیٹی تھیں۔

فجر آج اپنی رول نمبر سلپ لینے کا جگ لگتی تھی۔ آیت اور سدرہ چچی کچن میں تھیں۔ شیرہ آفس مرد سارے باہر جب کہ فجر پر آج بہت دنوں بعد پینٹنگ کرنے کا شوق چرایا تھا۔ سونا شستے کے بعد ہی اس نے آرڈر جاری کیا تھا کہ اس کے کام میں خلل نہ کیا جائے۔ جب تک وہ خود کمرے سے باہر نہ آئے؟ ویسے بھی آج دن میں کام کی باری آیت کی تھی، فجر کی ناشتے میں اور اس کی شام میں بھی، سو اس کے اس آرڈر پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ جب سلطانہ تائی کو اجمل چھوڑ کر گیا تھا تو ان کو تائی صفیہ ہی ملی تھیں۔ وہ تو تائی صفیہ کی تیز آواز سن کر سدرہ چچی کچن سے بھاگیں اور صورت حال کا اندازہ کر کے فوراً ہی اماں جان کی دوا یا طبیعت خرابی کا سوچے بغیر ان کو جگا کر مختصر صورت حال بتائی وہ افناں و خیراں بھاگی چلی آئیں۔

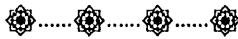


”گھر کے فرد کی عادات، کردار اور طور طریقوں سے گھر والے کیسے بے خبر ہو سکتے ہیں۔ میری بچی کی ویران زندگی میں یہ سب شریک ہیں۔“ صفحہ تھک ہار کر رو دیں۔

”بخدا بھابی، قسم لے لیجئے جو عبدالحمید نے ہمیں اپنے کسی ارادے کی بھنک بھی پڑنے دی ہو اور وہ واقعی باشعور، فرماں بردار اور سمجھ دار پرجہ ہے، نجانے اس نے خود ہی یہ فرار اختیار کیا ہے یا اس کو کسی نے مجبور یہ تو رہ ہی بہتر جانتا ہے مگر یقین کریں شیرہ ہم سب کو اپنی بچیوں کی طرح عزیز ہے۔ یوں سمجھیں ہمیں تو شیرہ کے ساتھ ساتھ عبدالحمید کی بھی فکر لاحق ہے کہ وہ بالکل بھی ایسا بچہ نہیں ہے۔ اماں جہاں کو دیکھیں تو عبدالحمید کی فکر میں گھلتی جا رہی ہیں، گوشہ نشینی کو عرصہ ہوا، اختیار رکھ کر بھی، اب تو بات کا جواب بھی مشکل سے دیتی ہیں۔ کھانا پینا بھی کم کر دیا ہے، بس روتی رہتی ہیں۔ کتنی ہیں میرے گھر سے تو دو جگر کے ٹکڑے چلے گئے ہیں آنگن سونا کر کے۔“ سلطانہ بیگم نے سہجاء سے بات کی۔

”ہمارا یقین رکھیں اماں جان کہ ایک بار عبدالحمید کا پتا چل جائے بس، اگر وہ قصور وار ہوا اور اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے تو سزا دینے والوں میں ہم آپ سے بھی پہلے کھڑے ہوں گے۔ اماں جہاں تو بہت رورہی تھیں کہ جس گھر سے بڑے مان سے بہو لے کر آئی ہوں، اسے کس منہ سے شادی کا بلاوا دینے جاؤں، ہماری بات کا یقین آ جائے تو بچی کو کڑھتی پر دعا دینے آ جائے گا گلے جھکو..... چلتی ہوں اب۔“

”ہم سمجھتے ہیں سب کچھ اور ہم ضرور آئیں گے، شیرہ کو لے کر، بس مالک میری بچی کا نصیب کھول دے۔ اس کی خوشیاں لوٹا دے۔ اگر تو عبدالحمید نے جان بوجھ کر یہ سب کیا ہے تو مالک اس کو ہدایت دے۔ اگر کسی مشکل میں گرفتار ہے، تب بھی اس کی اور ہماری مشکل کو آسانی میں بدل دے۔“ اماں جان آرزو ہو گئیں۔ سلطانہ نے بھی پورے دل سے آمین کہا تھا جبکہ تائی صفیہ اب بالکل خاموش تھیں۔ اتنے میں سدرہ چچی لوازمات سے بھری ٹرائی کے ہمراہ آئیں اور سب کچھ میز پر لگانا شروع کر دیا۔



”نیں مسٹر عبدالحمید..... کیا آپ تک میری آواز پہنچ رہی ہے؟“ بہت دور سے اسے کوئی پکار رہا تھا۔ اسے بولنے اور آنکھیں کھولنے پر مجبور کر رہا تھا مگر اس آواز سے اس کے دماغ میں ٹیسس اٹھ کر اسے اذیت سے بے حال کرنے لگیں..... وہ چاہ رہا تھا کہ وہ آواز بند ہو جائے، وہ بولنا چاہتا تھا۔ آنکھیں کھول کر خوب چیخ کر اس آواز کو خاموش کرانا چاہتا تھا مگر درد کی شدت حد سے سوا بھی، تھک ہار کر اس نے خود کو حالات کے دھکاوے پر چھوڑ دیا کہ اب شدید درد ہی ہر آواز پر حاوی ہو چلا تھا۔

”شکر ہے..... آج کی تھراپی کے بعد ان کے جسم کے کچھ آرگنز نے لائیٹ سا ریپسائس دیا ہے۔ بہتری کی امید کی جاسکتی ہے مگر ابھی یہ پوری طرح خطرے سے باہر نہیں ہیں۔ آپ ان کے کانٹیکٹس دیکھ کر ان کی ریلیٹوز سے جلد از جلد رابطہ کریں۔“ ڈاکٹر نے پیشہ ورانہ انداز میں کمپنی ورکر سے کہا جو اس خوفناک ایکسیڈنٹ کے بعد اس کو یہاں اس اسپتال میں لایا تھا اور اس کے کاغذات میں اس نے صرف ایک ہی نمبر لکھوایا تھا۔



”اوہ میرے خدایا.....! یہ کیا بے وقوفی کی میں نے..... میچنگ کے چکر میں پرس تو تہہ بل کر لیا۔ رقم رکھنا بھول گئی..... کالج تک تو اسے ایمان چھوڑ گیا تھا۔ سلف لے کر وہ کالج سے باہر آئی اور روڈ پر چلتے ہوئے جب اس نے رول نمبر سلف رکھنے کے لیے پرس کھولا تو یہ ہوش ربا انکشاف ہوا کہ پاؤج میں سوائے ایک لپ اسٹک اور آئینے

کے سوا کچھ بھی نہیں۔

”فون بھی نہیں لے کر آئی کہ کسی کو کال کر کے بلا لیتی۔“

”ایسا کرنی ہوں کہ میں روڈ پر جا کر آٹو لے لیتی ہوں پھر اسے گھر تک لے جا کر کرایہ دے دوں گی۔“ اس نے فیصلہ کیا اور چادر کو اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹی وہ تیز قدموں سے چلنے لگی تاکہ جلد از جلد مین روڈ تک پہنچ سکے۔

”اف اب یہ بھی آج ہی ہونا تھا۔“ کچھ دیر میں اس کی نازک سی چنبل اس کے ہاتھ میں تھی کہ وہ گرمی کا اتنا لمبا سفر وہ بھی پتھر کی سڑک پر برداشت نہیں کر پائی اور دم توڑ دیا تھا۔

”ارے ارے رکو..... رکو اجمل..... اجمل بھائی..... میں فجر۔“ اور ٹوٹی ہوئی چنبل ہاتھ میں لیے وہ اجمل کو روکنے میں کامیاب ہوئی گئی تھی۔ جو گاڑی میں تھا اور اس کو دیکھ چکا تھا۔

”جیسے آج کل ہم دونوں کے گھر کے حالات چل رہے ہیں ناں تو آپ خود رک کر بھی مجھے لفٹ دیتے تب بھی میں نے لفٹ نہیں کرانی تھی مگر آج یوں سمجھیں اس روڈ پر آپ کو خصوصی طور پر میرے لیے ہی بھیجا گیا ہے، اتنی شدت سے دعائیں مانگ رہی تھی میں کہ کوئی نہ کوئی سبب بن جائے اور آج یقیناً آ گیا کہ دل سے کی گئی دعا کبھی رد نہیں ہوتی۔“ وہ پھولی سانس کے ساتھ بولی۔

اجمل کیا کہتا مسکرا کر چپ رہا کہ اس کے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی چنبل ہی آدھی کہانی سن رہی تھی۔ باقی اس کا اس طرح سر راہ مل جانا اس کی بھی دل سے نکلی دعا تھی کہ سلطانہ بیگم کو اماں جان کے گھر چھوڑنے گیا تھا۔ انہوں نے وہیں دروازے سے ہی اسے رخصت کر کے کہا تھا، آدھے گھنٹے بعد انہیں لے جائے۔ دل کی خواہش دل میں دبائے وہ بچھے دل کے ساتھ لوٹ آیا تھا۔ شیرہ عبدالحنان والے قصے کے بعد تو ویسے بھی حالات کشیدگی کی طرف ہی رواں دواں تھے اور جب تک عبدالحنان کی واپسی نہ ہو جاتی، بہتری کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

”ویسے سچ بتائیں آپ کو کبھی نہیں پتا کہ عبدالحنان کہاں ہے، گھر چھوڑ کے کیوں گیا اور کب واپس آئے گا؟“ جیسے ہی گاڑی دوبارہ سے چلی، فجر کے حواس ٹھکانے آئے تو سوال کیا۔ اس کے مشکوک سے سوال پر وہ اپنے خیالات سے باہر آیا۔

”میں واقعی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے اور اس نے ایسا کیوں کیا؟ ابانے تو اخبار، ٹی وی کے علاوہ اسپتال بھی چھان مارے ہیں، اس کے سب دوست بھئی لاعلم ہیں کہ وہ کہاں ہے۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے؟“ اس کے لہجے میں واقعی پریشانی تھی۔

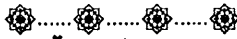
”ارے بھئی بھانگنا تھا گھر سے تو شادی سے پہلے ہی یہ خواہش پوری کر لیتے۔ ہماری شیرہ کی زندگی کو ضرور داؤ پر لگانا تھا۔ مودہ کی شادی کے بعد تانیا اور ابانہ عدالت سے رجوع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور آخر کار جس رشتے کے بننے سے پرانے تعلقات دوبارہ استوار ہوئے تھے، اسی کے ٹوٹنے سے سب کچھ ویسا بلکہ اس سے بھی برا ہو جائے گا۔“

”اللہ نہ کرے۔“ اجمل کے منہ سے بے ساختہ نکلا پھر وہ اپنی بے اختیاری پر خود ہی گھبرا کر دلیل دینے لگا۔

”اور اس سے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے ناں۔ حالات بہتر بھی تو ہو سکتے ہیں۔“ وہ پرامید ہوا۔

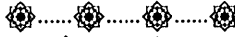
”ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے مگر آج جس جانب اشارہ کر رہے ہیں وہ کچھ مثبت نہیں..... روڈ پر ہی اتار دیں مجھے۔ تانکی کو پتا بھی چل گیا کہ جہاں منزل میں سے کسی کے ساتھ آئی ہوں، غصہ کریں گی بہت۔“ جانے پہچانے راستے نظر آتے ہی اس نے جلدی سے کہا۔ اجمل نے سر ہلاتے ہوئے گاڑی تھوڑی دور جا کر روک دی یہ اور بات

تھی کہ اس ملاقات کے بعد اجل کا موڈ بہت اچھا ہو گیا تھا۔



منتہا جلے پیر کی بلی کی مانند کمرے میں یہاں سے وہاں چکرار ہی تھی۔ آج شام میں اس کے سسرال سے مہندی آئی تھی، گھڑکی تمام لڑکیاں اسی خوشگوار قسم کی مصروفیت میں گھری تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کل منتہا کی خالہ ایک بار پھر بیٹے کے لیے ہاتھ پھیلائے آئی تھیں مگر اماں جہاں نے ان کا پہلے سے بھی برا حال کیا تھا اور منتہا کے سامنے ہی کیا تھا۔ منتہا بھی ٹھیک ٹھاک اپنے حق میں بولی تھی اور اماں جہاں سے دھمکیوں سے لے کر پاؤں پڑنے تک سب کچھ کر کے دیکھ لیا تھا مگر اماں جہاں اس سے منہ نہ ہوتی تھیں۔ اس نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اسے ایک بار عبدالعید کے ساتھ رخصت کر دیا جائے وہ دوبارہ مڑ کر یہاں قدم نہیں رکھے گی۔ وہ ان کی ہر شرط ماننے کو تیار تھی۔

”بس اماں جہاں..... میں نے جتنا آپ کا اور آپ کی بھوٹی عزت کا لحاظ کرنا تھا کر لیا، اب اور نہیں آپ دیکھیے گا کہ میں کیا کرنی ہوں؟ آپ نے میری خواہش مانی ہوتی تو میں آپ کے پاؤں دھو دھو کے پتلی گمراہ آپ جیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی نام نہاد عزت اور نمود نمائش کا پرچار کرتے ہوئے اپنے بچوں کو اس راہ تک لے آتے ہیں جس کی منزل سوائے تباہی اور بربادی کے کچھ بھی نہیں ہوتی۔“ خالہ کے تھکے تھکے قدموں سے پیر دنی دروازہ پار کرتے ہی وہ اماں جہاں کے پاس آئی اور ان کو یہ سب کہا اور روتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔



”اماں جہاں..... اماں جہاں..... وہ وہ منتہا اپنے کمرے میں نہیں ہے۔“ حواس باختہ سی سلطانہ تائی کمرے میں داخل ہوئیں، اماں جہاں کے ہاتھ سے فوراً ہی موبائل نیچے گرا وہ حسن سے بات کر رہی تھیں۔ جہاں ان کی حالت سے مجبور ہو کر اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ عبدالرحمان سے اس کا رابطہ تین ماہ پہلے ہوا تھا اور وہ کسی دوسرے ملک میں تھا اور اس رابطے کے بعد اس کا نمبر مسلسل بند ہے۔ وہ اپنے جاننے والوں سے، جو وہاں مقیم تھے، کو شش کر رہا ہے کہ عبدالرحمان سے رابطہ ہو سکے مگر ابھی تک کامیابی نہیں مل پائی۔ جیسے ہی کوئی سراغ ملا وہ سب سے پہلے ان کو بتائے گا۔

”یہیں گھر میں ہی ہوگی اور کہاں ہونا ہے اس نے، اچھی طرح سے دیکھو، ابھی تو آمنہ کو میں نے کہا تھا۔ اس کی مہندی کا رنگ دیکھ کر آئے، اس نے آ کر بتایا کہ بہت گہرا اور تیز رنگ آیا ہے۔“ انہوں نے گویا سلطانہ تائی سے زیادہ خود کو سلی دی اور پھر بیڈ سے نیچے اتر کر چپل پہنتے ہوئے خود بھی سلطانہ کے ساتھ باہر ہی آ گئیں۔ اڑے ہوئے رنگ کے ساتھ لڑکیاں اپنے مشترکہ کمرے میں ہی تھیں۔

”سب سے آخر میں کس نے اور کب دیکھا ہے؟“

”مم..... میں نے اماں جہاں۔“ وریش تو اماں جہاں کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر ہی ڈر گئی تھی۔

”میں نے کہا کہ نہا کر کپڑے بدل لو کیونکہ رشنا تیار کرنے کے لیے اسے آتی ہی ہوگی..... اس نے کہا سر میں درد ہے، ٹیبلٹ لی ہے درد کی، تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتی ہے۔ اسے کمرے میں اکبلا چھوڑ دیا جائے..... رشنا کے آنے سے پہلے وہ تیار ہو جائے گی..... پہلے تو ہم نے اس کے کمرے میں تیار ہونا تھا مگر اس کی طبیعت اور موڈ دیکھ کر ہم مہمان خانے میں اپنے کپڑے اور دیگر سامان لے کر چلے گئے اور ابھی پانچ منٹ پہلے اماں نے بتایا کہ منتہا گھر پر نہیں اور ہم سے پوچھا کہ وہ ہمارے ساتھ تو نہیں۔“

”اور یہ کب کی بات ہے..... مطلب کتنی دیر پہلے کی؟“  
 ”گھنٹہ تو ہو گیا ہوگا اس وقت۔“ وریشہ نے اندازے سے کہا۔

”ہم..... اور اب تک تو لڑکی والے اپنے گھر سے نکل گئے ہوں گے۔“ اماں جہاں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ پھر سلطانہ بیگم کی طرف مڑیں۔

”عنایت بی وہاں کے لیے تازہ پھولوں کا بندوبست کرنے گئی ہے..... ہماری اور اپنی چادریں لے آؤ سلطانہ مجھے لگتا ہے مالک کو شاید ابھی ہماری عزت رکھنا منظور ہے۔“  
 ”جی..... جی میں لاتی ہوں۔“ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

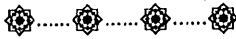
”ہم نے کسی کو بلا دیا انہیں بھیجا اس تقریب کا سوائے مریم کے گھر کے..... ہماری غیر موجودگی میں جو یہاں آ جائیں، کچھ بھی خبر کیے بغیر سب سنبھال لینا، ہم ابھی آتے ہیں۔“ چادر پہن کر انہوں نے سب کو ہی مخاطب کیا۔  
 ”آؤ سلطانہ۔“ اور سلطانہ تائی کو لے کر بیرونی دروازہ پار کر گئیں۔

”اف میرے خدایا..... کہاں گئی ہے یہ بے وقوف لڑکی، اب کیا کریں گے ہم سب؟“ مومنہ دونوں ہاتھوں میں سر کو تھام کر بیٹھ کر گری۔

”پتا نہیں اماں جہاں اس سے کیوں اتنی نرمی برت رہی ہیں۔ ایک بار ہوش ٹھکانے کیوں نہیں لگاتیں اس کے، اسی ڈھیلے نے تو اس کو ایسے شتر بے مہار بنا چھوڑا ہے۔“ وریشہ غصے سے بولی۔

”اچھا آپس میں لڑنے کی بجائے سوچو کہ اگر وہ نہ ملی تو کیا کریں گے؟ اور اماں جہاں ہم سمیت سب کو کیسی سبکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔“ آمنہ نے پریشانی سے کہا۔

مومنہ نے وضو کر کے باقاعدہ جائے نماز بچھالی۔ اس دوران اجمل اور تائی نے بھی کھانے کا انتظام بتانے کے لیے چکر لگایا تھا۔ آمنہ نے عقل مندی کی اور ان کو بتایا کہ اماں جہاں اور سلطانہ بیگم شیرہ کو لینے اماں جان کے ہاں گئی ہیں۔ وہ دونوں مطمئن ہو کر چلے گئے اور بارات کے آنے سے محض چند منٹ قبل لڑکیوں کی آنکھوں نے وہ حیرت انگیز منظر دیکھا، جس کا لگتی دیر بعد تک بھی یقین نہ آ سکا تھا کہ اماں جہاں اور تائی سلطانہ کے پیچھے مسکراتی ہوئی منہ ہنسی یوں جیسے وہ ان دونوں کے ساتھ پلنگ منانے ہی تو لگتی تھی۔ سلطانہ تائی کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات تھے، البتہ اماں جہاں کی آنکھیں اور چہرہ ناقابل فہم سے تاثرات بیان کر رہے تھے۔ آتے ہی اماں جہاں نے لڑکیوں کو تیاری کا حکم دیا اور اس سے پہلے کہ وہ منہا سے کچھ پوچھتیں، شیرہ کے ساتھ فجر اور شکر کی آمد نے غل کو گویا چار چاند لگا دیئے تھے۔ اماں جہاں نے شادی میں شریک ہونے کی منشا، شیرہ پر چھوڑی تھی تائی صنیہ ہرگز آمادہ نہیں تھیں، شیرہ نے ویسے تو دم سادھے رکھا تھا مگر اچانک ہی خود تیار ہو کر فجر اور شکر کو بھی تیار کر لیا تھا۔ دل میں اگرچہ اس سنگسار سے خوب خفا تھی جس نے جلد ہی سب کچھ صاف صاف بتانے کا وعدہ کر کے چپ سادلی تھی اور اس کے بعد سے وہ کبھی بکھار ہونے والے لبہم سے رابطہ کو بھی ختم کر گیا تھا۔



”اللہ کے واسطے منہا بتا دو کہ تم کیا کرتی پھر رہی ہو اور کیا ارادے ہیں تمہارے اور..... اور تم گئی کہاں تھیں..... اماں جہاں اور تائی اماں نہیں کہاں سے لے کر آئیں؟“ لڑکیاں جیسے ہی کمرے میں آئیں وہ سب کچھ جلدی جلدی جان لینا چاہتی تھیں۔ وہ تو اسی وقت ہی سب کچھ پوچھ لیتیں، اگر جو گھر پر مہمان نہ آئے ہوتے..... رسم کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلا کر رخصت کر دی گیا تھا۔ ان سب کو تائی کے ساتھ کچن سمیٹتے بہت دیر ہو گئی تھی مگر ذہن مسلسل

منہا کی طرف لگا ہوا تھا۔ اماں جہاں جو کچھ دن شیرہ کو روکنا چاہ رہی تھیں، اس واقعے کے بعد سے اتنی گم صم تھیں کہ رسما بھی شیرہ کو روکنے کے لیے نہیں کہہ سکیں، سو وہ بھی تقریب کے بعد لوٹ گئی تھی۔

”کیا تم..... تم اپنی مایوں والے دن اپنی خالہ کے گھر جا کر بیٹھ گئیں..... مگر کیوں؟“ منہا کے بتانے پر سب منہ حیرت سے کھل گئے۔

”ویسے ہی دل کر رہا تھا۔“ اس کے لیے نیازی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”تو بتا کر جاتے ہوئے زبان گھٹی تھی تمہاری..... کتنا پریشان ہوئے ہم سب؟ مگر نہیں تم کہاں رہ سکتی ہو سب کو پریشان کئے بغیر وہ بھی کسی نہ کسی اہم موقع پر۔“ وریشہ نے دانت پیسے۔

”تو زندگی گزارنے کا مزہ بھی تو اسی میں ہے ناں مائی ڈیر کزن..... بالچل، شور، مزہ..... تم لوگوں کی بھی کوئی زندگی ہے بھلا..... وہی صدیوں پرانی لگی بندھی روٹین گزارتے گزارتے مر جاؤں گی سب..... میں اگر مر جاؤں تو کم از کم یہ حسرت تو نہیں ہوگی ناں کہ جو چاہا اس کو پانے کی کوشش ہی کبھی نہیں کی۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی تو لڑکیاں حیرت سے اس کو دیکھ کر رہ گئیں۔

”ہم..... ہماری جان پر بن آئی تھی۔ تسلیج، نوافل، روزے کیا کچھ نہیں مان لیے ہم نے اس کی بازیابی کی صورت میں اور ان محترمہ کو فکری نہیں..... ان کو اپنی ازلی لا پرواہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بس اپنے دل کی خواہش چاہیے۔“ آمنہ جل کر بولی۔

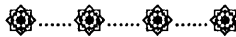
”اور ہاں اپنی یہ اوٹ پٹانگ حرکتیں یہیں چھوڑ کر جانا..... سرال میں نہیں چلتیں یہ من مانیاں..... یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے اور اب تم لوگ بھی سو جاؤ صبح زیارت کے لیے جانا ہے اور اماں جہاں نے نماز کے فوراً بعد اٹھا دینا ہے سب کو۔“ آمنہ نے پہلے منہا اور پھر باقی سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

”میں تو کہیں نہیں جا رہی..... اتنی تھک گئی ہوں کہ اب بس سو جانا چاہتی ہوں..... مجھے مت اٹھانا پلیز، اماں جہاں کو بھی بتا دینا۔“ منہا جیسے کسی سرشاری کی کیفیت میں تھی۔

”ہاں تو تم پہلے کب جانی ہو جواب جاؤ گی۔“ وریشہ نے کہا اور اپنا تکیہ اٹھا کر آمنہ کے ساتھ ہی لیٹ گئی، چند لمحوں بعد وہ سو گئی تھیں سوائے منہا کے..... جس نے غنودگی میں جاتی مومنہ کا کندھا پکڑ کر زور سے بلایا۔

”ہوں..... کیا ہوا..... صبح ہوگئی اتنی جلدی۔“

”ہیں..... صبح نہیں ہوئی مگر تم اپنا بھونپو ذرا آہستہ رکھو..... مجھے تمہیں کچھ بتانا ہے اور خاموشی سے سننا سب کچھ۔“ اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا پھر جیسے جیسے وہ اس کے کان میں سب کچھ بتاتی گئی، ویسے ویسے مومنہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئی تھیں۔



”شیرہ..... فری ہیں تو ہم آجائیں اندر۔“ فائلوں میں سرکھپائی ہوئی شیرہ نے سر اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا پھر سر ہلا کر اندر آنے کی اجازت دی اور خود فائل سمیٹ کر ایک طرف کورکھ دیں کہ ان دونوں کی موجودگی میں کوئی کام ہو سکتا، یہ تو سوچنا ہی بے وقوفی تھا۔

”شیرہ..... آپ نے نوٹ کیا کہ آج آپ کے سرال میں مجھے بہت کچھ عجیب سافیل ہوا۔“ شجر نے آتے ہی جیسے ہی سینڈ سجالا۔ اپنی تشویش کا اظہار کبھی دیا شجر نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔

”وہاں کا ماحول یہاں سے کافی مختلف ہے تو اس لیے تم لوگوں کو ہر بات الگ انداز میں فیل ہوتی ہے۔ یاد نہیں

کیسے رہنے کے ارارے سے وہاں گئی تھی اور آدھی رات کو وہاں سے بھاگ آئی تھی۔“ شیرہ نے بات کو مذاق میں اڑانا چاہا اور نہ محسوس تو اسے بھی بہت کچھ ہوا تھا..... ان کے فنکشن میں پہنچنے پر بجائے سب خوش ہوتے، سب خواتین بوکھلا گئی تھیں اور تو اور لڑکیاں بھی حالانکہ وہ سب تو منتظر رہا کرتی تھیں ایسے مواقعوں کی جب سب مل سکیں، دوسری بات جو انہوں نے محسوس کی تھی اماں جہاں مسلسل منتہا کے پاس ہی بیٹھی رہی تھیں اور رسم کے شروع سے آخر تک نہ تو اسے تنہا چھوڑا تھا نہ ہی کسی اور کو اس کے پاس بیٹھنے دیا تھا مگر وہ اس ابھمن کی تائید کر کے اپنے گھر والوں کے دلوں میں پختی اماں جہاں کے گھر کے میکینوں کے لیے کدورت کو ہوائیں دینا چاہتی تھیں۔

”آپ مائیں یا نہ مائیں شیرہ کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور اور میں اس کا کھوج لگا کر رہو گی۔“ فجر نے اعلان کیا۔  
 ”افوہ بھی..... جیمز بانڈ کی جانشین، چھوڑو یہ فضول کے مفروضے اور اندازے، کل بارات ہے دیکھنا کیسے سب خوش نظر آئیں گے..... اماں جہاں کے گھر کی پہلی لڑکی کی شادی ہے وہ بھی خاندان سے باہر تو ایسے مواقع پر گھر والوں کی پریشانی اور گھبراہٹ فطری عمل ہے..... تم لوگ اب پروگرام بناؤ اپنی گھر کی شادی پر کیسے کپڑے بنوانے ہیں، کیا کیا تیاری کرنی ہے؟ اگلے ماں کی ڈیٹ فکس ہوگئی ہے اور ابھی تک ہم نے کچھ تیاری ہی نہیں کی..... دن گزرتے دیر نہیں لگتی دیکھنا پر لگا کر اڑ جائیں گے یہ دن..... اصل میں ایسے ہر موقع پر یہ سب پروگرام بناتی ہے ہماری شجر اور اب یہ دہن ہو کر خود کیسے جوش و خروش سے ان تیاریوں میں کیسے حصہ لے، ابھی فجر تم کسی کزن اور دوست ہو؟ میگزینز، نیٹ، سب کھنگالو نیوآئیڈیاز کے لیے..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ شیرہ نے ان کا دھیان بنایا اور خود پر خوش ہو کر بولی۔

”دہن ہوں تو کیا ہوا، میں تو پہلے سے بھی بڑھ کر ہر اونٹ میں بھر پور حصہ لینے والی ہوں۔“  
 ”اور اماں جان سے جوتے بھی کھانے والی ہوں۔“ فجر کے لقمے پر اس نے اس کو گھور کر دیکھا۔  
 ”بھئی میں اب کسی کی ڈانٹ سے ڈر کر خاموش نہیں بیٹھ سکتی..... ہر فنکشن کو ایسے انجوائے کروں گی کہ عمر بھر یاد رکھ سکوں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ کا دل چاہ رہا ہے خوش ہونے کو اور آپ خوش نہ ہو سکیں، یہ سوچ کر کہ بھئی میں تو دہن ہوں۔ اگر خوشی کا اظہار کروں گی تو لوگ کیا کہیں گے..... یہ تو منتہا کی شادی آگئی بیچ میں، اس سے فارغ ہو کر کمر کس لیں آپ سب..... میرا بھر پور ساتھ دینا ہے آپ لوگوں نے۔“

”واہ کیا اعلیٰ خیالات ہیں محترمہ کے..... ابھی امی حضور کے کانوں میں بھنک بھی پڑ گئی ان الفاظ کی تو اس رشتہ پر ایک بار پھر نظر ثانی کر سکتی ہیں وہ۔“ موحد اچانک ہی اندر آیا اور شجر کے آخری جملے اس کے کانوں میں پڑ گئے تھے۔

”تائی کچھ کہیں نہ کہیں تم جو ہوساس اور مند کارول پلے کرنے والے..... ان کی کسر تم پوری کر لو اور کر لو نظر ثانی..... ایسے بھی گفٹام نہیں ہو کہ جس شادی کے لیے میں مری جا رہی ہوں وہ تو شادی کرنے کی جلدی اس لیے ہے کہ اس سے میرے دیرینہ خواب جڑے ہیں..... ریڈ ساڑھی، اماں جان کہتی ہیں شادی کے بعد پہننا، تیر لپ اسٹک شادی کے بعد لگانا..... میری امی کے زیورات کو شادی کے بعد ہاتھ لگانے کی اجازت ہے تو ان سب خوابوں کو پورا کرنے کی لیے میں شادی پر راضی ہوئی اور محترم پتا نہیں کس خوش فہمی میں ہیں۔“ وہ پہلے اس کو ڈانٹ کر اور پھر اترا کر بولی۔

”زبان کے جوہر دیکھ رہی ہیں آپ اس کے..... قینچی بے چاری شرمندہ ہو جاتی ہے اتنی تیزی اور کاٹ دیکھ کے۔“ وہ جی بھر کر بد مزہ ہوا..... دو دن سے اسے دیکھا نہیں تھا اور اچھی خاصی یاد آ رہی تھی..... سو اسی کی آواز سن کر



شیرہ کے کمرے میں چلا آیا مگر جس شجر کے انداز منگنی اور رشتہ طے ہونے کے بعد نہ بدلے تھے وہ بھلا تاریخ پکی ہونے سے کیا بدلنے تھے۔

”بری بات شجر..... کتنی بار کہا ہے کہ موحّد کو اب تم نہیں آپ کہہ کر بلایا کرو اور جو بات قابل اعتراض ہو صرف اسی کا جواب دو۔۔۔۔۔۔ ہر بات کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ بات ٹھیک بھی نہیں ہے اور امی اور اماں جان کو بھی نہیں پسند لڑکیوں کا مردوں کے آگے بولنا۔“

”جی شیرہ..... لیکن بھی غور کیجئے گا؟ یہ جان بوجھ کر مجھے چڑاتا ہے، کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور کرتا ہے کہ میرا پارہ ہائی ہو جاتا ہے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”پارہ ہائی کی کچھ گتتی، یاد ہے کہ اماں جان نے کہا تھا شادی سے پہلے تمہارا موحّد سے پردہ ہوگا اور اگر تمہیں اس سے بات کرتے دیکھا تو زبان کاٹ کر تھیلی پر دھر دیں گے۔“ فجر نے بڑے موقع پر یہ بات یاد کرائی اور شجر تپ ہی تو گئی۔

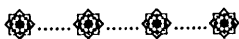
”تو میں کون سا اس سے ملاقات کرنے پہنچ گئی ہوں یا میں نے بات شروع کی ہے، یہی کونے کھدروں میں مجھے ڈھونڈ ڈھانڈنے کی بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔“ اس نے پھاڑ کھانے والے انداز میں فجر کو جواب دیا اور خوانو از نظروں سے موحّد کو دیکھا۔

”اچھا بابا میں تو چلا..... یہ نہ ہوا بھی اماں جان یہاں چھاپہ مار دیں۔ ان محترمہ کو کچھ کہیں گی تو انہوں نے تو سارا الزام مجھ غریب پر دھر دینا ہے۔“ وہ دم دیا کر بھاگتے ہوئے بولا۔

”ہاں تو غلطی تمہاری ہے تو سزا بھی تمہیں ہی ملنی چاہیے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ اس کے انداز پر شیرہ بے ساختہ ہنس دی۔

”توبہ ہے شجر..... ہار ماننا تو سکھا ہی نہیں تم نے۔“

”ہاں تو ہار تو وہ مانے جو قصور وار ہو..... بس مجھ سے تو غلط بات برداشت نہیں ہوتی چاہے جو بھی کرے پھر سنے گا بھی سہی، مجھ سے..... آپ یہ بتائیں کل بارات پر کیا پہن رہی ہیں؟“ اس نے اپنی بات واضح کر کے بات بدل دی۔



اماں جہاں کے گھر معمول کی گہما گہمی تھی کہ آنے والا دن منہا کی بارات کا دن تھا۔ صبح ہی صبح اماں جہاں نے تائی سلطانہ سے کہا تھا کہ منہا کے علاوہ ساری بچیوں کو لے کر ان کی مرشد کے گھر ہوائیں۔ نذرانہ کے لیے انہوں نے پھل اور مٹھائی بھی منگوادی تھی..... یہ اماں جہاں کے گھر کی روایت تھی کہ ہر ایچھے اور نیک کام کے لیے وہ مرشد بی بی سے دعا ضرور کرواتی تھیں..... بتایا کان چلے گئے تو اجمل کے ساتھ تائی سلطانہ اور ساری لڑکیاں بھی چلی گئیں مع حمایت بی کے..... منہا اس لیے نہ گئی تھی کہ مایوں کی دلہن گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھتی تھی۔ جب کہ مومنہ تیز بچار میں چنک رہی تھی اتنی کہ اس میں ہلنے کی بھی سکت نہ تھی۔ فجر کی نماز پڑھ کر سونے کے بعد منہا کی آنکھ اب کھلی تھی تو گھر بالکل خالی تھا۔ اماں جہاں اپنے کمرے میں تھیں، اس نے رات دیر تک عبدالمعید سے بات کی تھی اور بتایا تھا کہ اس نے بالآخر اماں جہاں کو منہا ہی لیا ہے اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ بارات والے دن ہی کچھ ایسا کرنے والی ہیں کہ آنے والی بارات کی دلہن جو بھی ہو وہ نہیں ہوگی..... جب عبدالمعید چھٹی پر آئے گا تو وہ اسے اس کے سنگ رخصت کر دیں گی۔ عبدالمعید کو اگرچہ بہت حیرانی ہوئی تھی تاہم وہ بھی کیوں اور کیسے کے مراحل اور

# انتباہ

نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز کی جانب سے متنبہ کیا جاتا ہے جو ویب سائٹس ہمارے ادارے سے شائع ہونے والے ڈائجسٹوں کی کہانیاں شائع کر رہے ہیں اور وہ سوشل میڈیا گروپ ویج ہمارے ادارے کا نام استعمال کر رہے ہیں ان کا ادارے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے ایسے تمام افراد کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ ادارے کا نام اور مواد کا استعمال فوری ترک کر دیں تاکہ ہمارے قارئین کسی بھی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے مابناموں کے مضامین افسانے اور کہانیاں بلا اجازت اور غیر قانونی طور پر اپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں۔ انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں بصورت دیگر ادارہ سامبر کرائم کے قانون کے مطابق

**PREVENTION ELECTRONIC CRIMES ACT 2016**

اور

**COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000**

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایت درج کرائی جائے گی۔

پبلشنگ نئے افق مجاہد کلچر

نئے افق گروپ آف پبلیکیشنز

81 میمر بیرس، ہاکی اسٹیڈیم، نزد انجیل پریس کراچی 75510  
35620771/2.....03008264242

اسباب جانے بغیر بہت خوش ہو گیا تھا۔ آنے والی زندگی کے خوش گوار خواب بقی رات کب بیتی پتا ہی نہیں چلا.....  
 کچن میں آ کر اس نے اپنے لیے ناشتا بنایا پھر سوچا اماں جہاں سے بھی پوچھ لے ناشتے کا، وہ اپنے کمرے میں  
 عبدالحنان کا خط تھام کر رو رہی تھیں، اسے دیکھ کر آنسو پونچھتے ہوئے بتایا کہ وہ ناشتا کر چکی ہیں۔ مومنہ کی حالت کا  
 بتایا کہ اسے کچھ کھلا پلا کر بخاری دوا دے دے پھر انہوں نے میز کی دراز سے اسے دو گولیاں نکال کر پکڑائیں کہ یہ  
 مومنہ کو کھلا دے۔ پہلے تو اسی دوا سے ہی مومنہ کی حالت سنبھل جائے گی نہیں تو اچھل آ کر اسے ڈاکٹر کو دکھائے  
 گا۔ سر ہلاتے ہوئے منہا نے گولیاں پکڑ لیں۔ واقعی ان میں سے ایک بخار اور درد کی دوا اور دوسری نیند کی یہ اور اس  
 جیسی کئی عام درد، بخار اور زلہ، زکام کی گولیوں کے علاوہ نیند کی گولیاں بھی تھیں تاکہ سلطانہ کے دو ایسوں والے شاپر میں  
 مل جاتی تھیں، سو اس نے زبردستی مومنہ کو اٹھا کر چائے کے ساتھ دوسلاں کھلائے اور چائے کے ساتھ دونوں  
 گولیاں بھی کھلا دی تھیں۔

”ویسے منہا..... مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ اماں جہاں مان گئی ہیں مگر مجھے یہ سیکھ میں نہیں آ رہا کہ جب بارات بھی  
 کل آن پہنچی گی تو وہ ایسا کیا کرنے والی ہیں کہ وہ بھی ناراض نہیں ہوں گے اور تمہیں بھی تمہاری خوشیاں مل جائیں  
 گی..... یہی کہا ناں اماں جہاں نے تم سے، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، منہا یوں لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہو،  
 کچھ بہت برا، پتا نہیں تم اتنی مطمئن کیسے ہو۔“ سرخ آنکھوں اور ستے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ واقعی بہت  
 پریشان اور خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ منہا اس کی حواس باختگی بھانپ کر ہنسنے لگا۔

”تمہارے تو کیا ہی کہنے مومنہ، تمہیں تو عادت ہے پریشان ہونے کی، کوئی پریشانی نہ بھی ہو تب بھی کوشش  
 کر کے ڈھونڈ ہی لیتی ہو کوئی نہ کوئی بات خود کو ڈرانے کے لیے، پریشان کرنے کے لیے..... دیکھو بھئی یہ سارا  
 کھڑاگ چونکہ پھیلایا ہوا ہی ان ہی کا ہے تو اصولاً سیٹھنا بھی ان ہی کو چاہیے، پتا ہے کیا مومنہ مجھے تو لگتا ہے کہ  
 چونکہ وہ خاتون صرف ایک بار ہی مجھے دیکھ کر گئی ہیں، مطلب وہ میری ساس بنتے بنتے رہ گئی ہیں اور ہم کزنز اور  
 بہنوں کی شکلوں میں معمولی سا فرق ہے تو اماں جہاں تم لوگوں میں سے کسی کو قربانی کا بکرا بلکہ بکری بنانے کا ارادہ  
 رکھتی ہیں۔ تمہیں آمنہ، وریشہ کسی کو بھی دلہن بنا کر بھیج دیں گی..... یہ میرا خیال ہے ویسے کچھ اور بھی حل ہو سکتا  
 ہے۔“

”ایسے مت کہو منہا..... مجھے تو یہ سوچ کر ہی گھٹن ہونے لگی ہے، سر دوبارہ سے دکنے لگا ہے، واقعی قریب ترین  
 قیاس تو یہی لگتا ہے مجھے بھی۔“

”ہم..... اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ تم نہیں ہو سکتیں کیونکہ تم اعصاب کی کمزور ہو، جلدی ہاتھ پیر چھوڑ دینے  
 والی وہ اگر ایسا کرنے بھی والی ہیں تو ان کا انتخاب ہمارے گھر کی سب سے زیادہ پیچور لڑکی ہوگی جو تم ہرگز نہیں  
 ہو سکتیں۔ اس لیے برائے مہربانی ساری سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر تم سو جاؤ کیونکہ دو ماہیں نیند کی گولی بھی ہے،  
 پسینہ بھی آ رہا ہے تمہیں اس کا مطلب بخار کا زور ٹوٹ رہا ہے، آرام کر لو تھوڑی دیر پھر جب اٹھو گی تو مہندی لگاؤں  
 گی میں تمہیں اور تم مجھے لگانا۔“ اس کی حالت دیکھ کر منہا نے اس کو لیٹا دیا اور واقعی وہ تھوڑی دیر میں ہی سو سہ گئی  
 تھی۔ منہا ابھی عبدالمعید کا سوچ ہی رہی تھی کہ اماں جہاں کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر چونک گئی۔

”آپ..... مجھے بلا لیا ہوتا۔“

”مومنہ کی طبیعت دیکھنے آئی ہوں..... کیسی ہے اب؟“ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا دودھ کا گلاس میز پر رکھا اور  
 بے سدھ لیٹی مومنہ کو دیکھ کر فکر سے پوچھا۔

”دوا تو دے دی تھی۔ جب اٹھے گی تو امید ہے کہ کافی بہتر ہوگی..... آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھیں ناں۔“  
منہا نے بیڈ پر بکھرے تکیے ادھر ادھر کر کے ان کے لیے جگہ بنائی۔

”ہم..... تم ایسا کرو یہ باداموں والا دودھ بنایا ہے تمہارے لیے، جلدی سے پی لو، مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے بولیں اور دودھ کے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ منہا جو یہ کہہ کر انکار کرنے والی تھی کہ اس نے ابھی ابھی ناشتا کیا ہے نہ جانے کیوں کچھ نہ کہہ سکی اور منٹوں میں گلاس اٹھا کر غٹا غٹ پی کر گلاس واپس رکھا، اماں جہاں جواسے بغور دیکھ رہی تھیں، جیسے ایک سکون کی کیفیت میں آ گئی تھیں۔

”جلدی سے گلاس دھو کر کچن میں رکھ کر آؤ۔“ انہوں نے اگلا حکم صادر کیا اور منہا کے کمرے سے جاتے ہی طائرانہ نظروں سے لڑکیوں کے کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ منہا جلدی واپس آ گئی تھی۔

”مجھے تمہاری گمشدگی نے اتنا پریشان نہیں کیا جتنا اس بات نے کہ میں لوگوں کو کیا جواب دوں گی.....“ وہ طویل سانس لے کر بولیں۔

”اس وقت مجھے تمہیں گھر لانا مقصود تھا..... پھر میں نے اس مقصد کے لیے جو مناسب سمجھا وہ کیا۔ تم اپنی شرط پر اس گھر میں واپس آ گئیں..... اب تم ہمیں یہ بتاؤ کہ ہماری جگہ پر تم ہوتیں تو کیا کرتیں؟“ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ منہا کچھ سوچتی ہوئی بولی۔

”میں تو ایسا کچھ کرتی ہی نہیں اماں جہاں کہ ایسا کچھ کرنے کی نوبت آتی، معاف کیجئے گا مگر میں اپنی اولاد کی مرضی کے بغیر کچھ بھی نہ کرتی اور اب آپ کے پاس بھی یہی حل ہے کہ آپ لڑکی کی مرضی نہیں ہے کہہ کر انکار کر دیں اور ایسا آپ نہیں کریں گی کیونکہ آپ کو اولاد کی خوشی سے زیادہ لوگ کیا سوچیں گے کا ڈر رہتا ہے، تو اگر وہ اچھے لوگ ہیں، آپ ان کو انکار بھی نہیں کرنا چاہئیں تو کسی بھی لڑکی کو ذہن بنا کر بیچ دیں، آپ کی جگہ میں بھی ہوتی تو شاید یہی کرتی..... انہوں نے کل رسم پر بھی مجھے نہیں دیکھا۔“ بغیر رکے اس نے ہمیشہ کی طرح اپنا مطمح نظر واضح کر دیا تو اماں جہاں کچھ دیر اس کو دیکھتی رہی پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مومنہ کے پاس آئیں اور اس کے ماتھے کو چھو کر بخار محسوس کیا اور پھر بیڈ پر بیٹھی منہا کے پاس آئیں اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

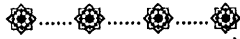
”تم بھی کچھ دیر آرام کر لو..... ہم لائیٹ آف کر کے جا رہے ہیں پھر سب واپس آ جائیں گے تو آرام کا موقع شاید نہ مل سکے۔ ویسے بھی کل ایک تھکا دینے والا دن ہوگا۔“ انہوں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ اس پل منہا کو ان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی دکھائی دی تھی۔ وہ میکا کی انداز میں سر ہلا کر رہ گئی۔

”اماں.....“ اس نے انہیں جاتے ہوئے روکا، اماں جہاں رک گئیں مگر مڑی نہیں، منہا بھاگ کر ان کے سامنے آئی اور ان سے لپٹ گئی۔

”آپ بہت اچھی ہیں..... بس میں آپ کو اور آپ مجھے سمجھ نہیں پائیں..... ہو سکے تو میری بدتمیزیوں، گستاخیوں اور خود سری کے لیے مجھے معاف کر دیجئے گا۔“ منہا نے کہاں سے ڈھیر سارے انیسویں نے اس کی آنکھوں کا راستہ دیکھ لیا تھا..... اماں جہاں نے بھی اس کے گرد اپنے بازو جمائے کیے، مگر کچھ دیر دھکیلتی رہیں پھر خود سے الگ کرتے ہوئے بولیں۔

”تم بھی ہمیں معاف کر دینا کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اس نے ہماری عمر بھر کی ریاضت کو اکارت کر دیا ہے..... مگر ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تھا..... تم معاف کر دو گی تو شاید رب بھی ہمیں معاف کر دے..... جاؤ سو جاؤ..... آرام کرو۔“ عجیب سے انداز میں کہہ کر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر تک لائیں اور اسے لٹا

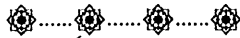
دیا۔ خود لایٹ آف کر کے باہر چلی گئیں۔ منعہانے پُر سکون ہو کر آنکھیں موند لیں تھیں۔



”تم سے اس طرح روز روز ملنا مجھے پسند نہیں۔ جلال ویسے بھی اب ہماری امتحانات کی ڈیٹ شیڈ مل چکی ہے تو میں آج اپنی رول نمبر سلپ لینے آئی تھی۔ نوٹس کا بی کرانے کے بہانے یہاں تک چلی آئی ہوں، صرف یہ بتانے کہ میری بہن کی شادی کے فوراً بعد ہی میری شادی متوقع ہے۔ ہمارے گھر تو یہ رواج ہے کہ لڑکا دیکھنے سے لے کر شادی طے کرنے تک کے سارے مراحل گھر والے طے کرتے ہیں اور شادی سے کچھ روز قبل لڑکی کو بتا دیا جاتا ہے کہ تمہاری شادی ہے۔ اپنی اماں کو ہمارے گھر بھیجی تو میں سمجھوں گی کہ تم بھی وہی عام سے لڑکے ہو..... شادی کے نام پر لڑکیوں کو بے وقوف بنانے والے اور اب مجھ سے ملنے کا نہ تقاضا کرنا نہ امید رکھنا۔“ نقاب سے جھانکتی آنکھوں میں برہمی صاف نظر آرہی تھی۔

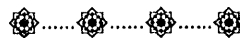
”مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ حالات ایسے بن گئے ہیں کہ میرا تاثر تمہاری نظروں میں ایک فلرٹی نو جوان کا بن گیا ہے ورنہ اللہ گواہ ہے کہ میں تمہیں دل و جان سے اپنی عزت بنانا چاہتا ہوں، اپنا ناچا ہوتا ہوں، میں آج پھر بات کرتا ہوں، اماں سے۔ یقین کرو میں بھی مناسب خیال نہیں کرتا کہ تمہیں اس طرح دکان پر آنا پڑے یا میں تم سے سر راہ ملوں مگر کیا کریں کہ میل تمہارے پاس نہیں ہے اور پورے دو ماہ تم نہ تو نوٹس لینے آئیں نہ کافی کرانے، مجھے خدشا ہوا کہ جسے تمہارے گھر والے ہیں وہ تمہیں بھی تمہاری بہن کے ساتھ بھگتانا دیں۔ اس لیے میں دن مسلسل کالج آتا رہتا کہ تم سمجھ جاؤ کہ مجھے کوئی ضروری بات کرنا ہے۔“

”اچھا میں چلتی ہوں..... آج میں اکیلی ہی آئی تھی کالج کی لڑکیاں نکل گئیں تو اکیلے جانے پر شکایت آ جائے گی۔“ اس نے کہا اور نوٹس اٹھا کر غلبت سے باہر چلی گئی تھی۔



”بس عبدالرحمان..... میں اس سے زیادہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی..... ایک مبہم سارا رابطہ، چند ٹیکسٹ زندگی کے کچھ پلوں کے سہارے کوئی کب تک عمر گزار سکتا ہے۔ نکاح کے دو بول میرا دل تو تمہارے ساتھ باندھ گئے ہیں مگر میں پوری زندگی ایک سراب جیسے رشتے کے ساتھ کیسے بندھ کر گزار سکتی ہوں..... میں نے کہا تھا ناں کہ اب اگر تم نہ آئے اور میری تمہاری راہ جدا ہوئی تو گلے کا حق تمہیں نہیں مجھے ہوگا۔“ شیر خلع کے پیپر پر نظر بس نکائے بیٹھی تھی جو رات ہی اباسے دے گئے تھے کہ ان کا خیال تھا ان کی بیٹی نہ تو لاوارث ہے نہ ہی اتنی ارزاں کہ شخص ایک نام اور مفروضے کے ہو سکتا ہے وہ کبھی لوٹ آئے پر پوری عمر گزار دے..... اماں نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اگر وہ ان پر سائن نہیں کرے گی تو وہ اس سے کلام تک نہیں کریں گی۔ کیا کرتے ماں باپ تھے۔ بیٹی کو ایسے برداشت نہیں کر سکتے تھے جو نہ بیاتھا تھی نہ ہی بیوہ..... اب تو اماں جان بھی بیٹے اور بہو کی ہمنوا نظر آرہی تھی۔ شیر نے قلم اٹھا کر ایک بار پھر ان کاغذات پر نگاہ ڈالی۔ ہاتھ میں تھا قلم کا بپ گیا تھا۔

”ایسا تو کوئی بھی کسی کے ساتھ نہیں کرتا عبدالرحمان یہ کیسی محبت تھی تمہاری۔“ دل ہی دل میں شکوہ کنناں ہوتے ہوئے اس نے دل کڑا کر سائن کیے اور کاغذات بیڈ پر رکھ دیئے۔ اسے کمرے میں آکسیجن کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ دل ایسے تھا جیسے کسی نے ہٹھی میں لے کر کھینچ دیا ہو۔



اسے یوں لگ رہا تھا جیسے گلے سے لے کر پیٹ تک کوئی گہرے وار کر رہا ہو۔ آگ کا ایک بھاڑ پڑھا جو اس کو

اندر جلتا محسوس ہوا، یوں لگا جیسے کسی نے بھڑکتے الاؤ میں اس کو ڈال دیا ہو اور اب اس کا ہر عضو جل رہا ہو..... تکلیف کا ایسا احساس جیسے گہرے اور تیز اوزار سے اسے چیرا جا رہا ہو، گلے پر ہاتھ رکھ کر وہ تڑپ کر اٹھی..... پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

”عم..... مومنہ..... مومنہ مجھے کچھ ہو رہا ہے۔ میں مر رہی ہوں، مر رہی ہوں..... اٹھو۔“ کبھی گلے پر ہاتھ رکھتی تو کبھی سینہ ملستے، وہ بہ مشکل اٹھ کر نیم اندھیرے میں مومنہ کے بستر تک آئی جو ابھی بھی گہری نیند میں تھی۔ منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکال رہے تھے، اس نے مومنہ کا کندھا زور سے ہلایا۔ مومنہ نے مندی مندی آنکھوں کو کھول کر خود پر جھکی منہا کو دیکھا..... وہ ابھی تک نیند کی دوا کے ڈہرا اثر تھی مگر پھر بھی منہا کی عجیب حالت نے اسے چونکا دیا۔

”کیا ہو منہا؟“ لہجہ ابھی بھی بھرا ہوا خوابیدہ سا تھا۔ منہا کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔

”میں مر رہی ہوں مو..... م..... نہ..... کوئی..... کوئی مجھے اندر آ رہی سے کاٹ رہا ہے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ کسی کو بلاؤ..... ڈاکٹر کسی کو۔“ اتنا بولنے میں ہی وہ بے دم ہو گئی کہ اذیت حد سے سوائی، رگوں کو اندر تک کاٹتی ہوئی۔ مومنہ کی نیند کا نشہ ایک دم کہیں اڑ چھو ہو گیا تھا۔ سر جھٹکتی ہوئی وہ اٹھی، بخار کی نقابہ تھی یاد دوا کا اثر وہ ذرا سا لڑکھرائی مگر خود کو سنبھالتی تیزی سے سوچ بورڈ کی طرف آ کر لائیٹ جلائی پھر تیر کی تیزی سے اپنے بستر کے پاس اونگھ پڑی منہا کو سیدھا کیا۔ اس کی سانس حلق میں ہی اٹک گئی کہ منہا کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔

”منہا..... منہا کیا ہوا؟ اٹھو..... اٹھو منہا۔“ وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

”باداموں والے دودھ میں زہر تھا مومنہ..... اماں..... جہاں نے مجھے پلا دیا..... ہم نے جو..... جو حل سوچے ان میں سے یہ نہیں سوچا کہ اپنی عزت بچانے کو..... وہ میری جان بھی لے سکتی ہیں۔“ ٹوٹے ہوئے الفاظ میں وہ گلے کو پکڑے بول رہی تھی۔ مومنہ اس کی بات سن کر ساکت رہ گئی۔

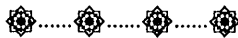
”نہیں نہیں..... منہا..... میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی..... ہمت کرو..... اٹھو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔“ مومنہ نے منہا کو ہدائیائی کیفیت میں جھنجھوڑا۔

”میں..... میں کسی کو بلاتی ہوں..... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ بدحواسی میں وہ اٹھ کر ننگے پاؤں ہی کمرے کے دروازے تک آئی مگر یہ کیا کہ پرانی طرز کے دروازے کے لکڑی کے دونوں کاڑھ مضبوطی سے بند تھے اور باہر سے کدڑی لگی ہوئی تھی۔

”تائی اماں..... وریشہ..... آمنہ..... کوئی ہے..... دروازہ کھولو..... منہا کی طبیعت سخت خراب ہے..... جلدی کرو۔“ وہ دروازے کو جھٹکے دے دے کر زور زور سے چلانے لگی مگر ہر بار چلانے پر اس کی اپنی بازگشت اس کی ساعوتوں تک پہنچتی رہی۔

”اماں جہاں..... اماں جہاں..... آپ تو گھر پر ہی ہیں ناں، اللہ کے واسطے دروازہ کھولیں۔“ مگر اب کے اس کی آواز میں ہلکی سی مایوسی بھی درا آئی تھی کہ اماں جہاں کا کمرہ گھر کے باقی رہائشی حصے سے ہٹ کر تھا اور اگر ان کے کمرے کا دروازہ بند ہوتا تو وہاں تک کوئی آواز نہیں جاسکتی تھی اور وہ تقریباً اپنے کمرے کا دروازہ بند ہی رہتی تھیں..... اذیت سے تڑپتی منہا مومنہ کی چیخیں سن کر سارا معاملہ سمجھ گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اب اندھیرا چھا رہا تھا..... درد کی شدت اور کاٹ اتنی زیادہ تھی کہ اس کو اپنے حواس پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ دروازہ بجایا کر تھک جانے والی مومنہ ایک بار پھر تیزی سے منہا کے پاس آئی اور اس کی حالت غیر دیکھ کر وہ خود پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔ منہا کا سر اس نے اپنی گود میں رکھ لیا۔ دھندلی بڑتی آنکھوں اور حواس چھوڑتے اعصاب نے آخری بار مومنہ کی موجودگی کو دیکھا اور محسوس کیا اور پھر اس کا سر مومنہ کی گود میں ہی ایک طرف لڑھک گیا تھا۔ مومنہ کی ہنسی ہچکچاہٹوں سے پورا کمرہ لرز اٹھا تھا۔ روتے ہوئے مومنہ کی اپنی حالت بگڑی گئی بخار کی کیفیت کو اس نے شدت سے محسوس کرتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا کہ دروازہ باہر سے کھلنے پر وہ ایک دم ساکت رہ گئی..... اماں جہاں دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھیں، اس زہر کا اثر کیسا تھا اور کتنی دیر میں اثر کرنا تھا، وہ یہ جان چکی تھیں اور وقت کا حساب لگا کر وقت پورا کر کے آئی تھیں۔



حسب معمول سب لاؤنج میں ہی موجود تھے۔ شام کی چائے کی باری آج آیت اور فجر کی تھی۔ وہ بی کر شیرہ اور شجر تو میگزین پر سر جھکائے ایک عروسی لباس کو دیکھنے میں مصروف تھیں۔ آیت کو تائی نے آج صبح سے اپنی ٹیٹھی سلنے کے لیے دی تھی جو ابھی بھی نامکمل تھی۔ اماں جان تائی اور چچی خاندان کی ایک شادی کا قصہ چھیڑے بیٹھی تھیں، ابھی ابھی تو یہ طے ہوا تھا کہ منہا کی بارات پر کل اماں جان اور شجر شرکت کریں گی کہ تائی نے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے انکار کر دیا تھا، اماں جہاں کے گھر سے..... انہوں نے صاف کہا تھا کہ نہ تو وہ شادی میں شرکت کریں گی نہ ان کی بیٹی کیونکہ تائی اب انے عدالت میں خلع کا کیس دائر کر دیا تھا۔ خلع کے کاغذات بھی اماں جہاں کے گھر عدالت کے ذریعے بھجوائے جا چکے تھے۔ اگرچہ ابھی کیس کی شنید و آغاز کی کارروائی شروع نہیں ہوئی تھی۔ تائی کی تو خواہش تھی کہ اماں جان بھی وہاں قدم نہ دھریں مگر اماں جان کی بہن تھیں وہ..... ایک دم سے رشتہ کیسے ختم کر سکتی تھیں، وہ بھی اس صورت میں جب دلوں پر جی سرد مہری کی دیوار ابھی کچھ عرصہ قبل ہی گری تھی۔ ایان اوہن لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا جب کہ مودھا ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ تائی اب اور اچھا چونکہ ابھی آفس سے آئے تھے تو تھکن کے باعث کھانا کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں تھے، ان کو فجر چائے وہیں دے آئی تھی۔

”اماں جان..... من..... منہا..... مر گئی..... ابھی..... ابھی آمنہ نے کال کر کے بتایا ہے۔“ فجر حواس باختہ سی لاؤنج میں داخل ہوئی اور بے ربط سے کہہ کر وہیں اماں جان کے پاس بیٹھ کر رو دی جو جہاں تھا وہیں ساکت رہ گیا۔

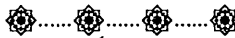
”پ..... کیا مذاق ہے فجر.....! پہلے جگر کی زبان ایسے اوٹ پٹانگ باتیں نکالتی تھی، آج تم نے اس کو پیچھے چھوڑ دیا۔ پتا نہیں کیسا سنہ سے تم نے اور کیا بول رہی ہو۔“ اماں جی ناگواری سے بولیں۔

”نہیں اماں جی..... میں سچ کہہ رہی ہوں..... آمنہ نے اجمل بھائی کے نمبر سے بات کی۔ وہ بہت رورہی تھی۔ پیچھے بھی رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بس یہی بتا کر فون بند کر دیا۔ منہا کیسے مری ہوگی؟ اس کی تو کل شادی ہے اور..... اور وہ بہت خوش تھی پرسوں جب ہم مایوں پر اس سے ملے تھے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ شجر نے بھی اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا کہ وہ سب آپس میں کزنز ہونے کے ساتھ ساتھ اچھی دوست بھی تھیں، ایک یہی گھر تو تھا جہاں اماں جہاں کے گھر کی لڑکیوں کو آنے کی اجازت تھی۔ ایان اتنی دیر میں اجمل بھائی کو کال ملا چکا تھا۔

”فجر ٹھیک کہہ رہی ہے اماں جان..... واقعی ایسا ہی ہے، اجمل بھائی نے تائید کر دی ہے اور عشاء کے بعد جنازہ ہے۔ مختصر سا بتایا کہ ہائی بلڈ پریشر ہونے کے باعث دماغ کی شریان پھٹی ہے اس کی۔ آپ لوگ چلنے کی تیاری کریں، میں اب اور تائی کو پتا ناہوں۔“ موبائل جبب میں رکھتا وہ سجدہ کی سے بولا۔

”بہت پیاری بچی تھی، اماں جہاں کے گھر کی بچیوں سے یکسر مختلف، جب دیکھو ہنستی کھلکھلاتی ملتی تھی۔ موت

بھی کیا عجیب بنائی ہے اللہ نے یہ وقت مقرر آنے پر اپنے بچوں میں دیوبچ لیتی ہے نہ عمر دیکھتی ہے نہ خوشی۔ اب یہ بھی بھلا کوئی عمر ہے مرنے کی۔ بائیس غذاؤں اور کھانا سپرے کا استعمال انسان کے اندر اپنا زہر اس قدر سرائیت کر گیا ہے کہ آج کل تو چھوٹی چھوٹی عمر کے لوگ بھی ان بیماریوں کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ میرے مولا کی یہ قیامت کی نشانیاں، ہمیں معاف کر دے اور اس یتیم بچی کی مغفرت کرنا۔“ چچی سدرہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اماں جان نے بھی دو تین بار دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کیں..... شیرہ تو بالکل ساکت بیٹھی تھی، اس کی نظروں کے سامنے وہ پل گھوم گئے جب ایک دوبار اس مختصر قیام میں اس شوخ اور اندر لڑکی سے وہ ملی تھی۔ شجر اور فجر بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں یہ سارا قافلہ اماں جہاں کے گھر روانہ ہو گیا تھا۔



پورا شہر ہی اس کی جوان موت پر ایٹھا یا تھا۔ اماں جہاں کی آنکھیں بے حد سرخ تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ لڑکیاں اس کی میت سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ شجر اور فجر کو دیکھ کر آمنہ، وریش ایک بار پھر زور زور سے رونے لگی تھیں۔ تائی سلطانہ کے آنسو بھی بار بار بے قابو ہو جاتے، جنہیں دوپٹے کے پلو سے بار بار صاف کرتیں۔ بیٹی نہیں تھی وہ ان کی مگر بیٹیوں کی طرح ہی اسے چاہا تھا۔ کچھ وہ بھی ایسی ضد سے، رو کر، ہٹ دھرمی سے اپنی بات منوانے والی پھر ایسا ہوا کہ سلطانہ بیگم نے بھی اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ ہاں وہ اس کے تیر دیکھ کر خوف زدہ ضرور ہوئی تھیں۔ جو ہر معاملے میں عجیب جارحانہ سے ہوتے تھے پھر اسے بے نقط بھی سناتیں، جب وہ کبھی کبھی اپنی شرارتوں میں گھر کی دوسری لڑکیوں کو ساتھ ملا لیا کرتی تھی اور اس کی ڈھٹائی پر کلس کر رہ جاتیں..... آمنہ روتے ہوئے وہی کہانی سنارہی تھی کہ گھر پر صرف اماں جہاں مومنہ اور منتہا تھیں۔ جب وہ لوگ گھر سے گئیں تو منتہا انہیں سوئی ہوئی ملی تھی اور وہ لوگ واپسی کے لیے راستے میں تھے جب اماں جہاں کی ان کو کال آئی کہ جلدی سے گھر پہنچیں منتہا کی حالت بہت خراب ہے اسے ہسپتال لے کے جانا ہے کہ تیا کا نمبر بھی بند جا رہا تھا مگر اجمل بھائی کی تیز ترین ڈرائیونگ کے بعد بھی ان کو پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا تھا اور جب تک اماں جہاں نے ہمسایوں کو بلایا جب تک منتہا اپنے ابدی سفر پر روانہ ہو چکی تھی..... مومنہ یک ٹک اس کے زردی اور قدرے سیاہی مائل چہرے کو تکتے ہوئے بالکل خاموش تھی۔ اب تک ایک آنسو بھی اس کی آنکھ سے نہ ٹکا تھا۔

”مجھے اپنی جان سے بھی گزرنارہا ناٹا مومنہ..... دیکھنا میں گزر جاؤں گی مگر اپنی زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کی کوشش ضرور کروں گی۔“ ایک پُر عزم آواز کی بازگشت نے مومنہ کا کلیجہ نوچ لیا تھا۔

”تم لوگ ایسی سستی زندگی کیسے گزرا لیتی ہو جیسی اماں جہاں نے تمہارے لیے سیٹ کی ہے۔ میرا تو دم گھٹتا ہے اس پابندی اور سختی سے۔ دیکھا پھر کیسے چمکے دے کر نکل جانی ہوں۔ اماں جہاں کو بھی حالہ کے گھر، کبھی پارک تو بھی میں روڈ سے گول گپے لینے۔“

”کیا..... تم گول گپے کھاتی ہو وہاں کھڑے ہو کر..... کسی دن تیا یا اجمل بھائی نے دیکھ لیا تو جان نکال لیں گے تمہاری۔“ مومنہ نے خوف زدہ ہو کر کہا تھا۔

”ایک تو تمہارا ہونق پن اور ڈر..... اس سے سخت عاجز ہوں میں..... گول گپے کھانے میں بھلا کتنی دیر لگتی ہے، اکیلی میں تو نہیں ہوتی، ایک دنیا آتی ہے کھانے دور دور سے..... تم بھی چلنا کسی دن..... مزہ آئے گا۔“

”نن..... نہ بابا..... مجھے تو معاف ہی رکھو ایسے گول گپوں سے۔“ مومنہ کے ڈر کر کہنے پر وہ مظلوم ہو کر ہنس دی تھی۔



بخاری کی کیفیت اس پر ایک بار پھر شدت سے حملہ آور ہو گئی تھی۔ سرچکرا رہا تھا..... اس پل اس نے مردوں کو میت لے جانے کے لیے اندر آتے دیکھا۔ یہ سوچ کر اس کا دم گھٹنے لگا، سانس رکنے لگی کہ وہ ضدی، اکھڑ، چنچل منتہا اب کبھی اس کو دکھائی نہیں دے گی۔ کبھی اس سے بات نہیں کرے گی۔ اس کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترس جائیں گی۔ اس نے منتہا کی چار پائی کے کوئے کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

”منتہا..... اٹھو..... دیکھو دروازہ کھل گیا۔ بہت سے لوگ تمہاری مدد کو آ گئے ہیں ہمیشہ کی جلد باز ہو..... ہر بات، ہر کام میں جلد بازی اور مرنے میں بھی بے صبری۔“ وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھی جب پیچھے سے کسی نے اس کو چار پائی کے پاس سے ہٹانے کی کوشش کی، مردکھ شہادت پڑھتے ہوئے چناڑہ لے جا رہے تھے..... گھر کی لڑکیوں کی چیخیں نکل رہی تھیں۔

”منتہا.....“ ایک زوردار چیخ اس کے حلق سے نکلی اور وہ وہیں بے دم ہو کر گر گئی تھی۔



”ہیلو..... السلام علیکم! اماں جہاں سے بات کروادیں..... بہت ضروری کام ہے۔“ اماں جہاں کے نمبر پر کال تھی جسے اجمل بھائی نے ریسپونڈ بھی کر زندگی میں پہلی بار اماں جہاں کو نیند کی دوا دے کر سنانا پڑا تھا۔ منتہا کا جنازہ اٹھنے کے بعد گھر کی تمام خواتین کی ہی حالت غیر تھی مگر اماں جہاں تو عجیب سکتے کی سی کیفیت میں تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی تو مرد قبرستان سے لوٹے تھے۔ اماں جاں کا گھر اتنا ابھی تک وہیں موجود تھا۔ اماں جان نے ہی اماں جہاں کو زبردستی سکون کی گولی دی تھی اور جیسے ہی مرد واپس لوٹے تھے وہ لوگ واپسی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آتے ہوئے اماں جان نے سلطان تائی کو گلے لگا کر تسلی دی تھی اور کہا تھا کہ وہ لوگ کل پھر آئیں گے۔ اجمل اماں جہاں کا بلڈ پریشر چیک کرنے آیا تھا تائی کے کہنے پر جب اماں کے سیل پر اس نے کال ریسپونڈ کی تھی۔

”وعلیکم السلام! معذرت جناب اماں جہاں کی طبیعت اس وقت بہت خراب ہے وہ بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ آج ہی ان کی جواں سال پوتی کا انتقال ہو گیا ہے..... شاید کچھ روزہ نہ تو درس کی محفل کر سکیں گی نہ ہی کوئی ملاقات یا بات چیت..... اللہ حافظ۔“ کال بند کر کے اجمل نے لیٹی ہوئی اماں جہاں کا بازو دسیدھا کر کے پی آپریٹس سیٹ کیا۔ اس سے پہلے وہ اماں جہاں کا سیل آف کرنا نہ بھولا تھا۔ اچانک ہی کمرے میں فجر داخل ہوئی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے اب ان کی..... لی پی تو ٹھیک ہے ناں؟“ اس کی آنکھیں سو جی ہوئیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔

”ہاں لی پی ہائی ہے۔ آپ یہاں کیسے؟ میرا تو خیال ہے کہ باقی سب لوگ جا چکے ہیں۔“ وہ آپریٹس کو بیگ میں رکھتا ہوا سنجیدگی سے بولا۔

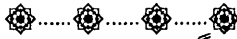
”جی گھر والے چلے گئے۔ صبح آج جائیں گے۔ اماں جان کو تسلی نہیں ہو رہی تھی اماں جہاں کی طرف سے تو مجھے ان کے ساتھ رکھنے کو کہہ دیا..... حادثہ بھی تو بہت بڑا ہے جس نے ہر فرد کے حواس متزلزل کر دیئے ہیں۔ بس اللہ اس کی مغفرت فرمائے اور گھر والوں کو صبر عطا فرمائے کہ اللہ کی مرضی یہی تھی۔“ اس کی آواز بھر گئی۔ اجمل بھی طویل سانس لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ویسے تو یہ رات بھر سکون سے سوتی رہیں گی اگر جاگ بھی جائیں تو کچھ ہلکا سا کھلا پلا کر یہ ٹیبلٹ دے دیجئے گا۔“ اس نے میڈیکل باکس سے گولیوں کا ایک پتا نکال کر اسے پکڑ لیا۔

”آپ نے کچھ کھایا؟ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں..... اماں اور ہمیش بھی اس حالت میں ہیں کہ مہمان داری

کے تقاضے شاید پورے نہ کر سکیں۔“ وہ جاتے ہوئے پلٹا۔

”نہیں نہیں..... کھانے کو کیا ہی جی کرتا کسی کا..... میں نے چائے لی تھی تھوڑی دیر پہلے اور آپ کی امی اور بہنوں کو بھی اماں جان زبردستی تھوڑا بہت کھلا کر گئی ہیں۔ تایا ابا وغیرہ نے بھی کھالیا تھا۔ آپ اس وقت نہیں تھے۔ مجھے تو انا آپ سے کہنا چاہیے کہ کھانا کھالیں تھوڑا سا۔ اماں جان خصوصی تاکید کر کے گئی تھیں کہ جو لوگ رہ گئے ہیں ان کو کھانا پوچھ لوں..... آپ چلیں اپنے کمرے میں، میں لے کر آتی ہوں۔ تھوڑا سا کھانا کھالیں..... پھر چائے لادیتی ہوں۔ یہ رونا تو اب عمر بھر کا ہے مگر اس کے لیے اعصاب کا ساتھ دینا بھی ضروری ہے..... یہاں اماں جہاں آرام کر رہی ہیں، بات کرنے سے ڈسٹرب ہوں گی۔“ آج وہ بہت سنجیدگی اور سمجھداری کا مظاہرہ کر رہی تھی افسردگی کے تاثرات کے ساتھ۔ اجمل سر ہلاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ فجر نے اماں جہاں کی اوپر چادر درست کی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آگئی۔



حسن موہا بل ہاتھوں میں تھا مے سوچوں میں گم تھا۔

”ان کی جوان سال پوتی کا انتقال ہو گیا ہے۔“ جیسے ہی کال پر کہے گئے یہ الفاظ دماغ کی سطح پر ٹکراتے..... اس کے جسم میں سردی لہر دوڑ جاتی۔

”کیا وہی جس سے عبدالحمید کی شادی ہوئی؟“ ذہن میں سوال نے سراٹھایا۔

”نہیں..... نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔“ پھر خود ہی اپنے خیال کی لٹی کر دیتا۔

دہی کی فرم میں سیٹ ہوتے ہی عبدالحمید نے اس سے رابطہ کیا تھا اور سب کچھ سچ بتاتے ہوئے درخواست کی تھی کہ وہ گاہے ۹ ہے اماں جہاں سے فون پر بات کرتا رہے اور اسے ان کی خیریت کی اطلاع کرتا رہے۔ ”مگر تم کب تک ایسے روپوش رہو گے؟ اور ایک فضول سے وعدے کے لیے ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کرو گے..... یاد رکھو عبدالحمید..... وعدہ توڑنے کا تو کفارہ ہو سکتا ہے مگر زندگی خراب کرنے اور دل توڑنے کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔“ حسن نے اسے تنبیہ کی تھی۔

”میری گمشدگی ان کو کمزور کر دے گی۔ تم دیکھنا ایک دن وہ خود ہی کمزور پڑ جائیں گی۔ بہت پیار کرتی ہیں مجھ سے..... پھر جیسے ہی مجھے اس وعدے کی زنجیر سے آزاد کریں گی لامحالہ مجھ سے رابطہ کے لیے تم سے کہیں گی..... میں فوراً ہی بھاگتا چلا آؤں گا۔“

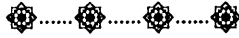
”اور اگر وہ نہ مائیں تو.....“ حسن نے اس کی بات کاٹی۔

”ایسا نہ کہو حسن..... تیرا یار پردیس میں اپنوں سے دوری کا بن باس کاٹ رہا ہے..... اس کے پاس نہ اس کی جنت رہی نہ دنیا..... وہ اسی امید کے سہارے ہی تو زندہ ہے۔“ وہ تڑپ کر بولا تھا۔

”میں جانتا ہوں حسن..... میں اس معصوم لڑکی کا مجرم ہوں یاد..... تو ایسا کرنا حسن، وہاں کا ایک چکر لگا..... ساری صورت حال معلوم کر اور کسی کو کچھ بتائے بغیر مجھے بتائیں بہت پریشان ہوں۔“ اور جس دن حسن نے عبدالحمید کے گھر کا رخت سفر باندھنے کا ارادہ کیا تھا اسے اس کے روڈ ایکسپریس میں شدید زخمی ہونے کی اطلاع ملی تھی۔ وہ فرم کی طرف سے ہاسپٹل آئے تھے اور اس کی حالت از حد تشویش ناک تھی..... حسن نے دہی جانے کے انتظامات شروع کر دیے تھے اور جانے سے پہلے وہ اماں جہاں اور ان کے گھر والوں کو عبدالحمید کے ساتھ ہونے والے حادثہ کا بتانا چاہتا تھا جب..... اسے یہ روح فرسا خبر سنائی گئی تھی جس کے بعد وہ کتنی دیر معطل اعصاب کے

ساتھ بیٹھا رہ گیا تھا۔

”واہ میرے مالک..... زندگی کے کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے جو سوچوں کی حد سے دور اور گمان سے کہیں آگے ہوتے ہیں۔“ افسردگی سے اس نے سوچا اور ایک بار پھر اماں جہاں کے نمبر پر کوشش کی۔ عبدالحسان کے بارے میں تو ابھی اس نے کچھ بتانے کا ارادہ ملتوی کر دیا، تاہم وہ عبدالحسان کی کس کزن کی موت ہوئی اور کیسے ہوئی، یہ جاننا چاہتا تھا..... عبدالحسان کی حالت تو وہاں جا کر زیادہ بہتر طریقے سے پتا چلتی پھر ہی گھر والوں کو کچھ بتانا تا تب تک اس سانچے کو بھی کچھ دن گزر گئے..... یہ فیصلہ اس نے ابھی ابھی کیا تھا مگر دوسری جانب نمبر پاؤر آف تھا اور آج شام اس کی دینی کی فلاحیٹ تھی۔



”اماں کہاں ہیں؟“ وہ ابھی ابھی دکان بند کر کے واپس آیا تھا۔ ناعمہ بھائی نے کھانا لا کر دیا تو وہ منہ کو گود میں لپیٹے ہوئے بولا۔

”انہوں نے کہاں ہونا ہے..... وہیں ہیں جہاں ایک عمر گزار دی۔“ ناعمہ بھائی بیڑاری سے بولیں۔

”اسے مجھے دو، ہمیں کھانا نہیں کھانے دے گا۔“ ناعمہ نے منہ کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”ارے نہیں..... بیٹھنے دیں میرے شہزادے کو..... چاچو کے ساتھ کھانا کھائے گا..... بھائی نہیں آئے ابھی

تک؟“ وہ نوالہ منے کے منہ میں دیتے ہوئے بولا۔

”آئے تھے..... کھانا کھا کر افسوس کے لیے گئے ہیں اماں جہاں کی پوتی کے۔ اماں تو تمہیں بھی ساتھ لانے کا کہہ کے گئی تھی، تمہارا انتظار بھی کرتے رہے اور نمبر بھی بند تھا تمہارا..... اماں تو خفا ہو رہی تھیں کہ جنازے میں بھی شریک نہیں ہوئے تم..... تو آج تو تمہیں ضرور لے کر آئیں۔“

”اوہ ہاں..... مجھے بھی کہا تھا اماں نے..... بھول گیا، سچ میں..... چلیں بھائی تو چلے گئے ہیں، بیٹھ جائیں بات کرنی ہے آپ سے۔“ پھر اس نے دھیرے دھیرے اپنی بھائی کو بتایا کہ وہ لڑکی پہلی بار اس کی بانیک سے ٹکرا کر گری تھی..... دوسری بار اس کی شاپ پر ٹوٹنے لینے آئی تو پرس کھگانے پر اسے پیسے نہیں ملے تھے۔ شاید چوری ہو گئے تھے۔ تو اس نے خفت کے مارے ردنا شروع کر دیا تھا پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا اور اس کے کبھی کبھار آنے پر اسے عجیب سی خوشی اور سرشاری ہوتی تھی اور پھر چھ ماہ بعد اسے لگا کہ وہ محض پسندیدگی نہیں ہے، کچھ اور ہے اور پھر اس نے اسے پروپوز کر دیا اور اس لڑکی نے خوب غصی دکھائی اور اگلے دو ماہ پلٹ کر نہیں آئی۔ اس کی ناراضی دور کرنے کے لیے وہ روزانہ چھٹی کے وقت کالج کے گیٹ پر جا کھڑا ہوتا اور اپنی دوستوں اور کلاس فیلوز کے خمر مٹ میں جیسے ہی وہ باہر نکلتی وہ معافی کے انداز میں ہاتھ جوڑتا اور واپس شاپ پر آ جاتا..... ایک ہفتہ بعد وہ بھری ہوئی شاپ پر آئی اور اس حرکت پر بے نقط سنائی تھیں مگر اسے جب اندازہ ہوا وہ سنجیدہ ہے تو اس نے کہا کہ وہ اس قسم کے تعلقات پسند کرتی ہے نہ ہی سڑکوں، بازاروں میں ملاقاتوں کے سلسلے کو اگر وہ اس کے ساتھ سنجیدہ ہے تو رشتہ لے کر آئے اور اس سے پہلے ہی اماں جہاں نے اماں سے اس کے رشتے کی بات کر دی تھی۔ اپنی کسی پوتی کے لیے..... اب وہ چاہتا تھا کہ ناعمہ بھائی سے بات کر کے ان کو منائے تاکہ وہ عنایتی کو راضی کریں کیونکہ جب سے اس نے عنایتی کو اماں جہاں کی پوتی کے لیے انکار کیا تھا وہ اس سے ناراض ہی تھیں۔ بوتلیں تو نروٹھا سا..... باتوں باتوں میں لوگوں کے بچوں کی فرماں برداری کے گن گاتے ہوئے اپنی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے خوب طویل سانس بھرے جاتیں۔ وہ سمجھ رہا تھا مگر اماں کی محبت اور عقیدت اپنی جگہ وہ اپنی زندگی ان کی

عقیدت کے پیچھے خراب نہیں کر سکتا تھا اور اب جب اس نے بھی صاف اشارہ دے دیا تھا کہ اس کے گھر میں دہلی دہلی اس کی شادی کی بازگشت شروع ہو گئی ہے تو وہ سخت پریشان تھا۔

”نہیں تو جب وہ لڑکی مکمل پردے میں ہوتی ہے تو مجھیں اس کا کیا ایسا بھایا کہ اماں سے لڑ بیٹھے ہو۔“ ناعمہ تو حیران پریشان سی محبت کی انوکھی داستان سن رہی تھی جس کا ذکر اب تک صرف قصے کہانیوں میں سنا تھا۔

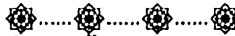
”پتا نہیں بھابی..... اس کی آنکھوں نے مجھے باندھا یا اس کے پردے اور حجاب کا سحر مجھ پر طاری ہوا..... حالانکہ کالج کی بے شمار لڑکیاں میرے پاس ٹوٹس لینے، فوٹو کاپی کرانے آتی ہیں۔ شرم و حیا والی بھی، بے حجاب بھی، نڈر روئے باک بھی مگر اس کی بات ہی الگ ہے..... عب سے الگ۔“ وہ جسے تصور میں اس کا حجاب میں چھپا چہرہ اور چھکی آنکھیں دیکھ رہا تھا۔

”کوشش کروں گی بھیا..... اللہ تمہاری مراد پوری کرے مگر یہ ہے ذرا مشکل بلکہ ناممکن کام، اماں..... اماں جہاں سے جان دینے کی حد تک عقیدت رکھتی ہیں اور تمہارے بھائی کے لیے اپنی ماں کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی ہے اس لیے ذرا قسم کے..... یہ نہ ہو خوابوں کے اس سفر میں بہت دور نکل جاؤ اور پلٹنا مشکل ہو جائے پھر زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گا۔“ وہ ترن اٹھاتے ہوئے ناصحانہ انداز میں بولی۔

”ارے بھابی..... دنیا کا ہر کام اللہ کی مرضی اور حکم سے ہوتا ہے اور اس کا مجھ سے بار بار کرنا اور میری اس سے محبت بے معنی نہیں ہے..... ورنہ میں پانچ سال سے اس کالج کے باہر اس شاپ پر کام کر رہا ہوں، جب میں محض ایک ہیلپر تھا اور آج یہ شاپ میری اپنی ہے۔ ہزاروں لڑکیاں اس عرصہ میں آئی اور جاتی رہیں، میں نے بھی آنکھ اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھا نہ ہی کوئی ایسی ویسی سوچ ذہن میں آئی..... اللہ نے اس سے ملوایا ہے، اس کے لیے دل میں محبت ڈالی ہے تو راستہ بھی نکالے گا..... اس نے کوشش کرنے کو کہا ہے اور وہ میں ضرور کروں گا۔“ وہ ایک عزم سے بولا۔

”ٹھیک ہے میرے بھائی..... میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور میں تمہارے بھیا سے بھی بات کروں گی، چائے لے آؤں؟“

”ہاں جی ضرور لے آئیں اور دیکھیں شہزادہ کھانا کھاتے کھاتے سو گیا۔“ اس نے گود میں سوئے بھتیجے پر پیار سے نظر ڈالی اور اسے احتیاط سے اپنے قریب لیٹا دیا۔ ناعمہ سر ہلاتے ہوئے چائے لینے چلی گئی تھی۔



اماں جان غم سے نڈھال تھیں، ان کی پوتیوں کی ہی ہم عمر تھی وہ، اس گھر کی دیگر بچیوں سے یکسر مختلف ہنسی کھلکھلاتی، شوخ، کبھی کبھار اماں جہاں کو منہا میں اپنا عکس نظر آتا تھا۔ کوئی بات دل میں نہ رکھنے والی، منہ پر کلمہ دینے والی، بس فرق یہ تھا کہ ان کی تربیت نانا کے ہاتھوں ہوئی تھی تو وہ ہر بات خود اعتمادی سے کہہ دیتی تھیں مگر ادب و لحاظ مانع ہوتا تھا جب کہ منہا کے انداز میں ایک محسوس کی جانے والی ضد جھلکتی تھی جو شاید اس گھر کے ماحول اور حالات کی پیدا کردہ تھی۔ نماز عشاء ادا کر کے وہ لیٹ تو گئیں مگر نیند ہی دیر کر دینیں بدلتی رہیں..... اس کے مرے ہوئے چہرے پر جو اذیت رقم تھی وہ بھولے نہ بھول رہی تھی۔ دفعتاً ان کے کمرے کے دروازے پر کسی نے بے تابلی سے دستک دی تو وہ چونک گئیں۔

”اس وقت کون ہے..... اللہ خیر کرے۔“ ڈرا ہوا دل تھوڑا اور سہا۔ جو بھی تھا اسے انہوں نے اندر آنے کی اجازت دی۔ حواس باختہ سی شجر اندرائی۔

”اماں جان..... اماں جان..... وہ وہ مومنہ.....“

”کیا ہوا مومنہ کو؟“ وہ لرز کر بولیں۔

”نہیں نہیں مومنہ کو کچھ نہیں ہوا، آپ آپ جلدی، شیرہ کے کمرے میں چلیں ضروری بات کرنی ہے۔“ انگلیاں مروڑ کر غلغلے میں کہتی وہ دوبارہ بھاگ گئی۔ اماں جان نے چپل پہنی اور ہولتے ہوئے باہر آئیں۔ شیرہ کے کمرے میں جا کر ان کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ صوفے پر پریشان بیٹھا ایان، بیڈ پر شیرہ اور بجر اور ان کے درمیان کسی بت کی مانند ایستادہ مومنہ۔

”یہ..... یہ بچی یہاں کیسے؟“ انہوں نے سرسراتے لہجے میں پوچھا مگر کسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی مومنہ میں گویا جان پڑ گئی تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور آ کر اماں جان سے لپٹ گئی۔ اس کے گلے لگتے ہی اماں جان کو ایک شدید جھٹکا لگا کہ وہ بری طرح بخار میں پھنک رہی تھی۔

”چھوٹی دادی مجھے..... مجھے بچالیں..... وہاں..... وہاں مجھے واپس نہیں جانا..... آپ کو اللہ کا واسطہ مجھے اپنے پاس رکھ لیں، ورنہ میں اپنی جان لے لوں گی۔“ ہڈیانی انداز میں روتی وہ کہہ رہی تھی، اماں جان نے بے حد پریشانی سے اپنے پوتا، پوتیوں کو دیکھا وہ اس کی کمر سہلائی رہیں۔

”اچھا..... اچھا ٹھیک ہے..... بیٹھو آرام سے بات کرتے ہیں۔ مگر پہلے کوئی دوا لے لو، تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔“ وہ اسے بھلائی بیڈ تک لے آئیں اور اپنے ساتھ ہی بیڈ پر بٹھالیا، وہ ہنوز ان سے چپلی پچکیاں لی رہی تھی۔ ”جاؤ بجر ایک گلاس نیم گرم دودھ کا اور ساتھ بخار کی دو گولیاں لے آؤ..... اماں تم جاؤ سو جاؤ بیڈ میں دیکھ لیتی ہوں بچی کو..... ویسے تم یہاں کیسے؟“ اماں جان نے بجر اور ایان کو بیک وقت مخاطب کیا..... بجر تو سر ہلائی باہر نکل گئی تھی۔

”جی اماں جان، میں ہی تو اپنی گاڑی سے ان کو نکال کر لایا ہوں۔ میری گاڑی میں میرے ساتھ صرف شیرہ تھیں، شیرہ تو اترا کر اندر آئیں، میں گاڑی لاک کرنے لگا تو یہ مجھے گاڑی میں پیچھے پھنپی نظر آئیں۔ شاید منہا کی موت کا گہرا صدمہ ہے ان کو، سب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ شیرہ کے کمرے کی لابیٹ جلتی نظر آئی۔“ بجر بھی ان کے ساتھ تھی تو میں ان کو یہاں لے آیا۔“ وہ کھڑا ہوتا ہوا بولا اور اماں جان کے سر ہلانے پر وہاں سے چلا گیا۔ بجر دودھ کا گلاس اور گولیاں لے آئی تھیں۔ جو اماں نے بھدا صرا را سے دودھ کے ساتھ کھلا لیں۔

”اب تم سو جاؤ..... صبح اٹھو گی تو بات کریں گے۔“ اماں جان نے رساں سے کہا۔ وہ اب سسکیاں لے رہی تھی۔

”مم..... میں آپ کی ساتھ سوؤں گی اور مجھے آپ سے بات بھی کرنی ہے۔“ وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ شیرہ نے آنکھن بھری نظروں سے اس کو دیکھا۔

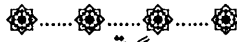
”اچھا ٹھیک ہے..... آؤ میرے ساتھ اور آپ لوگ بھی سو جائیں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔“ اماں جان اس کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی اور بجر، شیرہ سے مخاطب ہوئی۔

”میرا تو دماغ چکر اگیا ہے شیرہ، یہ سب کیا ہے؟ پہلے منہا کی اچانک موت اور اب مومنہ کا پراسرار سارودیہ۔“ ان دونوں کے جانے کے بعد بجر آنکھن سے بولی۔

”میرا تو دماغ ماؤف ہے۔ منہا کی شکل ہی نہیں ہٹ رہی آنکھوں کے سامنے سے..... سلپنگ پلز کے بغیر نیند کا آنا محال ہے اور مومنہ پر بھی منہا کی موت کا گہرا اثر ہوا ہے۔ کلوز بھی تھی اس کی بہت اس لیے ایک تو یہ

صدمہ اوپر سے تیز بخار کی کیفیت میں اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ تم آج یہاں میرے پاس ہی سو جاؤ، صبح تک کچھ بہتر ہو جائے گی وہ بھی۔“

”ہمم..... ٹھیک کہا، لایٹ آف نہیں کرتے شیرہ، عجیب سا خوف محسوس ہو رہا ہے مجھے۔“ فجر نے روندھے ہوئے لہجے میں کہا اور شیرہ کے سر ہلا کر لیٹتے ہی وہ بھی اس سے لیٹ کر سو گئی۔



اس کو تھک تھک کر سلاتے ان کی اپنی نیندیں اڑ گئی تھیں۔

”کوئی اتنا ششی القلب، اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے وہ بھی میری اپنی بہن۔“ انہوں نے اذیت سے آنکھیں میچیں۔

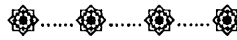
اماں جان..... منہ تڑپ رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اماں جہاں نے پہلی بار پیار سے کچھ پلایا بھی تو کیا..... زہر۔“ مومنہ نے روتے ہوئے جب یہ بتایا انہوں نے اس پیاری لڑکی کی اس وقت کی اذیت کو اپنے دل پر پوری شدت سے محسوس کیا تھا۔

مومنہ نے منہا کی زندگی کی پرت پرت ان کے سامنے کھول کر رکھ دی تھی..... اس شادی سے مسلسل انکار اور عبدالمعید سے شادی کے لیے ضد پھر مایوں والے دن اس کا جا کر اپنی خالہ کے گھر چھپ جانا اور اماں جہاں کا یہ کہہ کر اسے واپس منا کر لے آنا کہ ایک بار وہ آج کی رسم چپ چاپ کرا لے وہ جیسا چاہے گی ویسا ہی ہوگا وہ اس کی شادی عبدالمعید سے ہی کریں گی..... ان کے لہجے میں پچھپی عینگی کو محسوس کرنے کی بجائے اس نے اس کے الفاظ پر اعتبار کیا اور خوش ہو کر چلی آئی..... اس رات اس نے مومنہ کو ہی نہیں عبدالمعید کو بھی اپنی خوشی میں شریک کیا تھا۔

”تین گھنٹے وہ تڑپتی رہی اماں جان اور چلاتی رہی اور میں دروازہ پینٹتی رہی..... یہ دیکھیں میرے ہاتھ اب بھی درد کر رہے ہیں، دروازہ پیٹ پیٹ کر..... میرا گلا بیٹھ گیا چیخ چیخ کے مگر دروازہ نہیں کھلا تھا۔ منہا کی منتظر نظریں آخری وقت تک دروازے کو ہی تھیں۔“ وہ ایک بار پھر بلک بلک کر رودی اور وہ پوری رات یہ سب بتاتے ہوئے بے حساب روئی تھی۔

”آپ..... آپ..... مجھ سے وعدہ کریں مجھے وہاں نہیں بھیجیں گی اب..... میں وہاں اب کبھی نہیں جاؤں گی..... وہ منہا کی طرح ہم سب کو ایک ایک کر کے مار دیں گی۔“ وہ بار بار ان کا ہاتھ پکڑ کر ان سے وعدہ لیتی رہی تھی..... اماں جان ہر بار اذیت اور دکھ کی انتہا پر پہنچ جاتیں جب اس کی یہ ذہنی اتاری دیتھیں۔

”میں نے بہت سوچا لیکن مجھے ایسا کوئی نظر نہیں آیا جو میری مدد کر سکے پھر..... پھر مجھے آپ کا خیال آیا..... آپ ان جیسی نہیں ہیں، ان کی بہن ہونے کے باوجود آپ ضرور مجھے ان سے بچالیں گی، مجھے یقین تھا..... بچائیں گی ناں؟“ اس کے بے تابی سے پوچھے جانے والے سوال پر ان کو اثبات میں سر ہلانا پڑا تھا پھر مومنہ ان سے وعدہ لے کر رہی سوئی تھی۔ چار بجے نہیں جا کر اس کی آنکھ لگی اور فجر کی نماز تک اماں جان کوئی حتمی فیصلہ کر چکی تھیں۔



”منہا مر گئی..... کیا کہہ رہی ہیں امی آپ..... ابھی پرسوں ہی تو اس سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ بہت خوش تھی کہ اس کی دادی ہمارے رشتے کے لیے رضامند ہو گئی ہیں۔“ وہ فون کے دوسری طرف چلا یا۔

”ہاں بچے..... واقعی اس کی دادی اس کو یہاں سے اسی شرط پر لے کر گئی تھیں کہ وہ جیسا چاہتی ہے ویسا ہی ہوگا اور مجھ سے بھی کہا کہ کچھ مسئلے مسائل پنپائیں تو مجھے بتائیں گی تاکہ میں تمہارا ان کے پاس باقاعدہ رشتہ لے کر

اؤں..... بچی خوش خوشی یہاں سے چلی گئی پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اگلے روز اس کے مرنے کی خبر آئی..... مجھے تو اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا مگر ایک دو گلیاں چھوڑ کر ہی تو گھر ہے ان کا، جوان موت کی خبر بھی، چھٹی کیسے، جب بچہ جنازہ تیار تھا میری بچی کا۔“ نصرت بیگم رونے لگیں، عبدالمعید نے اذیت سے آنکھیں سکیڑی اور دل کا درد حد سے سوا ہو گیا تھا۔ پرسوں سے ہی طبیعت عجیب بو جھل تھی وہ اسے کام کی تھکن سمجھا تھا مگر یہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ یہ وہ وقت تھا جب وہ اذیت کے بل صراط سے گزرتی ہوئی زندگی اور موت کے بیچ معلق تھی۔

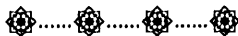
”ہائے میں اس وقت اسے نہ جانے دیتی، روک لیتی اپنے پاس۔“ نصرت بیگم نے روتے ہوئے کہا۔  
 ”کہتے ہیں دماغ کی رگ پھٹی ہے۔ ہناؤ بھلا اس عمر کے لوگوں کی بھی شریان پھٹتی ہے بھلا۔ وہ تو بہت خوش تھی، بہت ہی خوش، کہتی تھی خالد لگن کچی ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔ اماں جہاں جیسی سخت عورت بھی مان ہی گئی ناں..... جاتے جاتے میرے گلے لگتے ہوئے میرے کان میں کہا اس نے۔“ بہت ضبط کرتے بھی عبدالمعید کے آنسو نکل آئے تھے۔

”نہیں اماں..... مارا گیا ہے قتل کیا گیا ہے..... میں بھی حیران تھا کہ ایسے ضدی لوگ اور عین شادی کے وقت کیسے مان گئے، میرے رشتے کے لیے..... بہت سے سوال اور دوسو سے آئے تھے دل میں لیکن میں نے سب جھٹک دیئے اور اس کی خوشی میں خوش ہو گیا تھا۔“ وہ رو رہا تھا، نصرت بیگم کا دل کسی نے بھی میں لیا تھا، یہ خیال تو ان کو بھی آیا تھا اور بار بار آیا تھا جب انہوں نے اماں جہاں کا عجیب اور نا فہم رویہ دیکھا تھا مگر پھر اسے شیطانی دوسا سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اب ان کے بیٹے نے بھی یہ بات کہہ دی تو ان کو اپنا شبہ بھی یقین میں بدلتا محسوس ہوا تھا۔

”ایسا ہے بھی تو اب ہم کیا کر سکتے ہیں بیٹا، اس کی واپس آنے کا یقین بھی ہوتا تو کچھ کر بھی لیتے۔ اب تو کچھ کہہ کر برے ہم نہیں گے اور ہماری بچی کی عزت الگ اچھلے گی۔ مالک ہے نا انصاف کرنے والا، وہ کرے گا انصاف۔“

”اتنی سستی ہے زندگی..... اماں ایک جان کو لحوں میں ختم کر دیا انہوں نے اور کوئی آ کے سوال بھی نہ کرے۔“ وہ شاکی ہوا۔

”ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں بیٹا سوائے صبر کے اور یہ تو ہمارا شک بھی ہو سکتا ہے اور وہم بھی اور ویسے بھی ہمارا ایمان تو یہ ہے کہ ہر ذی روح کے جانے کا ایک وقت مقرر ہے اس کا وقت تھا چلی گئی، وجہ چاہے جو بھی ہو..... مالک اس کی بخشش فرمائے، اب تو سب سے بہترین چیز جو ہم اسے دے سکتے ہیں وہ دعا ہے..... نماز پڑھو اور اس کی بخشش کے لیے دعا کرو..... سکون ملے گا۔“ انہوں نے کہا اور ایک دو اور تاکیدیں کر کے فون بند کر دیا تھا۔ عبدالمعید نے بھی موبائل ایک طرف رکھا اور سر ہاتھوں میں تمام کر بیٹھ گیا، رہ رہ کر اس کی باتیں، ہنسی، انداز کیا کیا نا یاد رہا تھا۔



سعیدہ کے شادی کے اصرار پر ابہتاج ملک اتنے زچ ہو گئے کہ شدید غصے میں گھر سے گاڑی لے کر نکلے اور اسی ذہنی انتشار میں انہوں نے نہ جانے کیسے گاڑی سامنے آنے والے ٹرک کو دے ماری تھی۔ ٹرک کے اگلے حصے کو معمولی نقصان پہنچا تھا جب کہ ان کی گاڑی بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی تھی اور وہ خود شدید زخمی..... سعیدہ پھوپھو اور ابہتاج ملک کے والد شدید پریشانی میں ہسپتال پہنچے تھے۔ زندگی میں پہلی بار سعیدہ کو ان کے شوہر نے

خوب سنائی تھیں اور کہا تھا کہ اگر ان کے بیٹے کو کچھ ہوا تو وہ نہ تو انہیں معاف کریں گے، نہ ہی اپنے گھر میں رہنے دیں گے۔

سعیدہ جو بیٹے کی ضد سے پہلے ہی پریشان تھیں، بیٹے کی حالت اور شوہر کے رویے سے بری طرح خوف زدہ ہو گئی تھیں اور جیسے ہی ڈاکٹر نے ابہتاج ملک کے خطرے سے باہر آنے کی نوید سنائی میاں کو بتائے بغیر وہ مریم کے ناناکہ گھر آئی تھیں اور روتے ہوئے ساری بات بتا کر دوپٹا ان کے قدموں میں ڈالتے ہوئے مریم کا رشتہ ابہتاج ملک کے لیے مانگ لیا تھا..... بڑے میاں تو ان کی حالت اور اصرار پر ششدر رہی رہ گئے مگر جواب دینے میں تامل سے کام لیا جس کا رشتہ مانگنے وہ آئی تھیں وہ بھی ان کی انواری تھی اور جس کو چھوڑ کر ابہتاج ملک مریم کو اپنانا چاہتے تھے۔ ان سے بھی ان کا وہی رشتہ تھا..... یہی بات انہوں نے سعیدہ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ سب رشتوں کے نازک ڈور سے بندھے ہیں۔ ایک دھاگا ٹوٹنے سے پوری ڈور بھی الجھ کر رشتے اور تعلقات خراب کرے گی مگر سعیدہ بھی ڈٹ گئیں اور اپنے بیٹے کی زندگی اور خوشی کے واسطے دے کر کہا کہ ابہتاج ملک شائستہ سے کسی طور رشتہ جوڑنے پر تیار نہیں ہے تو کیا بہتر نہیں ہوگا کہ دو لوگوں کو ان چاہے رشتے میں باندھ کر ان کی زندگی خراب کی جائے..... تعلقات وقتی طور پر اگر خراب بھی ہوئے تو ان کو دوبارہ ٹھیک کیا جاسکتا ہے مگر زندگی اگر خراب ہوگئی تو اسے سدھارنا ناممکن ہو جائے گا مزید انہوں نے کہا کہ وہ اپنی بھابی یعنی مریم اور شائستہ کی امی کو بھی خود ہی منالیں گی کیونکہ وہ ایک سبھی ہوئی اور معاملہ ہم خاتون تھیں، یقیناً ان کا مسئلہ سمجھ لیں گی اور مریم کے ناناکہ اس شرط پر مانے تھے کہ اگر ان کی بیٹی کو کوئی اعتراض نہیں تو انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا، ہاں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ شادی بھی تب کریں گے جب شائستہ کی شادی ہو جائے گی، وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بچی کو کسی کی بددعا لگے کیونکہ اس سارے سلسلے میں ان کو مظلوم شائستہ ہی نظر آ رہی تھی..... سعیدہ اسی میں خوش ہو کر ان کو دعا میں دیتی واپس آ گئی تھیں۔

ہوش میں آنے پر ان کو اپنے بیٹے کو زندگی کی سب سے بڑی نوید دینی تھی اور اپنی بھابی کو بھی منانا تھا اور شائستہ کے لیے رشتہ بھی تلاش کرنا تھا کیونکہ ان کے بھائی اور بچیوں کے والد تو حیات تھے نہیں، اب ان کی کچھ ذمہ داریاں بھی انہی کو نبھانی تھیں، مریم کے ناناکہ نے مزید کہا تھا کہ یہ سب کچھ تب ہوگا جب مریم بھی رضا مند ہوگی اور مریم کے سامنے جب ساری صورت حال رکھی گئی تو اس نے سب کچھ اپنے پیارے ناناکہ پر چھوڑ دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





# عبد جبار انور کی

فاطمہ عاشی

جو آسمان پر ہمیشہ رہا ہے آج اسے  
ہمیں بتانا ہے اک جگہ زمین بھی ہے  
انا پرست ہے وہ، جانتے ہیں ہم لیکن  
وہ خود بلائے گا اس بات کا یقین بھی ہے

کیس۔ اپنا اسکارف اتار کر بیک کی زپ کو جوئی کھولا  
سیل فون دیکھنے پر اسے اچانک یاد آیا کیا آج تو اسے ماں  
سے بھی بات کرنا تھی اسی او ہیٹر بن میں تھی کہ واش روم کا  
دروازہ دھڑ سے کھلا اور ماریہ صاحبہ اپنے گیلے بالوں کے  
ساتھ برآمد ہوئیں اور اسی جلیے میں نور سے لیٹ گئی۔  
”آگئی میری پیاری روئی۔“ اسے نکلے سے لگا کر  
خوب بھینچا۔ نور کو پناہ دہ گھٹا ہوا مسخوس ہوا۔

”اوف..... چھوڑو بھی سیل فون میں پانی چلا جائے  
گیا رُجوتہا رے گیلے بالوں سے فیک رہا ہے۔“ نور نے  
اسے خود سے الگ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے سیل  
فون کو بیڈ پر اچھال دیا۔

”اچھا جی..... اب سیل فون ہم سے بھی زیادہ قیمتی  
ہو گیا۔ ظاہر ہے اس بمبوں کی کالز اور میسجز تمہارا سیل فون  
ہی ریسیدو کرتا ہے نہ کہ ہم۔“ ماریہ نے برا سامنے بناتے  
ہوئے کہا۔

”ایسا کچھ نہیں ہے اور تم ہر بات میں اس کا ذکر کیوں  
لے آتی ہو؟ ویسے بھی میں نے آج ماں کو کال کرنے کا  
ارادہ کیا تھا تب ہی اس کے بارے میں تھوڑی فکر مند  
ہو رہی ہوں اور پلیر یا رمت کیا کرو اس کا ذکر۔“ نور نے

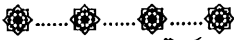
دن بھر کی تھکی ہاری نور فاطمہ نے جیسے ہی وومن ہاسٹل  
کے اس ڈربے میں قدم رکھا جسے اس کا کمرہ ہونے کا  
شرف حاصل تھا، کوفت نے اسے آگھیرا اسے بے ترتیبی  
سے جتنی کوفت تھی اتنا ہی یہ کمرہ اس کا عکاس تھا کمرے  
میں دو بیڈ تھے جن پر کتا بیں اور کپڑوں کا ڈھیر بھرا ہوا تھا  
کونے میں ایک پرانی سی الماری تھی جس کے دونوں پٹ  
کھلے ہوئے تھے الماری کے ایک حصے سے اس کی روم  
میٹ ماریہ کے کچھ کپڑے باہر لٹکے ہوئے تھے گیلیا تو لیہ  
جس سے نور کو سخت وحشت ہوتی تھی کمپیوٹر میز پر گولہ بنا  
پڑا تھا۔ واش روم میں سے پانی گرنے کی آوازیں اس  
بات کا ثبوت دے رہی تھیں کہ ماریہ صاحبہ غسل فرما رہی  
ہیں، کمرے میں ایک ہی سوچ بورڈ تھا جس میں میو بال  
چار جڑ لگا ہوا تھا، گویا کہ مفت کی بجلی ضائع ہو رہی تھی یہ  
سب کچھ نور کے لیے انتہائی وحشت اور کوفت کا باعث تھا  
مگر مزاجاً نور فاطمہ نرم اور صلح جوڑ کی تھی۔ ماریہ سے اس کی  
دوستی تھی کئی سالوں کا ساتھ تھا چنانچہ اپنی تھکن کو بھول کر  
اس نے کمرے کی حالت درست کرنے کی ٹھانی  
کپڑوں کو ترتیب دیا، تو لیہ کو پھیلا کر اس کی جگہ پر رکھا  
الماری کی حالت درست کی، بیڈ کی چادر کی شکنیں درست

ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میں کروں گی، بار بار اس کا ذکر کروں گی اور ویسے بھی میرا ماننا یہ ہے کہ وہ تم سے سچی محبت کرتا ہے اور محبت اپنا آپ منوالیتی ہے اور مجھے بتاؤ اس بے چارے کا قصور کیا ہے صرف اتنا نہ کہ وہ تم سے محبت.....“

”پلیز اسٹاپ اٹ یار..... اگر تم چاہتی ہو کہ میں یہاں پر سکون رہوں اور اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزاروں تو تم سے التجا ہے کہ اس کا با محبت کا ذکر نہیں کرو گی ورنہ میں یہاں سے کہیں دور چلی جاؤں گی یا خود کشی کر لوں گی۔“ انتہائی جارحانہ انداز میں نور نے ماریہ کی بات کا نٹے ہوئے بے بسی سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”اوکے یار..... تم غصہ مت کرو..... ریلیکس آرام کرو میں چائے کا انتظام کرواتی ہوں تب تک۔ تم کول ہو جاؤ۔“ ہمیشہ کی طرح ماریہ نے پروائی سے بولتی کمرے سے نکل گئی تھی مگر ہر یار نور کے دل و دماغ پر ایک گھونسا سا پڑتا تھا وہ جو زندگی کی ہر مشکل کا آسان کر کے اس مقام پر آن پہنچی تھی کہ اب معاشرے میں اس کا نام تھا ایک مقام تھا محبت جیسا مشکل کھیل اس کے نام اور مقام کو بے معنی کرنے پر تلا ہوا تھا اور ایسا وہ کسی صورت بھی نہیں چاہتی تھی۔

”زندگی کیوں اتنی مشکل ہے؟“ یہی سوچتے ہوئے وہ بیڈ پر لیٹ گئی تھی۔



زندگی تھک کے گرتی ہے تو خیال آتا ہے جان لیوا بے لاحاصل کی تمنا کرنا.....!

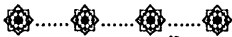
زین شہر یار کے لیے نور فاطمہ کا حصول کوئی مشکل امر نہیں تھا ہاں مگر اس کی محبت حاصل کرنا لاحاصل سا

زین شہر یار کا ذکر آتے ہی وہ ایسا ہی جارحانہ انداز اپنا لیتی تھی مگر یہ ماریہ ہی تھی جو ہر بار پھر سے کسی نہ کسی طرح اسے دوبارہ سے اسی ٹریک پر لے آتی جو اس جیسی خوش مزاج اور سنجیدہ لڑکی کو پھرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔



زیادتی کی وجہ سے طبیعت پر تھوڑا اثر پڑا ہے۔ اچھی نیند لوں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔ چلو اب۔“ لا پروا انداز میں اس نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ شاہ نواز نے بھی کندھے اچکا کر اس کی تقلید کی..... زین کی یہ لاعلمی اسے عجیب ضرور لگی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ سب سے بچنا چاہتا ہے دل کی دگرگوں حالت چہرے پر عیاں ہونے لگی تھی۔ شاہ نواز کو شک تو تھا مگر اب یقین ہو گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ افروز سے اس سلسلے میں بات کرے گا اس نے اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھائے، زین پہلے ہی اپنی کار میں گھر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

”آخر افروز کو اس معاملے کی کچھ نہ کچھ خبر ضرور ہوگی۔ کوئی نہیں مت بتا..... تیری بہن کس دن کام آئے گی؟“ بڑبڑاتے ہوئے اس نے گاڑی اشارت کر دی تھی۔



جون کی تپتی دھوپ تھی سورج سر پر چمک رہا تھا سخت گرمی سب کو پریشان کر رہی تھی۔ حویلی کے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں تھے مگر وہ دونوں حویلی کے صحن کے وسط میں لگتا م کے درخت پر چڑھی گرمی سے بے نیاز مسلسل کیریاں توڑنے میں مصروف تھیں اور پچی کیریاں توڑ توڑ کر نیچے کھڑے بخشو چاچا کی طرف پھینک رہی تھیں جو نیچے ٹوٹ کر لیے کھڑا چورنگا ہوں سے بھی ان دونوں کی طرف دیکھتا اور بھی اندرونی دروازے کی طرف مالک کا ڈر بھی تھا اور ساتھ میں مالکن کے حکم کا بھی لحاظ تھا۔

”فری یار..... یہ دیکھو ادھر پورا چھلانگ رہا ہے تمہارے پیچھے۔“ نور نے لنگور کی طرح اس شاخ پر چھلانگ لگائی۔ جہاں افروز بڑے آرام سے بیٹھی پچی کیری کھانے میں مصروف تھی۔ دونوں کی مشترکہ چیخ اچانک برآمد ہوئی بخشو بے چارہ نیچے کھڑا ایک دم ہولتوں کی طرح پیچھے ہٹا اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ شاخ سمیت دونوں لڑکیاں زمین پر آن

محسوس ہو رہا تھا۔ دل جتنا اس لڑکی کی محبت اور قرب کا خواہش مند تھا اس کے حصول کی تمنا میں جتنا دل میں اٹھتیں قدم اس کے وجود کی طرف جتنے بھی بڑھتے وہ لڑکی اتنا ہی پیچھے ہٹ جاتی، بار بار اسے دھکا دیتی آج بھی سارا دن اسے کئی کالز آئیں زین نے اپنی محبت سے بھرپور سینکڑوں میسجز اسے کرے تھے مگر ہمیشہ کی طرح اس کی طرف سے جواب نہ مارا۔ بار بار دیکھے جانے سے زین شہر یا راند رہی اندر جس ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا یہ وہی جانتا تھا وہ دشمن جاں آفس میں بھی سارا دن اس کے دل و دماغ پر سوار رہتی تھی۔ زین نے آفس میں آج کچھ بھی نہیں کھایا تھا، نہ ہی گھر گیا تھا، کام ختم ہو جانے کے باوجود اسی طرح اپنے آفس روم میں بیٹھا اس لڑکی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پیون نے شاہ نواز ابرار کے آنے کی اطلاع دی۔

”شاہ نواز..... اس وقت یہاں؟“ بڑبڑاتے ہوئے اس نے گھڑی پر نظر دوڑائی جو رات کے آٹھ بجے کا اعلان کر رہی تھی۔

”اف..... آج تو وقت گزرنے کا اندازہ بھی نہیں ہوا۔“ وہ جلدی جلدی اپنی چیزیں سیننے لگا۔

”جی..... مسٹر زین آپ صبح سے اب تک یہاں تشریف فرما ہیں اور وہاں آپ کی فیملی عجیب و موسموں کا شکار ہو رہی ہے اسی لیے آپ کی بہن صاحبہ نے مجھے یہاں آپ کو لینے اور آپ کا اٹھ پتہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ یار کم از کم گھر تو بتا دیا کرو کہ تم کہاں ہو؟“

”سوسوری یار..... کام ہی اس قدر تھا کہ کچھ خبر ہی نہ ہوئی کہ میں کہاں ہوں۔“ زین نے معذرت خواہانہ لہجے میں کافی حد تک خود کو سنھال کر جواب دیا۔

”اچھا چھوڑو..... گھر چلو ویسے خیر تو ہے تمہاری آنکھیں کچھ اور ہی کہانی سنار ہی ہیں۔“ شاہ نواز نے اس کی سرخ آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اف..... ایک تو تمہیں تھا نیداردوں کی طرح تفتیش کرنے کی بہت بری عادت ہے کچھ نہیں ہے بس کام کی

گريں ڪيونڪہ دونوں اپنا توازن برقرار نٿين رڪھ سگھي ٿيون۔  
 ”اف..... ميرے خدايا..... ميري ٿانگ.....“ نور  
 نے ٿانگ کي ڀڙڪر زور زور سے چلانا شروع ڪر ديا۔ افروز  
 اوندھ منہ ڪري ٿي، بخشو نے کيريون والي نوڪري وٺڻ  
 پھڻي اور مالڪن کي سيدھا ڪيا، نور بهي اپني ٿانگ کي چھوڙ ڪر  
 افروز کي طرف بڙھي۔

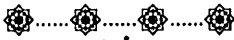
”اف..... ڪيا ضرورت تھي تھين يوں بندر کي طرح  
 اچھلنے کي! اچھا بھلا کيرياں تو رھي ٿي، میں خود تو ڏيئي اب  
 ڊکھ ليا ناں شھر؟ اب بابا، ماں اور چھو پوکو پتا چلا تو بہت برا  
 هوگا۔“ چهرے پر تکليف کے آثار تھے مگر افروز نے بڑی  
 پھرتي سے ان کي چھپا کر کھڙے ھونے کي ڪوشش ڪي ٿي۔  
 ”بخشو بابا..... وعدہ ڪريں آپ کي کو بهي نٿين بتائين  
 گے۔“ نور نے افروز کي سھارا ڏيئي ھوئے بخشو بابا کے  
 سامنے ھاٿھ جوڙے۔

”بي بي..... آپ ٽھيڪ تو ھيں اور تو..... نور؟ تجھے تو  
 ڪجهہ نٿين ھو؟“ اب تم اندر جاؤ کوئي آگيا تو میں تو گيا ڪام  
 سے۔“ بخشو بابا نے فڪر مند انداز میں ڪھا اور چور نظروں  
 سے ادھر ادھر ڏيکھي ھوئے اندر کي طرف بھاگ کھڙا ھو۔  
 ”يہ تو ہے ہی سدا کا ڏور پوک..... يار تم تو ٽھيڪ ھو  
 ناں؟“ نور نے افروز سے پوچھا جو اپنے بازو سھلاري  
 ٿي۔

”هاں ٽھيڪ ھوں..... جلدي ڪريو يہ کيرياں اٿھا اور  
 اندر چلو چھپاؤ ان کي ھوگر کي کو پتا چل گيا تو اپني خير نٿين۔“  
 افروز نے کيرياں اٿھائے ھوئے اپني تکليف مڪمل نظر  
 انداز کي۔

نور فاطمہ نے بهي کيرياں نوڪري میں بھرتي ھوئے  
 دروازے کي طرف ڏيکھنا شروع ڪر ديا، جاني ٿي کہ اگر  
 ماں کو پتا چل گيا تو اس کي خيريت خطرے میں ہے اس  
 کے ساتھ ساتھ بخشو بابا بهي مارا جاتے گا افروز کي تو خير ٿي  
 وہ تو مالڪن ٿي۔ دونوں نے لڙڪھڙائے قدموں سے اندر کي  
 طرف قدم بڙھائے اگلا مرحلہ افروز کے ڪمرے میں  
 جا کر کنڌي لگا کر ان کي کيريون کو کھائے کا ٿا جو ان

دونوں سھيلوں کي پسنديدہ مشغلہ ٿا۔



”بيلو..... نور از ھير؟“ آفس کي طرف قدم بڙھائے  
 ھوئے جيسے ہی اس نے سيل فون اپنے کان سے لگا کر  
 افروز کي آواز سني ايڪ دم رڪ گئي۔

”جی نور فاطمہ بات ڪر رہی ھوں۔“ تھوڙي دير  
 خاموش رھنے کے بعد اس نے ڪھا۔

”حد ھوتی ہے يار بهي تو فون اٿھا ليا ڪر وشادي ڪيا  
 ھوتی ميري تم تو ايسے روکھ گئي ھو جيسے کوئي تعلق ہی نہ ھو، ہم  
 دونوں میں۔“ بهي تو گھر آجايو ڪر ڪٽنا ياد ڪرتي ھوں میں  
 تھين اور تم ھو ڪہ مجھے بھلائے بيٺي ھو۔“ افروز کي طرف  
 سے شڪوؤں کا طوفان ٿا جواب میں نور نے ايڪ ٽھنڌي  
 سانس خارج ڪي۔

”ايسی بات نٿين ہے میں اپني دوست کو بهي ڪھي بھلا  
 سگھي ھوں؟ بس آج کل اسڪول کے ڪاموں میں مصروف  
 ھوں ساتھ ساتھ ڪھڻے ڪھڻے لکھائے کا بهي ڪام جاري رھتا ہے  
 مصروفيت اس قدر ھو جاتی ہے کہ اپنے لیے بهي وقت  
 ٻڪا نا مشڪل ھو جاتا ہے۔ میں آؤں گی ڪسي دن۔“ نور نے  
 تفصيلي جواب ڏيا۔

”بس بهي ڪتي رھنا ڪاؤں گی، پتا نٿين ڪب آؤ گی؟  
 ياد رکھو اگر اس ھفتے تم نے گھر چڪر نہ لگايا تو میں بواجي سے  
 تمھاري شڪايت ڪر دوں گی ڪآپ کي پياري بيٺي مجھے بھلا  
 چڪي ہے اور مجھے علم ہے کہ اپني ماں کي ڏانٺ تم ڪھي  
 برداشت نٿين ڪر پاؤ گی۔“ افروز نے دھمڪي آميز لہجے میں  
 ڪھا۔

”ڪها ناں ضرور آؤں گی، فرصت نکالوں گی تو چڪر  
 ضرور لگاؤں گی اور ڏاکٽر صاحب آپ اي تک بات نہ ہی  
 پنھنجائين تو بہتر ھوگا۔“ نور فاطمہ نے ٻلڪے ٻلڪے انداز میں  
 جواب ڏيا۔

”اگر تم ڪھو تو میں اور شاھ نواز تھين کل اسڪول سے  
 پڪ ڪر لیں گے ڪيونڪہ کل ميري ڏے ڏيولي ہے اور شاھ  
 نواز کي بهي صبح کي ميننگ ہے صرف..... ہم دونوں ايڪ

ساتھ ہی نکلیں گے۔“ افروز نے پیش کش کی تھی۔  
 ”نہیں..... تم تکلف مت کرو میں خود آ جاؤں گی۔“  
 شاہ نواز کا نام سنتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی  
 تھی، وہ اس شخص کا نام بھی سننا نہیں چاہتی تھی کجا کہ اس  
 کے ساتھ جاتی۔

”ادھر تم مصروف رہنے لگے ہو ادھر نور بھی کافی  
 عرصے سے غائب ہے شاہ نواز بھی کل تمہارے بارے  
 میں پریشان تھے کہ تم کیوں سب سے لائق رہنے لگے  
 ہو، مجھ سے کہنے لگے کہ میں تم سے وجود دریافت کروں اور  
 نور کا حال دیکھو شادی کے بعد بس ایک بار ادھر کا چکر لگایا  
 ہے حالانکہ میری بیسٹ فرینڈ ہے وہ۔“ افروز نے نور کا  
 ذکر کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔

”آپی..... میں بالکل ٹھیک ہوں اور جہاں تک نور  
 کے رویے کی بات ہے وہ مجھ سے بھی بات نہیں کرتی۔“  
 نور کے ذکر پر زین کے چہرے پر ایک سایہ سالہا تھا،  
 اپنی حالت کو چھپاتے اور ضبط کے انتہائی مراحل سے  
 گزرتے ہوئے اس نے قدرے لائق انداز میں  
 جواب دیا تھا۔

”اوہ..... اب سمجھی کہیں تم اسی کی وجہ سے تو پریشان  
 نہیں ہو؟“ افروز نے اس کے چہرے پر ضبط کے آثار  
 دیکھ کر اندازہ لگایا۔

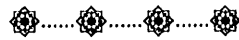
”آپی..... میں کیوں اس بے رحم اور ظالم لڑکی کی وجہ  
 سے خود کو اپ سیٹ کروں گا اور وہ مجھے کیا ہے خود کو؟  
 ہنہ۔“ زین نے غصے سے افروز کی بات کاٹ کر کہا۔

”ظالم..... بے رحم..... زین، ہوا کیا ہے، تم اسے ایسا  
 کیوں کہہ رہے ہو؟ پلیز مجھے بتاؤ آخر اس کی اور تمہاری  
 اس لائقیت کی وجہ کیا ہے، کہیں تم اسے پسند تو نہیں  
 کرتے، یا کوئی محبت و جنت کا چکر.....؟“ افروز نے  
 حیرانگی سے استفسار کیا۔

”ہاں..... کرتا ہوں اس سے محبت..... مگر وہ مجھے اور  
 میری محبت کو جوڑنے کی ٹوک پر کھتی ہے، اس کے نزدیک  
 میری کوئی اہمیت نہیں میری محبت اس کے سامنے ایک  
 ڈراما ہے جسے وہ قبول کرنے کو تیار نہیں..... چاہے میں مر

”اچھا میں تھوڑی بڑی ہوں پھر بات ہوتی ہے پلیز  
 تم برا مت ماننا اور ہاں میں خود ملنے آؤں گی۔“ نور نے  
 اندر کی کیفیت کو چھپاتے ہوئے جان چھڑانا چاہی تھی۔  
 ”چلو پھر بات ہوگی..... اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ اور  
 ہاں آنا ضرور۔“ افروز نے اس کے رویے پر حیران ہوتے  
 ہوئے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

نور صرف افروز کی وجہ سے مجبور تھی افروز اس سے  
 بات کر لیتی تھی ورنہ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی ماں کو لے کر  
 اس خاندان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور چلی جائے جو  
 چوٹ شاہ نواز نے اسے پہنچائی تھی اور جو صدمہ اس  
 خاندان کے ذریعے اس کو پہنچا تھا اس کے مقابلے میں  
 ان کی تمام تر ہمدردیاں جو وہ نور اور اس کی ماں کے ساتھ  
 کرتے تھے، کیا کم تھیں۔ غصے سے اس نے بھی سیل فون  
 بند کیا اور اسکول کے کاموں میں مشغول ہو گئی..... وہ  
 افروز اور اس سے جڑی کسی بات کو سوچنا بھی نہیں چاہتی  
 تھی۔



”زین..... کیا بات ہے؟ کچھ دنوں سے میں دیکھ  
 رہی ہوں کہ تم بہت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے ہونہ  
 ٹھیک سے کھاتے ہونہ ہی اپنا خیال رکھ رہے ہو.....  
 آفس کا کوئی مسئلہ ہے تو شاہ نواز سے ڈسکس کر لو اور اگر  
 کوئی اور پریشانی ہے تو تمہاری یہ بہن حاضر ہے۔“ افروز  
 نے زین سے استفسار کیا جو بظاہر ٹوٹی وی اسکرین پر  
 نظریں جمائے ہوئے تھا مگر دماغ کہیں اور ہی اڑان بھر  
 رہا تھا۔

”نہیں آپی..... ایسا کچھ بھی نہیں ہے یہ صرف آپ کا  
 وہم ہے، آفس میں آج کل زیادہ مصروفیت کی وجہ سے

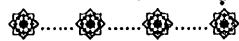
بھی جاؤں پھر بھی اس بے رحم جذباتی لڑکی کو میرے جذبوں کی سچائی پر یقین نہیں آئے گا۔“ زین نے غصے میں آ کر اپنے دل کی حالت افروز پر واضح کر دی۔

”اور ہاں آپ!..... آپ سے ایک گزارش ہے کہ کبھی بھی اس سے میرے لیے اس کی محبت کی بھیک مت مانگیے گا کیونکہ محبت دل سے ہونی ہے بدلے یا بھیک میں نہیں ملتی۔“ زین کی آنکھیں سرخ ہوئیں اور چہرے پر ایک کرب کی کیفیت تھی جو اس کے ٹوٹے ہوئے کرچی کرچی دل کی حالت افروز پر واضح کر رہی تھی۔

”افسوس کا مقام ہے، انتہائی افسوس کا..... میرے بھائی تم اسے اپنی محبت جتاتے رہے اور وہ تمہیں بار بار ٹھکراتی رہی اور تم نے یا اس نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا؟ آخر کیا برائی ہے کیا خرابی ہے تم میں یا تمہاری محبت میں؟ اور تم کہتے ہو کہ میں اس سے وجہ تک نہ پوچھوں..... کیا چاہتی ہے آخر وہ؟“ افروز نے صدمے سے استفہار کیا۔

”پہلے تو ملتی تھی جب میں نے اپنی محبت کا اظہار کیا، اس کے ساتھ کی خواہش ظاہر کی تو اس نے ملنا بھی ترک کر دیا“ جب دل میں اس کے قرب اور ساتھ کی خواہش نے اور زور پکڑا تو ملنا اور بات کرنا تو درکنار اس نے فون کالز بھی اینڈ کرنا چھوڑ دیں آپ!۔“ زین نے دکھ سے افروز پر سب کچھ واضح کر دیا تھا۔

”تم فکر مت کرو میں خود بواجبی سے بات کروں گی اور نور فاطمہ سے بھی وجہ دریافت کروں گی..... بس تم خوش رہا کرو، نور ضرور تمہاری محبت کو تسلیم کرے گی۔“ بھائی کی دگرگوں حالت دیکھتے ہوئے افروز نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنے ساتھ لگایا تھا۔



”رحمتِ دلا“ نور فاطمہ اور اس کی ماں سکینہ بی بی کے لیے ایک شجر سایہ دار تھا اس کی چھاؤں میں وہ کئی سالوں سے زندگی کے شب و روز گزار رہی تھیں۔ وہ خود بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتی تھی کہ وہ اس پناہ گاہ کے حصار میں

کب سے تھی، ماں کی زبانی بس اتنا سنا تھا کہ جب زندگی کی تلخیاں بڑھتی گئیں اور اس کے باپ نے اس کی ماں کو بیٹا نہ ہونے کے جرم میں مار پیٹ کے گھر سے نکال دیا اور طلاق کا داغ اس کے ماتھے پر سجا دیا تو وہ اپنی چھ ماہ کی نور فاطمہ کو لے کر شاہوں کی اس حویلی میں آ گئی تھی جہاں کے کینوں نے نہ صرف اسے پناہ دی بلکہ اس کی بچی کو بھی اپنا سمجھ کر اپنے بچوں کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کر دیا تھا۔

حویلی کے سربراہ چوہدری حیات شاہ تھے جن کے دو ہی بیٹے تھے شہر یار شاہ اور ابراہار شاہ، ابراہار شاہ بڑے بھائی تھے حیات شاہ نے ان کی شادی اپنی بیوی زینا بیگم کی بھانجی عمرانہ سے کی تھی عمرانہ اور ابراہار کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام شاہ نواز تھا..... زینا بیگم دوسرے بیٹے شہر یار کی خوشی دیکھنے سے پہلے ہی اس دنیا سے چلی گئیں..... شہر یار بیرون ملک مقیم تھے تعلیم کے سلسلے میں گئے تھے وہاں عاصمہ کو پسند کیا جو ڈاکٹر تھیں اور ایک اچھے اور پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور وہیں ان کی شادی ہو گئی تھی۔ ماں کی وفات کی خبر سنی تو پاکستان واپس آ گئے..... حیات شاہ شروع میں تو ان کی اس حرکت سے بہت نالاں ہوئے مگر بہو چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور گھر ہستی میں ماہر تھیں آتے ہی سب خاندان کو اپنے اخلاق کی بنا پر اپنا بنالیا تھا۔ انہوں نے بھی بہو کو دل سے قبول کر لیا تھا زینا بیگم کی زندگی میں ہی سکینہ بی بی نور فاطمہ کو لے کر پناہ کی تلاش میں ان کے پاس آئی تھیں زینا کے حسن اخلاق اور غربوں کے ساتھ نیک برتاؤ نے سکینہ کو ان کا گرویدہ کر دیا اور وہ زینا بیگم کی خدمت میں جت گئیں..... لیکن کا سارا انتظام ان کے ذمے تھا، زینا سکینہ کو بہنوں کی طرح سمجھتی تھیں اور نور فاطمہ کو بھی بہت چاہتی تھیں ان کی وفات کے بعد نور فاطمہ کی ذمہ داری عاصمہ بیگم اور شہر یار شاہ نے لے لی اپنے دو بچوں افروز اور زین کو باکروہ دونوں بہت خوش تھے مگر اس خوب صورت بچی کو بھی وہ اپنی بیٹیوں کی طرح ہی سمجھتے تھے۔ حیات شاہ اور گھر

سرد اور خشک تھی سارے ماحول پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ نور بھی بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اسے کام سے فارغ ہو کر ہاسٹل جانے کو تیار تھی ایک مقامی میگزین کے ہیڈ آفس میں ایڈیٹر سے اسے کچھ کام تھا جیسے ہی کام ختم ہوا وہ آفس سے نکل آئی۔ سڑک پر ٹریفک کا کافی رش تھا پوائنٹ کا انتظار کرتے ہوئے اسے قریبی کیفے ٹیریا کے مین ڈور سے زین نکلتا ہوا دکھائی دیا اپنی کار تک جاتے ہوئے زین نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔

وہ ہزاروں لوگوں میں اسے پہچان سکتا تھا لاٹک شرٹ اور ٹراؤزر میں بلبوس کندھوں پر دو پٹا پھیلائے سر پر بلیک اسکارف اوڑھے ہاتھوں میں آفس فائل پکڑے وہ اور کوئی نہیں وہ نور ہی تھی۔ وہ نور فاطمہ جو اس کی محبت تھی اس کے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتی تھی اور دل و دماغ پر خوب صورت احساسات کی طرح مسلط تھی..... نور نے بھی اسے دیکھ لیا تھا، کئی کترا کر گزرنے ہی والی تھی جب زین نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا تھا۔ ”آؤ..... میں تمہیں ڈراپ کر دوں بلکہ آج تو گھر چلو آئی بھی تمہارے لیے بہت اداس ہیں۔“ زین نے اسے پینچش کی۔

”نو ٹھیکس..... میں خود چلی جاؤں گی۔“ اس نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھائے۔

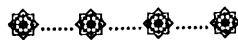
”چلو گھر نہ سہی..... میں تمہیں تمہارے ہاسٹل ہی چھوڑ دوں گا۔ تم آؤ تو سہی۔“ زین نے اس کے انکار کی پروانہ کرتے ہوئے فرنٹ ڈور اس کے لیے کھول دیا تھا۔ آس پاس کے لوگ اس منظر کو دیکھنے لگے تھے تب ہی اس نے مزید انکار نہ کیا اور کار میں بیٹھ گئی اسے اپنا تماشا یوں سراہا ہونا گوارا نہ تھا۔

زین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا، ایک گہری خاموشی اس کے چہرے پر عیاں تھی اور سکوت سا آنکھوں میں چھایا ہوا تھا..... نور نے بھی نادانستہ اس کی طرف نگاہ کی..... اس کی آنکھیں اس کے دل کی کہانی سناتی ہوئی محسوس ہوئیں، اس نے ہمیشہ سے ان آنکھوں کی کہانی کو

کے باقی مکینوں نے کبھی بھی سیکھ نہ سکی کہ نوکرانی کا درجہ نہیں دیا تھا، بواولی کے نام سے پکاری جانے والی وہ سیکھ نہ لی بی ”حیات ولا“ کا ایک اہم فرد ہی سمجھتی جاتی تھیں۔

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی چاروں بچے آپس میں کھیلنے کودتے شرارتیں کرتے تھے شاہ نواز سب سے بڑا تھا غصہ کا تھوڑا تیز تھا حیات شاہ کی وفات کے بعد حویلی کا ماحول تھوڑا بدل گیا تھا عمران باقوں ہی باقوں میں بواولین کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتی کہ وہ اس حویلی میں صرف ایک نوکرانی ہے اور یہ باور کرانی کہ وہ نور فاطمہ کو حویلی کے باقی بچوں سے دور رکھے۔ سیکھ کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا اٹھکا نہیں تھا دل پر پتھر رکھ کر وہ عمرانہ کے رویوں کو برداشت کرتی رہتی ساتھ ساتھ نور فاطمہ کو بھی بتا دیا کہ وہ کون ہے اور اسے آگے کیا کرنا ہے..... عاصمہ اور شہریار عمرانہ کو بار بار ٹوکتے مگر وہ باز نہ آئیں جب جھگڑے بڑھنے لگے تو دونوں نے شہر میں رہائش اختیار کر لی بچے جوان ہو گئے تھے۔ شاہ نواز نور فاطمہ کو پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتا، افروز تو اس کی چکی دوست تھی اور زین اس کے لیے ہمدردی محسوس کرتا..... میٹرک تک گاؤں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد نور اور افروز نے شہر آ کر کانچ میں داخلہ لے لیا تھا۔

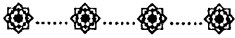
دونوں ایف ایس سی میں تھیں لائق اور ہونہار طالبات تھیں، افروز ڈاکٹر بننا چاہتی تھی مگر نور الگ ہی دنیا میں رہتی تھی اس کے بہت سے خواب تھے مگر یہ بھی جانتی تھی کہ اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے اپنی ماں کے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں بننا اور خود مختار ہو کر اپنے خوابوں کو پورا کرنا ہے..... شاہ نواز انجینئر بن رہا تھا اور زین ابھی میٹرک میں تھا..... دل و دماغ میں طرح طرح کے خواب سجائے وہ سب زندگی کے دھارے میں بہتے چلے گئے مگر نور فاطمہ کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔



دسمبر کی یہ شام بھی دوسری شاموں کی طرح بہت ہی

فیملی نے ہم پر کیے ہیں۔“ وہ بھی اپنی ضد پر قائم رہی اور دو بدو جواب دیا۔

”مجھے امید ہے اور یقین بھی کہ وہ سود تنہاری محبت کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ مسکراتے ہوئے قدرے پرسکون لہجے میں زین نے کہا، جواب میں نور نے صرف اسے گھورنے پر اکتفا کیا۔ زین کے چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں محبت کی شمعیں روشن تھیں مگر مقابل کی پیشانی پر ہزاروں سلوٹیں اور چہرے پر غصے کا راج تھا۔



”فری..... فری..... کہاں ہو تم؟ میری وائٹ شرٹ نہیں مل رہی پلیز ڈھونڈ دو، مجھے ایک اہم میٹنگ میں جانا ہے۔“ شاہ نواز نے افروز کو آواز دی۔

”یہ رہی آپ کی شرٹ..... سامنے ہی تو پرپس کر کے رکھی ہے اور آپ پتا نہیں کہاں کہاں اسے ڈھونڈ رہے ہیں..... ویسے رات کے اس وقت کس کے ساتھ میٹنگ ہے آپ کی؟“ افروز نے اسے شرٹ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”ایک اہم کلائنٹ کے ساتھ کچھ آفس ورک کے سلسلے میں ملاقات ہے تمہارا بھائی آج کل نظر نہیں آ رہا بڑا مصروف رہنے لگا ہے اور ہاں..... میں نے تم سے کہا تھا کہ اس سے پوچھو کہ اس کی خاموشی کی آخروج کیا ہے کچھ بتایا اس نے؟“ شاہ نواز اپنی شادی شدہ زندگی سے مطمئن تھا مگر اپنی مصروفیات کے باعث گھر کو بہت کم وقت دے پاتا، افروز سے آج اچانک اس نے کچھلی بات کا ذکر کیا۔

”ہاں بتایا ہے اس نے مجھے اصل میں شاہ نواز..... زین، نور، فاطمہ کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور نور اپنی ضد اور انامیں بار بار اس کو ٹھکرا رہی ہے تب ہی وہ بہت پریشان ہے ابھی اس نے بواجی امی اور بابا سے بات نہیں کی اس سلسلے میں کیونکہ ابھی وہ صرف نور کو اپنی محبت کا احساس دلانا چاہتا ہے میں خود بہت پریشان ہوں بھائی کی پریشانی دیکھ کر مگر نور..... نور کو تو احساس ہی

نظر انداز کیا تھا“ نجائے آج کیا تھا کہ وہ کتنی دیر تک ان آنکھوں کو پرہتی رہی، دونوں ایک دوسرے کی طرف کافی دیر تک دیکھتے رہے۔ آخر نور نے رخ موڑ اور کچھ نہ بولی۔ اس کے اس انداز کو زین نے محسوس کر لیا تھا۔

”نور..... نفرت تو تم مجھ سے کرتی ہو مگر آپ کی اس سارے قصے میں کیا قصور ہے، وہ تو تمہاری دوست ہیں مگر تم ان سے بھی ملنا ترک کر چکی ہو آخر مسئلہ کیا ہے؟“ درود بھرے لہجے میں اس نے سوال کیا۔

”بس کام کی زیادتی کی وجہ سے ملاقات نہیں ہو پاتی اور تو کوئی بات نہیں ہے۔“ سر کو جھکاتے ہوئے اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”اور مجھ سے نفرت کا کیا جواز ہے تمہارے پاس؟“ زین نے پوچھا۔

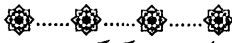
”کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس کہ مجھے تم سے نفرت ہے؟ آخر تم لوگ کیوں میری زندگی اجیرن کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو خدا امیر اچھا کرنا چھوڑ دو اور ہاں تمہارے خاندان کے مجھ پر اور میری ماں پر بہت سے احسانات ہیں، ایک آخری حسان یہ بھی کر دو کہ مجھ سے تعلق ختم کر دو۔ زندگی نے موقع دیا تو تمہارے یہ احسانات ضرور چکا دوں گی۔“ نور نے غصہ سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

”محبت کرتا ہوں تم سے..... بہت محبت اور تمہیں بانے کے لیے میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں بہت کچھ کر سکتا ہوں..... مجھے صرف تمہارے دل میں چھپی اس نفرت کی وجہ جانا ہے اور جب تک تم نہیں ہٹاؤ گی میں تمہارا اچھا کرنا رہوں گا..... تم نفرت کی تمام حدود پار کر لو میں بدلے میں محبت کی آخری حد تک جاسکتا ہوں۔“ اس کے غصے کے جواب میں زین شہر یار کا لہجہ بہت دھیمہ اور پرسکون تھا۔

”ٹھیک ہے..... تم اپنی ضد پر اڑے رہو مگر میرے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے سوائے ان احسانات اور مہربانیوں کو سو دسمیت لوٹانے کے جو تمہاری



نہیں۔“ قدرے دکھی لہجے میں افروز نے سارا معاملہ شاہ نواز کے سامنے رکھ دیا۔ شاہ نواز چونکا اور پھر غصے سے بولا۔



”بچپن تو کھیلنے کودتے اور کچھ کچھ شاہ نواز سے ڈرتے ہوئے گزر رہی تھی مگر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی نور فاطمہ کے دل میں شاہ نواز کو جانے کا عجیب و غریب جنون سا سما گیا تھا، شاہ نواز بھی ان تینوں کے ساتھ شہر والی کوٹھی میں رہائش پذیر تھا مزاج کا تو شروع سے ہی تیز تھا مگر جب سے انجینئرنگ کی مشکل پڑھائی کا آغاز کیا تھا سنجیدگی مزاج کا حصہ بن گئی تھی، افروز ان دنوں میڈیکل کے دوسرے سال میں تھی اور نور بی ایے کر رہی تھی لکھنے لکھانے کا کبھی جنون تھا، لکچرار بننا چاہتی تھی زین کا آئی سی ایس کا رزلٹ بہت اچھا آیا تھا، حویلی کے سب ہی لوگ بہت خوش تھے، شاندار سی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا، نور بھی بواجی کے ساتھ کچن کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی تھکاوٹ کچھ زیادہ ہوئی تو سب کام چھوڑ کر سب کے ساتھ درمیانی کمرے میں آ بیٹھی، تب ہی شاہ نواز نے پہلی بار خوش اخلاقی سے نور سے پوچھا۔

”نور..... تمہارا بی ایے کے بعد کیا ارادہ ہے؟“ نور کو شاہ نواز سے ایسے سوال کی توقع نہیں تھی کہاں وہ اس سے بات کرنا تو درکنار اس کی طرف نگاہ الٹنا بھی اپنی توہین سمجھتا تھا اور کہاں وہ اس سے سب کے سامنے یوں بات کر رہا تھا کہ وہ تھوڑا سا بھرائی مگر برا اعتماد لہجے میں بولی۔

”نور ارادہ آگئے ایم اے انگلش کرنے کا ہے اس کے بعد لیچرار بننا ہے مجھے۔“

”دیش گریٹ..... یہ تو بہت اچھی بات ہے مگر اس کے لیے بہت محنت درکار ہے اگر اسی طرح محنت کرنی رہی تو کبھی لوگ۔“ شاہ نواز آج اسے حیران کر رہا تھا۔

”بھائی..... آپ کو کیا پتا یہ کتنی لائق اور محنتی اسٹوڈنٹ ہے؟ اپنے کام میں مگن سب کچھ کر جاتی ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔“ زین نے نور فاطمہ کی تعریف کی تھی۔

”اور تم جو آگئے برنس فیلڈ میں آ رہے ہو تمہیں بھی

”کیا..... نور.....؟ تمہارا بھائی زین اس کی کمین سکیئر بی بی کی بیٹی نور فاطمہ کے عشق میں مجنوں بنا ہوا ہے؟ حیرت ہے اور تم بھی اس حق میں ہو کہ نور تمہاری بھابی بنے؟“

”شاہ نواز.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں نور میری بچپن کی دوست ہے اور ہم ایک ساتھ ہی بڑے ہوئے ہیں۔ ماشاء اللہ پڑھی لکھی اور باکردار لڑکی ہے اور خوب صورتی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہیں اور زین کو پسند بھی ہے۔“ افروز نے حیرانگی کا اظہار کیا۔

”پھر بھی افروز..... تم کیسے اپنے اکلوتے بھائی کی نسل میں ایسا خون شامل کرنا چاہتی ہو جس کے بارے میں کچھ علم نہیں کہ وہ کس کا ہے؟ کچھ ہوش کرو اور اپنے بھائی کو بھی سمجھاؤ ایک سے ایک خوب صورت اور ایجوکیٹڈ لڑکی اس کے سرکل میں ہے انہی میں سے کسی ایک کو لائف پارٹنر بنا سکتا ہے وہ..... ہنسہ پاگل۔“ شاہ نواز نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ افروز کو بہت برا لگا، وہ نور کے بارے میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتی تھی تب ہی بولی۔

”شاہ نواز..... ایسا تو مت کہیں..... کبھی کبھی آپ کی باتیں مجھے بہت تکلیف دیتی ہیں۔“

”حقیقت کڑوی اور تکلیف دہ ہی ہوتی ہے مگر سچائی کو مانتا ہی پڑتا ہے اور اسی میں ہم سب کی بھلائی اور خاندان کی عزت ہے کہ تمہارا بھائی اس سے دور ہی رہے چاہے تم اس کی حمایت کرو..... میں زین کو فوراٰں سمجھاؤں گا۔“

شاہ نواز نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر لیا اور وہاں سے چلا گیا۔ افروز جو زین اور نور کے لیے پریشان تھی شاہ نواز کے دو ٹوک انداز نے اسے مزید پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔

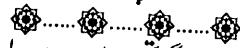
”آخر شاہ نواز کو کیوں نور فاطمہ سے چڑ ہے..... کوئی

نت محنت کرنا ہوگی۔“ شاہ نواز نے نور کے ذکر پر سے  
جہ ہٹا کر زین کو تنبیہ کی تھی۔  
”بس بھائی..... مجھے لگتا ہے کہ آپ اور نور جیسی دو  
بڑھا کو لڑکیوں کے ساتھ رہتے ہوئے میرا بھی بیڑا پار  
نہوئی جائے گا..... کیوں نور اور آپ؟“ زین نے ہنستے  
ہوئے کہا تھا۔

”ہاں ہاں..... کیوں نہیں..... میں ہوں ناں اپنے  
بھائی کو بار بار پڑھنے کی وارننگ دیتی رہوں گی اور نور بھی  
میری مدد کرے گی۔ کیوں نور؟“ افروز نے پیار بھرے  
انداز میں بھائی کی بات کا جواب دیتے ہوئے نور کو متوجہ  
کیا تھا جو ابھی تک شاہ نواز کی باتوں میں کھوئی ہوئی تھی  
اور مسلسل اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔  
”نور..... نور..... کیا ہوا..... تم ٹھیک تو ہو؟“ زین  
نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

”آں ہاں..... میں ٹھیک ہوں..... میں چائے لے  
کر آتی ہوں۔“ شاہ نواز اور افروز کی خود پر جی نظروں سے  
گہرا کر اس نے تیزی سے جواب دیا اور وہاں سے اٹھ  
گئی تھی۔  
”اسے کیا ہوا؟ ہر وقت کہیں نہ کہیں کھوئی رہتی ہے  
محترمہ۔“ افروز نے کہا تھا۔

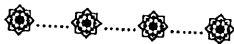
زین اسے یوں اچانک اٹھتا دیکھ کر سوچ میں پڑ گیا  
تھا اور شاہ نواز اپنے سیل فون میں مصروف ہو گیا تھا کسی  
نے بھی افروز کے بڑبڑانے پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔



رات کافی گہری ہو گئی تھی ہر طرف ہو کا عالم تھا ایک  
گہرا سناٹا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ کمرے میں دو بیڈ تھے  
ایک بیڈ پر افروز گہری نیند سو رہی تھی جبکہ دوسرے پر نور  
ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ گود میں کتاب کھلی  
رکھی تھی مگر سوچیں کہیں اور ہی اڑان بھر رہی تھیں۔ شاہ نواز  
پہلے بھی اس کی سوچوں پر حاوی تھا مگر جب سے اس نے  
نور سے اس کی پڑھائی سے متعلق سوال کیا تھا اس وقت  
سے نور ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو گئی تھی۔ آج

سارا دن کالج میں بھی بے چین رہی سوچیں بار بار بھٹک  
کر شاہ نواز کی طرف جا رہی تھیں۔ اس کا بولنا لب و لہجہ  
چال ڈھال اس کی مردانہ وجاہت کچھ بھی تو نظر انداز  
کرنے کے قابل نہیں تھا..... اسے شاہ نواز اچھا لگنے لگا  
تھا وہ جس انداز سے اسے سوچ رہی تھی اسے محسوس ہوتا  
تھا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔ کبھی کبھی دماغ اس  
بات کی نفی کرتا مگر دل پھر اس کا نام آتے ہی عجیب لے پر  
دھڑکنے لگتا۔ کافی سوچا سمجھا خود کو پرکھا آخر کار اس  
کیفیت کو محبت کا نام دے دیا۔ افروز نے بہت بار اس  
سے یوں کھوئے کھوئے رہنے کی بابت پوچھا مگر ہر بار وہ  
ٹال دیتی۔ وہ کسی پر بھی یہ راز ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی مگر  
اندر ہی اندر وہ شاہ نواز کی محبت میں اس قدر ڈوب گئی تھی  
کہ صرف اسے سوچتی دیکھتی اسے کھتی رہتی..... اس کے  
بارے میں باتیں سننا اسے اچھا لگتا تھا، اس کی باتیں  
اسے عجیب خوشی سے دوچار کر دیتی سارا سارا دن انتظار  
کرتی، رات کے کھانے پر جب یہ کزنز اکٹھے ہوتے تو  
چائے کے بہانے شاہ نواز کے سامنے جاتی اس سے  
سامنا ہوتا تو دل کی کلی کھل اٹھتی، سرمستی کا عجیب ہی عالم  
ہوتا تھا، جب سے محبت نے اس کے دل میں بسیرا کیا تھا  
ہر شے پوری کائنات کی خوب صورتی اس کے دل میں سا  
گئی تھی..... ہنستی کھلکھلائی۔

دل ہی دل میں اس سے ڈھیروں باتیں کرتی جب  
محبت اپنی حد تک آن پہنچی تو دل نے اسے مجبور کیا کہ وہ یہ  
سب شاہ نواز کو بتا دے..... مشکل مرحلہ تھا مگر ناممکن نہیں  
تھا اسے ہر حال میں شاہ نواز پر دل کا حال کھولنا تھا ورنہ  
یوں لگتا تھا کہ وہ پاگل ہو جائے گی اس بات سے بے خبر  
تھی کہ کوئی اسے بھی اسی طرح چاہنے لگا ہے کسی کی محبت  
میں بھی اتنی ہی شدت ہے جتنی کہ اس کی محبت میں شاہ  
نواز کے لیے۔



سنو.....!

کسی نے سچ کہا تھا یہ

محبت مرنہیں سکتی

مگر.....!

ادھورا سچ سنا ہم نے

مکمل سچ تو یہ ہے کہ

محبت خود نہیں مرنی

محبت ماریتی ہے.....!

ساحل سمندر پر شام کا خوب صورت منظر تھا لہروں سے لطف اندوز ہونے والے لوگ اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے مگر وہ ساحل کی ریت پر پٹنگے پاؤں بیٹھا بار بار گیلی ریت پر نور کا نام لکھ رہا تھا پتا نہیں کیوں اس لڑکی کی نفرت کے باوجود اس کی محبت زین کے دل میں بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سمندر کی تیز لہریں بار بار اس کے پاؤں سے ٹکراتی اور ریت پر لکھے نور کے نام کو مٹا دیتیں اور وہ بار بار نام لکھتا رہا۔

”تمہیں پتا ہے میں نور سے بہت محبت کرتا ہوں..... اسے بہت چاہتا ہوں مگر وہ پتا نہیں کیوں مجھ سے نفرت کرتی ہے، نہیں جانتا کہ اس کے دل میں اتنی نفرت کہاں سے آسما کی ہے..... خدا را اسے سمجھاؤ..... کوئی تو میرا دکھ سمجھ اور ہاں تم جو بار بار اس کا نام ریت پر سے مٹا دیتی ہو ضرور مٹاؤ مگر یاد رکھو میرے دل سے اس کا نام کوئی بھی نہیں مٹا سکے گا میں اپنی محبت سے اسے جیت لوں گا۔“ جب سے اس نے افروز آپی سے سنا تھا کہ شاہ نواز بھی نور کے اس سے تعلق پر خفا ہیں وہ بالکل ٹوٹ گیا تھا، کئی دن کھویا کھویا سارہنے کے بعد آج اپنی پسندیدہ جگہ پر دل کا درد ان لہروں کو بتانے آ بیٹھا..... آنکھوں کے گوشے نم تھے ارد گرد کا کوئی ہوش نہیں تھا، گیلی ریت پر اس دشمن جاں کا نام لکھتے بہت وقت گزر گیا تھا مگر اسے کوئی پروا نہیں تھی یہ درد اس کا اپنا تھا اسے خود سہنا تھا اور وہ سہہ رہا تھا۔ وہ زین شہر یار جو شہر کا مشہور مارکیٹنگ منیجر تھا آج اس لڑکی کی محبت میں خود کو رول رہا تھا مگر اس سنگدل کو صرف اپنی اناعزیز تھی زین کے آنسوؤں کی کوئی پروا نہیں تھی۔



افروز کے بار بار اصرار کرنے اور نور کو کالز کر کے اسے گھر آنے پر اصرار کرنے پر نور چھٹی کے دن ماریہ کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ گھر پر صرف افروز دکھائی دی۔ شاہ نواز اور زین موجود نہیں تھے وہ راستے میں دعا کرتی آئی تھی کہ شاہ نواز سے اس کا سامنا نہ ہو..... اس گھر سے اسے بہت انسیت تھی، اس نے اپنی زندگی کے بہترین لمحات اور شب و روز یہاں گزارے تھے۔

”سچ مانو نور..... مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے تم دونوں کو یہاں دیکھ کر..... دیکھو اگر کوئی ناراضی ہے تو بتاؤ، کوئی شکایت ہے تو کرو مگر یوں تمہارا دور دور رہنا مجھے بہت تکلیف دیتا ہے، پہلے گھر سے دور ہوئی اور اب نظروں سے بھی.....“ شکوہ کنناں لہجے میں افروز نے نور سے کہا۔ ”میں نے تو بہت بار اسے کہا افروز مگر مصروفیت اتنی رہی کہ یہ وقت ہی نہ نکال پائی۔“ جواب میں ماریہ نے پر خلوص انداز میں کہا۔

”آج وقت ملا ہے تو آئی تو ہوں ملنے۔“ نور نے بھی سادہ سے انداز میں جواب دیا۔

”مجھے خوشی تو اس بات کی ہو رہی ہے کہ تم ماریہ کو بھی ساتھ لائی ہو۔“ مسکراتے ہوئے اس نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ افروز چائے بھی پیار ہی تھی دوسرے لوازمات بھی ان کے سامنے رکھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہی تھیں۔

”نور..... ایک بات تو بتاؤ گی؟“ افروز نے پوچھا۔

”ہاں..... پوچھو۔“ نور نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

”یہ زین والا کیا قصہ ہے؟ محبت کرتا ہے وہ تم سے اور تم ہو کہ اپنی خدا اور انا پر اڑی ہو..... وہ بہت دھڑکی رہنے لگا ہے اور پلینز اس پر کچھ رحم کر دو۔“ افروز نے بھائی کی حالت اسے بتاتے ہوئے نرم لہجے میں نور سے کہا۔ نور نے کوئی جواب نہیں دیا آرام سے چائے پینے میں مصروف رہی شاید وہ اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”میں بھی اسے بہت سمجھاتی ہوں، زین میں کس چیز کی کمی ہے، کیا خرابی ہے؟ اس کی محبت میں کوئی کھوٹ نہیں مگر یہ محترمہ تو بات سننا ہی نہیں چاہتی۔“ ماریہ نے بھی سخت لہجے میں افروز کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا مگر نور چپ ہی رہی۔

”افروز..... افروز..... تم یہاں ہو اور میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈ رہا ہوں.....“ شاہ نواز نے ان دونوں کی موجودگی میں ڈرانگ روم میں قدم رکھا مگر جب اس نے نور کو صوفے پر بڑے آرام سے چائے پیتے دیکھا تو اگلا لفظ اس کے حلق میں ہی اٹک گیا۔ غصے کی ایک تیز لہر اس کے تن بدن کو چھو گئی، افروز نے مڑ کر اسے دیکھا ابھی وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شاہ نواز نے غصے سے کہا۔

”اگر تمہیں اپنے مہمانوں سے فرصت مل جائے تو کمرے میں آ کر میری بات سن لو۔“ غصے سے وہ نور کو دیکھتا چلا گیا نور نے بھی غصے سے اسے دیکھا اور چائے پینے لگی جبکہ ماریہ حیرت سے گنگ تھی اور افروز مارے شرمندگی کے ان دونوں سے کچھ کہہ بھی نہ سکی۔

”میں ابھی آتی ہوں۔“ افروز دونوں کا سامنا نہیں کر پائی تب ہی وہاں سے اٹھ گئی۔

”یہ افروز کے ہسینڈ شاہ نواز ہیں ناں؟ غصے کے تھوڑے تیز لگتے ہیں۔“ ماریہ نے نور سے کہا۔

”اپنے حسب نسب اور دولت پر غرور ہے محترم کو اور کچھ نہیں۔“ نور نے اندر کا غصہ نکالا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

”آئی تھنک ہمیں چلنا چاہیے۔“ ماریہ کو شاہ نواز کا رویہ اچھا نہیں لگا تھا تب ہی اس نے نور سے واپسی چلنے پر اصرار کیا۔

”کیوں..... کیوں چلنا چاہیے؟ اتنے عرصے بعد محترمہ نور ہمارے گھر تشریف لائی ہیں ہمارے اس چھوٹے سے گھر کو رونق بخشی ہے آپ نے۔“ ماریہ کی بات تیزی سے اندر آتے ہوئے زین نے پکڑی اور اسے

دیکھتے ہی نور یک دم کھڑی ہو گئی۔

”ماریہ چلو کافی دیر ہو گئی ہے ہمیں۔“ زین کو نظر انداز کرتے ہوئے نور نے ماریہ کا ہاتھ پکڑا..... ماریہ اپنی جگہ تن کر کھڑی رہی۔

”نور..... کبھی تو مجھ غریب سے بات کر لیا کرو..... ہر وقت غصہ، ہر وقت ناراضی..... آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے؟“ زین نے افروز کی اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں پار..... آخر لڑائی کیا ہے تم دونوں میں؟ میں تو یہیں ہوں تمہیں جانا ہے تو چلی جاؤ۔“ ماریہ نے زین کا ساتھ دیا۔ جواب میں نور دونوں کو گھور کر رہ گئی زین کی آنکھوں میں جھانکا تو سوائے محبت اور التجا کے کچھ نظر نہ آیا..... کبھی کبھی وہ ان مسکراتی محبت بھری نگاہوں کا سامنا نہیں کر پاتی تھی اور سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی کہ خرزین کا کیا قصور ہے؟ مگر اسے اپنی انا بہت عزیز تھی۔

”تمہیں اندازہ بھی ہے کہ ہم بہت وقت سے یہاں آئے ہوئی ہیں گھر چلو۔“ سارا غصہ ماریہ پر نکالتے ہوئے اس نے کہا اور زین کو ایک بار پھر گھورا۔

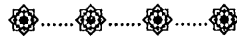
”بیٹھو آرام سے..... سوچنا تم ہونے والا ہے اور کھانا کھائے بغیر تو تم دونوں یہاں سے ابل بھی نہیں سکتیں کیونکہ آپ اندر کھانے کا ہی انتظام کر رہی ہیں۔“ عجیب دھونس بھرا انداز تھا زین کا کہ نور کو بھی بیٹھنا پڑا۔ افروز نے دونوں سے شاہ نواز کے رویے کی معذرت کی، کھانے کی میز پر افروز زین اور وہ دونوں تھیں، شاہ نواز نہیں آیا تھا نور برائے نام ہی نکھار رہی تھی، شاہ نواز کے رویے پر اسے کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی بلکہ اندر ہی اندر غصہ آیا تھا کہ پھر اس شخص سے اس کا سامنا کیوں ہوا؟ افروز سے ماریہ نے فرمائش کی تھی کہ وہ اسے گھر دکھائے..... میز پر نور اور زین تیار رہ گئے تھے..... زین آداب میزبانی بھی نبھار رہا تھا اور ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی کئی باتیں بھی اسے سنارہا تھا نور بظاہر توسن رہی تھی مگر توجہ کہیں اور تھی۔

”نور..... پلیز بتاؤ مجھے آخر کیا وجہ ہے مجھے بار بار

ٹھکرانے کی؟“ زین نے ایک بار پھر وہی سوال کیا۔  
 ”دیکھو..... زین..... تمہارا اور میرا اسٹیٹس میچ نہیں  
 کرتا“ تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟ صرف اتنا کہ  
 میں تمہاری جو بی بی کی ایک عام سی نوکرانی کی بیٹی ہوں۔“  
 نور نے انتہائی بخجندگی سے جواب دیا۔

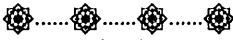
”اف..... بس اس فضول سی سوچ نے تمہارا دماغ  
 خراب کر رکھا ہے، اگر تم صرف بوا جی کی بیٹی ہوتی تو بابا اور  
 امی تمہیں اتنا پیار نہ دیتے بے شک شاہ نواز بھائی اور عمرانہ  
 آسنی کی نفرت ہی تمہیں سہنا پڑی مگر باقی لوگوں کی محبت  
 اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے مجھے حیرت ہے کہ تم  
 ایسا سوچتی ہو..... خدا را یہ سوچ اپنے دل و دماغ سے نکال  
 دو، میرے نزدیک تم بہت محترم ہو، میں نہیں جانتا تھا کہ  
 تمہارے ہم سے اس گھر سے دور ہونے کی وجہ صرف  
 تمہاری یہ فضول سوچ ہوگی؟“ زین نے افسوس سے کہا۔  
 ”سچ آخروج ہی ہوتا ہے زین..... میں ساری زندگی  
 تمہارے خاندان کی محبتوں کا قرض نہیں ادا کر سکتی اور نہ  
 ہی تم لوگوں کے خاندان کا حصہ بن کر ساری عمر ایک ایسی  
 زندگی گزار سکتی ہوں جس میں لوگوں کا ترس شامل ہو۔“  
 نور نے آرام سے جواب دیا۔

”ترس اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے..... نور میں  
 تم سے محبت کرتا ہوں۔ کاش یہ بات تم سمجھ جاؤ۔“ ملاحتی  
 انداز میں زین نے اس پر واضح کیا۔  
 ”میں تو سمجھتی ہوں..... تم نہیں سمجھتے۔“ یہ کہہ کر وہ  
 کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے وہاں سے نکل گئی  
 تھی۔



نور فاطمہ کو شاہ نواز سے ایسے ہی رویے کی توقع تھی  
 اس وقت تو اسے شاہ نواز پر بہت غصہ آیا تھا اور زین کی  
 باتوں کو بھی اس نے درخود اعتنا نہ جانا تھا مگر ماریہ کو یہ سب  
 بہت عجیب لگا تھا اس نے نور فاطمہ سے اس کی وجہ  
 پوچھنے کی کوشش کئی بار کی شاہ نواز کے بارے میں بات کی  
 مگر ہر بار نور فاطمہ یہی جواب دیتی کہ وہ افروز کی مہمان

تھیں نہ کہ شاہ نواز کی اور یہ کہ اسے اس کے برے رویے  
 سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر نہیں..... شاہ نواز نے اس کے  
 پرانے زخم کو ایک بار پھر سے ادھیڑ دیا تھا۔ اس کے تحقیر  
 آمیز لہجے نے ایک بار پھر سے نور کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا  
 تھا۔ ماضی اپنے بد صورت اور کریمہ چہرے کے ساتھ  
 ایک بار پھر اس کے سامنے تھا اور اس خاندان سے اس کی  
 نفرت اور بھی بڑھ گئی تھی۔



شاہ نواز کی محبت نے نور کو اور بھی خوب صورت بنا دیا  
 تھا۔ اس نے بی اے کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا  
 تھا ایم اے انگلش میں داخلہ بھی لے لیا تھا مگر کلاسز شروع  
 ہونے میں ابھی کچھ وقت تھا..... زین اور افروز سے ملنے  
 ان کے ماں باپ شہر آئے تھے ان کا شاہنگ کا ارادہ بنانا تو  
 نور کو ساتھ چلنے کا کہا مگر اس نے انکار کر دیا تھا۔ دوپہر کے  
 وقت وہ اور خان بابا گھر میں اکیلے تھے اپنے کمرے میں  
 بیٹھی وہ شاہ نواز کو ہی سوچ رہی تھی کہ اسے اس کی آواز  
 سنائی دی۔

”خان بابا مجھے چائے تو بنا دیں..... میں اپنے  
 کمرے میں ہوں۔“ شاہ نواز نے تھکاوٹ سے چور لہجے  
 میں کہا تھا۔ نور نے سنا اور خان بابا کو چائے بنانے سے منع  
 کر کے خود اس کے لیے چائے بنانے لگی ہونٹ خود بخود  
 مسکرانے لگے تھے بہت محبت سے چائے بنائی تھی ٹرے  
 میں دوسرے لوازمات رکھے اور وہ شاہ نواز کے کمرے کی  
 طرف بڑھ گئی تھی ڈر بھی رہی تھی کہ کہیں وہ غصہ نہ کرے  
 دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

”لیس..... آ جائیں خان بابا۔“ شاہ نواز نے اجازت  
 دی تھی۔ دروازہ کھول کر نور اندر آ گئی تھی..... میز پر پڑے  
 رکھی اور چائے کا کپ اٹھا کر شاہ نواز کے سامنے آ کر  
 اسے پکڑا چاہا تھا شاہ نواز نے حیرت سے اسے دیکھا اور  
 کپ لے کر دوبارہ میز پر رکھ دیا تھا۔  
 ”تم..... تم میرے کمرے میں کیسے؟ اور چائے کے  
 لیے تو میں نے خان بابا کو کہا تھا۔“ شاہ نواز نے غصے سے



”تھینک یو..... بواجی..... آپ یقیناً اسے منالیں گی۔“ زین نے کہا۔

”ویسے شاہ نواز بیٹے کو کیا اعتراض ہے؟ نور ہماری اپنی بیٹی ہے، تعلیم یافتہ اور باکردار ہے، ہم نے کبھی بھی اسے پرایا نہیں سمجھا؟“ شہریار صاحب نے شاہ نواز کے اعتراض پر نکتہ اٹھایا۔

”پتا نہیں بابا..... میں خود جاننے سے قاصر ہوں..... بس آپ کی کو یہ بتاتے سنا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نور فاطمہ ہمارے خاندان کی لڑکی نہیں ہے اور بس۔“ زین نے بواجی کی موجودگی میں شاہ نواز کے نور کے لیے استعمال کیے گئے سخت الفاظ کہنے سے پرہیز کرتے ہوئے صرف یہی بتایا۔

”یہ کوئی بڑی وجہ نہیں ہے جس کی بنا پر انکار کیا جائے ویسے بھی ہمیں اپنی بیٹی کی خوشی سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیے۔“ عاصمہ بیگم بہت خوش تھیں۔

”ماما..... اصل مسئلہ صرف نور کا ہے وہ جب تک خود نہیں مانے گی، میں کیسے اتنا بڑا قدم اٹھا سکتا ہوں۔ جب تک وہ اپنی مرضی اور خوشی سے میری زندگی میں شامل نہیں ہوگی اس وقت تک میں اسے منانا رہوں گا۔ بس آپ دعا کریں وہ مان جائے۔“ زین نے سنجیدگی سے کہا۔

”وہ یان جائے گی تم پریشان مت ہو۔“ شہریار حیات نے تسلی دی۔

سیکینہ بی بی نے نور فاطمہ کو حویلی بلایا تھا، وہ چاہتی تھیں کہ نور فاطمہ کو سمجھائیں اور اس سے زین سے شادی سے انکار کی وجہ پوچھیں، بہانہ یہ کیا تھا کہ وہ بیمار ہیں..... نور نے جیسے ہی سنا اسکول کی تمام مصروفیات چھوڑ چھاڑ کر گاؤں پہنچ گئی تھی..... ماں کو صحت مند دیکھ کر اسے تسلی ہوئی تھی شہریار صاحب اور عاصمہ بیگم نے زین کے رشتے کے سلسلے میں اس سے بات کی..... جواب میں اس نے خاموشی اختیار کی جب ان کا اصرار بڑھتا گیا اور انہوں نے اس کا جواب جاننا چاہا تو نور نے انکار کرنے

شہریار حیات اور عاصمہ بیگم اپنی جگہ حیران پریشان سے بیٹھے تھے، زین نے عاصمہ کی گود میں سر رکھا ہوا تھا اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا تھا۔ سیکینہ بی بی بھی سامنے کھڑی اس کی یہ حالت دیکھ کر حیران تھیں، زین نے ساری بات ماں باپ کو بتادی تھی اور ساتھ ہی سیکینہ سے بھی نور فاطمہ کے اسے رد کرنے کی وجہ دریافت کرنے کو کہا تھا۔

”ماما..... پلیز آپ نور کو سمجھائیں اس سے پوچھیں کہ آخر کیا وجہ ہے جس کی بنا پر وہ مجھے بار بار رد کر رہی ہے؟“ ان کی گود میں سر رکھے وہ بچوں کی طرح خند کرتے ہوئے التجا کر رہا تھا۔

”ڈونٹ وری..... مائی چائلڈ..... میں اور تمہارے بابا اسے سمجھانے کی پوری کوشش کریں گے مجھے حیرت تو یہ ہو رہی ہے کہ تم یہ سب ہمیں اب بتا رہے ہو۔“ انہوں نے اس کے سر کا بوسہ لیا اور پھر حیرانگی سے اس سے دریافت کیا۔

”اور بیگم..... دیکھیے ذرا کہ افروز اور شاہ نواز نے بھی اس سارے معاملے کا ہم سے ذکر نہیں کیا۔“ شہریار حیات نے بیگم کو متوجہ کیا۔

”بابا..... آپ کی آپ سے ذکر کرنے ہی والی تھیں مگر شاہ نواز بھائی شاید اس رشتے سے خوش نہیں ہیں تب ہی شاید انہوں نے آپ کی کو بھی منع کر دیا ہے۔“ زین نے کہا۔

”زین بیٹا، تم اور بیٹھو یقین جانو مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ جس طرح زیلنا، بہن اور شہریار بھائی نے مجھے اس گھر کا فرد سمجھا اور مجھے سالوں تک اپنوں کی دوری کا احساس تک نہ ہونے دیا اور میری پتی کو اپنی بیٹیوں کی طرح چاہا اسی طرح تم بھی مجھے اور اسے اپنا سمجھتے ہو۔ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ یہ تو میری دعاؤں کا ثمر ہے اور نور..... وہ تھوڑی ضدی ہے مگر جب اسے تمہاری محبت کا یقین آئے گا تو وہ ضرور مان جائے گی، میں خود اسے سمجھاؤں گی۔“ بواجی نے زین کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوشی سے کہا۔



لفظ لفظ نگارے سطر سطر سے بھر پور تحریریں  
ایسی کہانیاں اس سے قبل آپ نے نہیں دیکھی ہوں گی

مغربی ادب سے انتخاب  
جرم و سزا کے موضوع پر بہ ماہر منتخب ناول  
مختلف ممالک میں پلنے والی آزادی کی تحریکوں کے پس منظر میں  
معروف ادیب زریں قمر کے قد سے مکمل ناول  
بہ ماہر خوب صورت تراجم و تیس برس کی شاہکار کہانیاں

اس کے علاوہ

خوب صورت اشعار منتخب ناول اور انشائیات پر مبنی  
خوشبوئے سخن اور ذوق آگہی کے عنوان سے مستقل سلسلے

اور بہت کچھ آپ کی پسند اور آرا کے مطابق

پرچہ نمٹنے کی صورت میں رجسٹرڈ فون (03008264242)

Info@naeyufa.com

(021)35620771/2

0300-8264242

کے بجائے کچھ وقت سوچنے کے لیے مانگ لیا تھا کیونکہ وہ ان کی محبتوں کو انکار کر کے ٹھکرانے کی ہمت نہیں رکھتی تھی جبکہ انہوں نے ساری زندگی اسے اور اس کی ماں کو اپنا سمجھا تھا۔ وہ مجبور تھی تب ہی چپ تھی..... سیکہ نہ بی بی نے ایک رات جب اس سے دوبارہ اس سلسلے میں بات کی تو وہ اطمینان سے بولی۔

”امی..... کیا آپ نہیں چاہتی کہ آپ اور میں ہمیشہ ساتھ رہیں اور کسی کے محتاج نہ ہوں۔“ ان کے سوال کا یہ عجیب جواب تھا۔

”میں نے تم سے صرف زین کے بارے میں بات کی ہے نور اور تم مجھ سے یہ سوال کر رہی ہو؟“ جواب میں وہ بولی۔

”امی..... میری بات سمجھنے کی کوشش کریں میں نہیں چاہتی کہ زین سے شادی کے بعد ساری زندگی پھر اس خاندان کی محبتوں کی دیوار تلے میں اور آپ دب کر رہیں..... بے شک ان کے ہم پر بہت احسانات ہیں ہمیں چھت دی عزت کی زندگی دینے کا سبب بنے مگر ہم ساری زندگی تو ان پر بوجھ بن کر نہیں رہ سکتے ناں..... آپ کی بیٹی اب اتنا تو کمالیتی ہے کہ آپ کو اپنے ساتھ رکھ سکے..... میں زین کے ساتھ تمام عمر اس احساس کے ساتھ نہیں رہ سکتی کہ اس نے میری جوانی اور آپ کے بڑھاپے پر ترس کھا کر مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے۔“ ماں کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر نور نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”نور..... یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ میری بچی تو غلط سمجھ رہی ہے انہوں نے ہم پر نہ پہلے کبھی ترس کھایا تھا اور نہ اب زین کے دل میں کوئی ایسی بات ہے اگر وہ ترس کھاتے تو اس مقام پر نہ پہنچتی یا تیری ماں یوں عزت کی زندگی نہ گزار رہی ہوتی۔“ انہوں نے افسوس سے اسے دیکھا اور اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”پھر بھی امی..... زین کی محبت یا ہمدردی جو بھی وہ ہمارے لیے محسوس کرتا ہے اپنی جگہ مگر میں صرف آپ کو

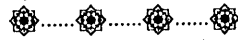


کی گھر میں موجودگی ظاہر نہ ہوئی تو پریشانی ہوئی تھوڑی دیر کے بعد جب افراد اپنے اور اس کے مشترک کمرے میں آئی تو فرش پر بنے ہوش پڑی نور کو دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، شور مچا کر باقی گھر والوں کو بلایا..... سب حیران تھے خان بابا سے پوچھا تو صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ شاہ نواز کو چائے دینے اس کے کمرے میں گئی تھی..... تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے میں واپس آ گئی تھی۔ اس کے بعد کے حالات خان بابا کے علم میں نہیں تھے نور کے ساتھ کیا ہوا اور کیسے؟ ان سب سوالات سے بڑھ کر اسے ہوش میں لانا ضروری تھا..... زین نے مصنوعی سانس دے کر اور افراد نبض اور بی پی چیک کر کے تمام ڈاکٹری حربے آزما لیے تھے مگر جب اسے ہوش نہ آیا تو زین نے اس کو بانہوں میں اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور ہسپتال لے گئے شاہ نواز کو اطلاع دی..... نور کو سخت ذہنی صدمہ پہنچا تھا اس کا ندوس بریک ڈاؤن ہوا تھا وجہ کیا تھی..... شاہ نواز کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا مگر وہ اس وقت یہ سب کیسے اور کیوں کسی کو بتاتا سب اندازے لگانے کی کوشش کرتے رہے کہ آخر کوئی ایسی بات ہوئی تھی جس کا اس کے ذہن پر اتنا گہرا اثر ہوا تھا۔

سیکنہ بی بی عمرانہ اور ابراہیم کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی..... سیکنہ کا بہت برا حال تھا سارے راستے وہ روئی ہوئی آئی تھی شہر یار نے شاہ نواز سے پوچھنا چاہا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا پریشانی کی بات تو یہ تھی کہ پورا دن اور رات گزرنے کے باوجود اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ زین سارا وقت ہسپتال میں رہا اور اس کی صحت یابی کے لیے دعائیں کرتا رہا..... سیکنہ نے آتے ہی بی بی کی حالت دیکھ کر رونا شروع کر دیا سب انہیں تسلی دینے لگے ان کی حالت سنبھلی تو جائے نماز سنبھال لی اور رورو کر نور کے ہوش میں آنے کی دعا مانگنے لگی آخر کار نور فاطمہ کو ہوش آ گیا سب کی دعائیں رنگ لائیں مگر یہ نور تو پتھر کا جسمہ لگ رہی تھی..... سب نے بلانے اور پوچھنے کی بہت کوشش کی مگر صرف ہوں ہاں

یہاں سے نکالنا چاہتی ہوں اس خاندان کا حصہ نہیں بننا ہے مجھے خود سوچیں امی..... بھی حمل میں بھی ٹاٹ کا پیوند لگا ہے..... زین کے والدین کو یہ بات سمجھا دیں کہ ہمارا اور ان کا کوئی جوڑ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ وہ زین کو سمجھائیں اور اس کے لیے اس کے جوڑی لٹری تلاش کریں۔“ نور نے اہل لہجے میں جواب دیا۔

”کیا! کیا کہا تم نے؟ میں بھائی صاحب اور عاصمہ بہن کو انکار کر دوں؟ میں ایسا نہیں کر سکتی، بہتر یہ ہے کہ تو اپنی ضد چھوڑ دے اور تجھے اپنی ضد چھوڑنا ہی ہوگی پتا نہیں کہاں سے یہ فضول باتیں تیرے ذہن میں سما گئی ہیں جب تو نے ان کا گھر چھوڑا تھا اور ہاسٹل گئی تب بھی میں نے تجھے کچھ نہیں کہا اب جب یہ موقع ملا ہے کہ میں تیری خوشیاں دیکھوں اور جو دعائیں مانگتی تھی اس کے پورا ہونے پر اللہ کا شکر ادا کروں تو حسب نسب کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہے اگر ہم ٹاٹ کا پیوند ہوتے تو زین کبھی یوں تیرے لیے اپنے والدین سے بات نہ کرتا ضد اور انا سے نقصان ہوتا ہے نور..... میری بات مان لے ورنہ تو میرا امر اہوا منہ دیکھنے لگی۔“ غصیلے لہجے میں کہتی ہوئی سیکنہ بی بی کی کمرے سے نکل گئیں اور نور کو حیران پریشان سی اب کو جاتے دیکھنے لگی..... ماں کی بات ٹالنا بھی آسان نہ تھا مگر ایک امتحان تھا جو اسے سر کرنا تھا۔



ہسپتال کے اس کمرے میں بیڈ پر نور فاطمہ بے سہد لیٹی ہوئی تھی آکسیجن ماسک کے ذریعے اس کی سانسیں کسی نہ کسی طرح رواں دواں تھیں۔ قریب ہی شہر یار صاحب اور عاصمہ بیگم بیچ پڑھ کر قرآنی آیات اس کے چہرے پر بار بار پھونک کر اللہ سے اس کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگ رہے تھے زین اور افراد بھی پریشان حال اسی کمرے میں موجود تھے سب حیران تھے کہ یہ سب یوں اچانک کیسے ہوا؟ وہ تو خوش باش شاپنگ کے لیے گئے تھے اور گھر میں ہنسی مسکراتی نور فاطمہ کو چھوڑا تھا مگر جب واپس آئے اور اسے آوازیں دینے پر بھی اس

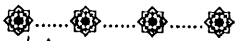
میں ہی جواب دیتی رہی..... آنکھوں میں ایک گہرا سکوت تھا اور ہونٹوں پر ایک جامد چہرہ فروز زین نے جب اصرار کیا اور اس کی بھی کچھ حالت سنبھلی تو صرف اتنا بتا سکی کہ وہ الماری پر سے کتابیں اٹھاتے ہوئے زور سے گری تھی اس کے بعد اسے ہوش نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ کیسے بتاتی کہ شاہ نواز نے کیسے اس کے اراموں کا خون کیا تھا۔

جب ڈسپارچ ہو کر گھر واپس آئی تو کچھ دنوں تک تو اس سنگدل، مغرور شخص کی باتیں بار بار اسے پریشان کرتی رہیں مگر اس کے بعد دل و دماغ میں ایسا سکوت چھایا کہ محبت سے نفرت سی ہو گئی..... افروز اور زین سے تو نارمل باتیں کرتی رہی مگر شاہ نواز کی تو صورت دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی..... اول تو وہ شرمندگی کی وجہ سے اس کے سامنے کم ہی آتا مگر جب کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو وہ اسے نظر انداز کر دیتی..... وہ شخص اس کا مجرم تھا اس کے جذبات کا قاتل تھا..... ایسا شخص جس نے اسے محبت سے نفرت کرنا سکھایا تھا اور نور جو محبت سے گندھی لڑکی تھی اپنی محبت کے قاتل کو کیسے معاف کر دیتی۔

روز اسے بددعا میں دیتی اور دل کی پھڑاس نکالتی..... اب اسے اس گھر سے بھی نفرت ہو گئی تھی..... سب نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نور تھی اس نے اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا افروز اور زین نے اپنی دوستی کے واسطے دیئے ایک کمرہ دینے کا ارادہ ظاہر کیا مگر وہ نہ مانی..... ہاسٹل میں ماریہ اس کی روم میٹ تھی یتیم خانے میں پلی بڑھی یہ لڑکی اسے سب سے منفرد لگی اس کا دکھ بھی نور سے ملتا جلتا تھا پڑھ لکھ کر ایک مقامی ہوٹل میں ریسپشن کے فرائض سنبھال رہی تھی مراد جیسے اوباش نوجوان نے محبت کا اظہار کیا اور اسے عزت اور گھر دینے کے جھوٹے خواب دکھائے..... کم عمر لڑکی تھی جذبات میں مرد کی باتوں میں آ گئی..... گھر بسانے کی خواہش میں مراد سے نکاح کر لیا مگر چند ماہ کے بعد ہی مراد اور اس کے گھر والوں نے گھر سے نکال دیا اور

طلاق دے دی..... سارا مسئلہ پیسوں کا تھا وہ جو کمائی مراد کے ہاتھ پر رکھ دیتی مگر پھر بھی وہ مار پیٹ کرتا اور اس پر شک کرتا، نتیجہ یہ ہوا کہ مراد نے ایک بار پھر اسے تنہا کر دیا اور وہ پھر سے اکیلی ہو گئی۔ وہ یمن ہاسٹل میں نور کے ساتھ رہنے لگی، مزاج ا دونوں سنجیدہ تھیں مگر نور بہت کم گو ہو گئی تھی اس لیے ان دونوں میں دوستی ہو گئی تھی۔ نور نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا زین، افروز اور شاہ نواز کے بارے میں بھی سب بتا دیا تھا۔

زندگی کی گاڑی کو چھیننے کے لیے اس نے ایم اے انگلش کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اکیڈمی جوائن کر لی تھی..... خود بھی ٹیوشن لیتی اور بچوں کو بھی پڑھاتی زین اور افروز کئی بار اس سے ملنے آئے اور اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہتے مگر وہ ہر بار انکار کر دیتی..... ایم اے انگلش کے بعد ایک مقامی اسکول میں اسے کوارٹر مینٹر کے عہدے پر نوکری مل گئی اسی عرصے میں افروز نے ہاؤس جاب شروع کر دیا اور زین نے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ شاہ نواز نے انجینئرنگ کے بعد اپنی فیکٹری لگائی تھی اور اس کے والدین نے افروز کو اس کے لیے پسند کر لیا تھا۔ نور کو علم ہوا تو اس نے خوشی کا اظہار تو کیا مگر مایوسی بھی ہوئی کیونکہ افروز جیسی پیاری لڑکی کے لیے شاہ نواز جیسا اکھڑ اور مغرور شخص اس کے نزدیک زیادہ بہتر نہیں تھا..... افروز خوش تھی اس کے لیے یہی کافی تھا۔



حویلی سے شہر واپس آنے کے بعد نور مسلسل پریشان تھی ماں نے جس رویے کا اظہار کیا تھا اس نے نور کو سنجیدگی سے اس مسئلے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ آخر وہ ایسا کیا کرے کہ وہ ماں کو اپنا کتہ نظر سمجھا سکے..... ایک طرف زین کی محبت تھی اور دوسری طرف ماں کی مجبوری اور ان دونوں کے درمیان نور فاطمہ کی انا تھی۔ اسے اپنی انا عزیز تھی مگر یہ دونوں باتیں بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں تھیں ماریہ بھی باتوں باتوں میں اسے یہی سمجھاتی کہ وہ اپنی انا کے اس کھوکھلے ماحول

سے باہر نکل آئے اور زین کی محبت کو قبول کر لے تا کہ اپنی ماں کے لیے بھی خوشی اور سکون کا باعث بن سکے مگر ابھی نہیں..... جب تک شاہ نواز کو برباد ہونے نہیں دیکھے گی جب تک اسے سکون نہیں مل سکتا تھا۔ غصے کی ایک لہر اس کے تن میں کوجھلدا رہتی۔

شاہ نواز اور افروز کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی تھی دونوں طرف سے بھرپور تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نور اپنے اسکول اور اکیڈمی میں اس قدر مصروف تھی کہ اسے اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ زین اور افروز سے ملنا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ان سے رابطہ توڑنا چاہتی تھی ایک دن اسکول کے آفس میں تنہا بیٹھی تھی کہ اچانک زین اس کے سامنے آ بیٹھا تھا۔ نور نے غصے سے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ اس طرح مصروفیت کا بہانہ کر کے تم ہم سے تعلق توڑ لو گی..... نور ہوا کیا ہے تمہیں؟ آبی کی شادی کے دن قریب ہیں یا کم سے کم ان کے ساتھ شاپنگ میں تو تھوڑی مدد کروا سکتی ہو تم یا وہ اتنا بھی حق نہیں رکھتیں تم پر۔“ زین نے افسوس سے اسے ملامت کیا تھا۔

”زین تم دیکھ رہے ہو میں کتنی مصروف ہوں اور میں نے انکار کب کیا ہے، بات کی ہے میں نے افروز سے اس سڈنہ کو ہم دونوں جائیں گے شادی کی شاپنگ کرنے۔“ لا تعلق انداز میں مسلسل پیپر پر لکھتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔

”یہ تو خوشی کی بات ہے محترمہ..... ویسے مہمان کو کچھ پوچھ بھی لیا کرتے ہیں..... نہ سلام نہ دعا اور نہ ہی کچھ کہنا پینا۔“ آفس کا جائزہ لیتے ہوئے زین نے اسے چھیڑا تھا۔

”مہمان..... کون مہمان.....؟ اوہ اچھا تم ہو میرے مہمان؟ ویسے میں تمہیں اپنا کچھ بھی نہیں چھتھی پھر بھی بتاؤ کیا لوگے تم چائے یا کولڈ ڈرنک؟“ بھنوس سکیڑتے ہوئے اس نے جواب دیا تھا۔ زین کو برا تو لگا مگر اس نے صرف اس کی طرف ملامتی ڈال کر کہا تھا۔

”صرف نور فاطمہ کی پیاری سی مسکراہٹ اور وہ نور جو

”آخر تمہیں کیا ضرورت ہے اس معمولی لڑکی کے پیچھے یوں خوار ہونے کی؟ دفع کرو اسے..... وہ تمہارے لیول کی نہیں ہے ایک سے ایک خوب صورت اور ایجوکیٹڈ لڑکی تمہیں اپنانے کو تیار ہے اور تم ہو کہ اسی کے لئے ضد لگا کر بیٹھے ہو۔“ شام کی چائے پر وہ تینوں جمع تھے افروز چائے سرو کر رہی تھی جب شاہ نواز نے زین سے کہا ”لا تعلق اور نور کے لیے اہانت اور تحقیر اس کے لہجے سے عیاں تھی۔“

”آپ کے لیے وہ معمولی لڑکی ہو گی مگر میرے لیے وہ میری ساری زندگی کا اثاثہ ہے میری کل کائنات ہے نور..... کیونکہ میں اس سے محبت کرتا ہوں..... شدید محبت اور مجھے یقین ہے کہ میری محبت میں اتنی طاقت تو ہے کہ جو اس کی خود ساختہ انا اور ضد کو توڑ سکتی ہے مجھے یقین ہے شاہ نواز بھائی کہ وہ ایک نہ ایک دن ضرور میری ہوگی۔“ زین کو شاہ نواز کا انداز برا ضرور لگا مگر اس نے پھر بھی پر یقین اور نرم لہجے میں جواب دیا۔

”میرا خیال ہے کہ یہ زین کا ذاتی مسئلہ ہے بہتر یہ ہے کہ ہم اس میں دخل نہ دیں اور ویسے بھی مجھے تو اپنے بھائی کی خوشی عزیز ہے اگر اس کی خوشی نور کے ساتھ میں ہے تو ہمیں بھی مان جانا چاہیے شاہ نواز..... جہاں تک خاندان اور حسب نسب کی بات ہے میرا خیال یہ ہے کہ محبت ان تمام باتوں سے ماوراء ہے۔“ افروز نے بھائی کی تائید کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں شاہ نواز کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”آئی نو..... کہ یہ اس کا پرسنل میٹر ہے مگر سمجھانا میرا فرض ہے۔“ چائے کے سپ لیتے ہوئے شاہ نواز نے

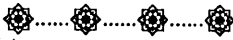
کبھی ہماری دوست ہوا کرتی تھی۔“ دھیمے لہجے میں نور کو احساس دلانا چاہا تھا۔  
”دوست تو اب بھی ہوں تم لوگ مانو یا نہ مانو۔“ اس نے کوئی بھی رد عمل ظاہر کیے بغیر عام سے لہجے میں زین کو جواب دیا تھا۔

”ہنہ دوست..... ویسے تو تم صرف میری دوست ہی نہیں ہو بلکہ اور بھی بہت کچھ ہو۔“ زین نے جلتے ہوئے لہجے میں اپنا اور اس کا تعلق واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔

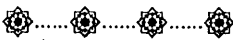
”ہاں..... کیا..... اور کیا..... کیا بہت کچھ۔ پلین زین کھل کر بات کرنا کہنا کیا چاہتے ہو؟“ وہ جو مسلسل زین کی باتوں سے زچ ہو رہی تھی اس کی وضاحت چاہتی تھی تب ہی کام چھوڑ کر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔

”نور..... میں تم سے محبت کرتا ہوں اب سے نہیں بلکہ اس وقت سے جب سے میرے دل نے دھڑکتے ہوئے مجھے تمہارا احساس دلایا..... تم دور ہو کر بھی میرے پاس رہتی ہو..... میں تمہیں شدت سے چاہتا ہوں اور تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔“ نور کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر زین ایک جذب کے عالم میں بولا تھا۔ نور کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں اور وہ زین کی آنکھوں میں کئی بار اپنا عکس دیکھ چکی تھی اور اسی لمحے سے ڈرتی تھی جب زین اسی طرح اس سے محبت کا اظہار کرے جس طرح اس نے شاہ نواز سے محبت کی بھیک مانگی تھی..... اسے معلوم تھا کہ وہ زین کو کچھ بھی نہیں دے سکتی..... کبھی وہ بھی اسی جگہ پر کھڑی تھی جس مقام پر آج زین تھا، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ شاہ نواز بن جائے یا وہی پہلے والی محبت سے گندھی نور فاطمہ؟ ذہن میں عجیب سی جنگ چھڑ گئی تھی، جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکال کر تیزی سے اپنی سیٹ سے اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔

”نور..... نور فاطمہ..... کیا ہوا؟ کچھ جواب تو دو یار..... یہ لڑکی بھی ناں۔“ بڑبڑاتا ہوا زین وہاں سے نکل گیا اسے باہر تلاش کیا مگر وہ کہیں بھی نہیں ملی تھی۔



شاہ نواز اور افروز کی شادی دھوم دھام سے کی گئی..... نور پلٹا ہوا تو شادی میں شریک تھی مگر مسلسل زین سے بچ رہی تھی جانتی تھی کہ وہ اسی بات کا ذکر بار بار کرے گا اپنے دل کی کیفیت بھی اسے معلوم تھی۔ اس واقعے کی بعد زین نے کئی کالز اسے کی تھیں بار بار پوچھا تھا اس سے کہ وہ کیا چاہتی ہے، اس نے کیا سوچا؟ مگر وہ اسے نالٹی رہی..... کبھی کال انٹینڈ نہ کرتی، کبھی مصروفیت کا بہانہ کر دیتی زین اس کی حرکتوں سے زچ آ گیا تھا..... اس کی محبت شدت اختیار کر گئی تھی۔ نور نے خود کو اس قدر مصروف کر لیا کہ پہلے جو کبھی کھار افروز سے ملاقات ہو جاتی تھی اب اسے خود نور کو کال کر کے بلانا پڑتا یا وہ خود اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر اس کے ہاسٹل اس سے ملنے چلی جاتی..... شکوے تو کئی تھے اس کو نور سے مگر جب زین نے نور سے متعلق اسے اپنی پسندیدگی اور محبت کے بارے میں بتایا تو سب کچھ بھول کر ایک بار پھر سے وہ نور سے محبت اور دوستی کا اظہار کرنے لگی تھی۔ شاہ نواز غصے کا تھوڑا تیز تھا..... اچھا شو ہر ثابت ہوا تھا مگر کبھی کبھی افروز کو نور کے لیے اس کی ناپسندیدگی اور درشت لہجہ سمجھنے میں ڈال دیتا پھر بھی اس نے کبھی شاہ نواز سے اس سلسلے میں بات نہیں کی تھی اور اب جب اسے ماں بیٹے کی خوش خبری ملی تھی وہ اور بھی شاہ نواز کا خیال رکھنے لگی تھی..... نور کو ممانے کا سلسلہ بھی جاری تھا کیونکہ وہ اپنی پیاری دوست کو بھی کھونا نہیں چاہتی تھی۔



شاہ نواز کو جیسے ہی باپ بننے کی خبر ملی وہ خوش سے پاگل ہو گیا۔ عمران، ابرار اور افروز کے والدین حویلی سے شہر اسے ملنے آئے اور ڈھیروں ختے تحائف بھی ساتھ لائے۔ افروز بھی بہت خوش تھی زین نے بھی اسے اس کی

اوپنچی آواز سنائی دی۔

”نور..... نور..... دیکھو تو..... تمہارے لیے کسی نے سالگرہ کا تحفہ بھیجا ہے۔“ خوشی سے چلاتے ہوئے ماریہ تقریباً بھاگتے ہوئے اندر آئی تھی اور خوب صورت سے گفٹ ریپر میں لپٹا ہوا ڈبا اس کے سامنے لہرایا۔ کوریئر سروس والا ریپر وہ پہلے ہی بھڑا چکی تھی۔ صبح نور کو کسی نے وش کیا تھا آج اس کی سالگرہ تھی۔

”گفٹ..... میرے لیے.....! کس نے بھیجا ہے؟“ اس سے پوچھتے ہوئے ڈبا اس سے لے لیا اور کھولنا شروع کیا۔

”مانو یا نہ مانو یہ تحفہ زین نے بھیجا ہے ویسے بھیجنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا، شاید اندر کہیں نام اور پتا درج ہو۔“ ماریہ نے قیاس آرائی کی۔

”دیکھتے ہیں.....“ افروز کی طرف سے نہ آیا ہو۔“ نور نے جب ڈبا کھولا تو اندر سے ایک دو صفحوں کا کاغذ اور خوب صورت سے ڈبے میں رکھا ہوا ایک خوب صورت سا قلم اور رنگ برنگ کے کاغذوں سے بنا ہوا سپرنگ بائسڈنگ والا چھوٹا سا رجسٹر تھا یا شاید ڈائری تھی۔ تحفہ تو بہت خوب صورت تھا اسے یقین تھا کہ یہ زین نے ہی بھیجا ہے تب ہی دونوں تحفے ماریہ کو پکڑا کر اس نے دو صفحوں والا کاغذ پڑھنا شروع کر دیا۔

محبت کرتی ہی ہم نے

محبت پانپس سکتے

بہت کہنے کی خواہش ہے

مگر بتانا نہیں سکتے

سنو..... تم لوٹ آؤ ناں

تیری باتیں تیری یادیں

ہمارا دل دکھائی ہیں

بہت تکلیف ہوئی ہے

تحفے سنا نہیں سکتے

سنو..... تم لوٹ آؤ ناں!

تیرے ساتھ چلنا ہے

پسندیدہ چیزیں لا کر دیں۔ شہر یار نے عاصمہ کو افروز کے ساتھ رہنے اور اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی، وہ خود بھی ایک ڈاکٹر تھی جب سے یہ خوشی کی خبر ملی تھی شاہ نواز نے اس کو ملازمت چھوڑنے کا فرمان جاری کر دیا تھا۔ نور کو خود افروز نے فون کر کے بتایا تھا وہ بھی خوش تھی اور خود گھر آ کر اسے مبارک باد دی تھی۔ ایک شام جب افروز نے شاہ نواز کو چائے لا کر دی تو اس نے افروز سے کہا۔

”کتنی بار منع کیا ہے تمہیں کہ تم آرام کیا کرو اتنے زیادہ نوکرا خرکس مرض کی دوا ہیں۔“

”سارا دن بستر پر پڑے پڑے تھک جاتی ہوں..... امی سارا کام کر دیتی ہیں بس مجھے آپ کا کام کرنا اچھا لگتا ہے۔“ افروز نے جواباً کوفت اور بے زاری کا اظہار کیا اور اپنی محبت واضح کی۔

”وہ تو ٹھیک ہے فری..... مگر میں اپنے بچے کو صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں اور تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو تو مائی ڈیئر تم کام نہ ہی کرو تو بہتر ہے بس خوب کھاؤ اور آرام کرو۔ ویسے تم میڈیسنز تو لے رہی ہوناں؟“ شاہ نواز نے پوچھا۔

”جی ہاں قاعدگی سے لے تو رہی ہوں مگر پھر بھی کبھی کبھی بہت تھکاوٹ محسوس کرتی ہوں۔“ افروز نے جواب دیا۔

”بس اب ایک بات مانو تم..... کام و ام سب چھوڑ دو اگر میں نے تمہیں اب آئندہ کام کرتے یا چائے بناتے دیکھا تو بہت برا ہوگا۔“ شاہ نواز نے چائے پیئے ہوئے کہا۔

”اوکے باس بانی داوے میں خود ڈاکٹر ہوں مجھے پتا ہے کہ کیا کرنا چاہیے ایسی حالت میں.....“ افروز نے جتاتے ہوئے مسکرا کر کہا تو جواب میں شاہ نواز بھی مسکرا دیا تھا۔



کافی دیر سے نور اپنے کپڑوں کی الماری میں تھسی چیزوں اور کپڑوں کو سیٹ کر رہی تھی کہ اچانک ماریہ کی

تیری منزل بھی بننا ہے  
بہت تھک گئے ہیں ہم  
اب آگے جا نہیں سکتے  
سنو..... تم لوٹ آؤ ناں  
ہم ٹوٹ جائیں گے  
ہمیں کیسے سمیٹو گے؟  
میری جان ہم تجھے بھلا نہیں سکتے  
سنو..... تم لوٹ آؤ ناں!!

”مجھے معلوم ہے کہ تم نے ضرور میرے تحفے کا انتظار کیا ہو گا مگر اس سال تمہیں دش کرنے کا یہ انداز صرف اور صرف تمہیں منانے کے لیے ہے..... مجھے کوئی تحفہ بھی تمہاری شبان شان نہیں لگا..... جانتا ہوں تمہیں کاغذ اور قلم سے عشق ہے اسی لیے محبت اور چاہت کے رنگوں سے رنگے یہ چند کاغذ اور یہ قلم تمہیں بھیج رہا ہوں گزارش ہے کہ ان کو ضرور استعمال کرنا بے شک ان پر اپنی خود ساختہ ضد اور انا کی کہانیاں درج کرنا یا ایسی تدبیریں لکھنا کہ جس سے تم میری محبت کے حصار سے نکل سکتی ہو..... یہ سب تم پر منحصر ہے مگر میری دعا ہے کہ اللہ کرے تم صرف ان رنگوں پر ”محبت“ لکھو۔  
ہمیشہ خوش رہو۔

زین شہریار  
سب پڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، ماریہ نے اس کی طرف جتنی ہوئی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ نور تم اس محبت بھرے الفاظ کو کیسے ٹھکراؤ گی؟ اور آگے بڑھ کر اس کے آنسو صاف کیے اور اسے گلے سے لگا لیا..... نور نے اس خوب صورت تحفے کو مسکرا کر دیکھا اور سینے سے لگا کر خوب روئی..... مسلسل دستک سے دل کی بندھن کی تو کھل گئی تھی بس دروازہ کھلنے کی دیر تھی۔



جوں جوں افروز کی ڈیلوری کے دن قریب آرہے تھے وہ عجیب و غریب دوسووں کا شکار ہو رہی تھی۔ رات بھر سو نہ پانی، آیات کا ورد کرتی رہتی پھر بھی ڈراؤ نے

خواب اسے جگا دیتے۔ جس سے نہ صرف وہ بلکہ شاہ نواز اور باقی لوگ بھی بہت پریشان تھے۔ سب اسے تسلی دیتے کہ وہ اللہ پر بھروسہ رکھے کچھ نہیں ہو گا مگر افروز نے سوچ سوچ کر اپنی حالت اور بھی خراب کر لی تھی شاہ نواز اس کی یہ کیفیت دیکھ کر بہت فکر مند رہنے لگا تھا اس کو اپنے کام کی بھی کوئی پروا نہ تھی وہ اسے بہت سمجھاتا، اس کا بہت خیال رکھتا مگر جو ڈراس کے دل میں بیٹھ گیا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ہو جائے گا اس کا علاج کسی کے بھی پاس نہیں تھا۔ نور کو افروز کے بارے میں یہ سب پتا چلا تو وہ اس سے ملنے چلی آئی اس کی عجیب و غریب حالت دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔

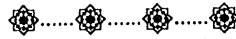
”افروز..... یہ کیا شکل بنا رکھی ہے تم نے اور کیا فضول سوچتی رہتی ہو تم..... ڈاکٹر تو دوسروں کو زندگی کی تسلی دیتے ہیں اور تم اپنی زندگی کے بارے میں خود پر امید نہیں ہو؟ مجھے تم سے ایسے رویے کی امید نہیں تھی۔“  
”بس یار نور..... مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی شاید یہیں ختم ہونے والی ہے۔ طرح طرح کے دوسو سے آتے ہیں میں خود نہیں جانتی ایسا کیوں ہے؟“ افروز نے پریشان ہو کر جواب دیا۔

”یہ صرف تمہارا وہم ہے اور میں نے سنا ہے کہ ایسا عورتوں میں ہوتا ہے جب وہ پہلے بچے کو جنم دینے والی ہوتی ہیں۔ تم اچھا اچھا سوچا کرو اور اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھو۔“ نور نے اسے تسلی دی۔  
”کوشش تو کر رہی ہوں مگر یا تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں پلیز وعدے کا پاس رکھنا اور ضرور پورا کرنا۔“  
نور کے ہاتھ تھام کر افروز نے کہا۔  
”وعدہ..... کیسا وعدہ.....؟ اور کہہ تو تم ایسے رہی ہو جیسے خدا خواستہ تم جانے والی ہو۔“ نور نے حیرانگی سے اسے دیکھا۔

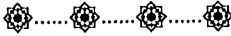
”مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میرے بھائی زین کی خوشی کا خیال کرتے ہوئے اس کی محبت کو قبول کر لو گی اور اس کا ساتھ دو گی۔“ افروز نے وعدہ لینا چاہا۔

”یہ کیسا وعدہ ہے؟ میں یہیں ہوں تم بھی یہیں ہو..... میری دعا ہے کہ تم لمبی عمر پاؤ اور اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھو..... وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔“ نور نے ہچکنا انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی اگر دوست ہو..... مجھے اپنا دوست مانتی ہو تو میری بات مان لو..... یقیناً مانو زندگی تمہارے لیے ہر لمحہ خوب صورت اور چاہت سے بھرپور ہو جائے گی اور تم زین کے اپنے ساتھ ہونے پر فخر کرو گی۔“ پر یقین لہجے میں افروز نے کہتے ہوئے اس سے اقرار چاہا۔ جواب میں نور نے اس کو گلے لگا لیا جو اس بات کا اظہار تھا کہ وہ اس بارے میں ضرور سوچے گی۔



رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب ماریہ نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا اور ایسی روح فرسا خبر سنائی کہ جس کو ن کر وہ سن بھی رہ گئی۔ ذہن نے ایک دم کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ افروز نے ہاسپٹل میں ایک بچی کو جنم دیا اور انتہائی تکلیف دہ حالت میں اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی..... ابھی چند روز پہلے تو وہ اس سے ملتی تھی اسے ڈھیروں تسلیاں دی تھیں اور اب یوں اچانک۔



”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ماریہ..... افروز کو کچھ نہیں ہو سکتا وہ تو میری دوست ہے۔“ متکسل روتے ہوئے وہ بس یہی کہہ رہی تھی ماریہ نے اسے سنبھالا پھر دونوں جلدی ہاسپٹل پہنچی جہاں سب جمع تھے۔ شاہ نواز اور شہر یار انگل گلے لگ کر رو رہے تھے عاصمہ نئی بھی بے سدھ تھیں اور زین کمرے کی دیوار سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا وہ بھاتی ہوئی زین کے پاس آئی اور روتے ہوئے بولی۔

”زین..... یہ سب کیا ہو گیا..... افروز یوں ہمیں چھوڑ کر نہیں جاسکتی..... کہہ دو کہ یہ جھوٹ ہے زین۔“

”نہیں نور..... یہ سچ ہے..... آپ اب اس دنیا میں نہیں ہیں جو ڈر اور خوف ان کے ذہن میں بیٹھا تھا وہ ایک بھیا نک سچ بن کر ہم سب کے سامنے ہے۔“

افروز کی یوں اچانک موت سب کے لیے ایک ناگہانی آفت تھی ہی مگر اس سے سب سے زیادہ متاثر شاہ نواز ہوا تھا اس کے چالیسویں تک تو اسے اپنا بھی ہوش نہیں رہا تھا اس کی بیٹی جس کا نام ”ہانیہ افروز“ رکھا گیا تھا اس ننھی پری کو عمر ان بوائے اور گھر کے باقی مکیمنوں نے سنبھالا ہوا تھا۔ چالیسویں کے بعد بھی وہ خود کو سنبھال نہ پایا پہرہوں کمرے میں بند رہتا افروز کو سوچتا رہتا۔

”کیوں..... آخر کیوں؟ تم مجھے اور میری بیٹی کو چھوڑ کر اتنی دور چلی گئی ہو جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔“ اس کی تصویر کو سینے سے لگائے وہ شکایت کرتا، عمر انہ اور ابرار جہاں اکلوتے بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر کڑھتے وہیں شہر یار اور عاصمہ اپنی اکلوتی بیٹی کے غم کو ایک لمحہ بھی بھول نہ پاتے۔

ہانیہ کی ذمہ داری مکمل طور پر بوا جی نے لے لی تھی کچھ عرصہ تو وہ شہر رہیں مگر پھر شہر یار اور عاصمہ کے ساتھ گاؤں واپس آ گئیں..... چند ماہ کی ہانیہ کو بھی اپنے ساتھ لے آئی تھیں۔ شاہ نواز کو اپنی پرواہ نہیں تھی بیٹی کو دیکھتا تو افروز

ڈاؤن سائزنگ کی وجہ سے پہلے ہی بہت نقصان ہوا تھا اگر زین ہمت سے کام نہ لیتا اور دکھوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار نہ کرتا تو شاید ان کا کاروبار بالکل ٹھپ ہو جاتا۔

اس وقت نور زین کے آفس آئی تھی تاکہ اسے تسلی دے سکے اس کا غم گو کہ بہت بڑا تھا خود وہ بھی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ افروز کی باتیں اور یادیں ہی اتنی گہری تھیں کہ اس پیاری لڑکی کی شہیہ اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔ ہر لمحہ ہر گھڑی کسی نہ کسی یاد کسی نہ کسی بات کی صورت میں اس کی یاد آتی اور وہ روئی رہتی..... ماریہ اس کی آنکھوں کے غم گوشے دیکھتی تو ڈھیروں تسلیاں دیتی۔

”پلیز..... زین خود کو سنبھالو..... بے شک افروز کے جانے کا دکھ ایسا ہے جس نے ہم سب کو ہلا کر رکھ دیا ہے مگر اب ہمیں ہی سب کو تسلی دینا ہوگی سب کو سنبھالنا ہوگا..... پلیز ہمت کرو۔“ نور نے اسے تسلی دی۔

”ہاں..... سب سے زیادہ تو شاہ نواز بھائی اس حادثے سے متاثر ہوئے ہیں..... وہ تو دنیا سے بھی کٹ کر رہ گئے ہیں۔“ زین نے اسے بتایا۔

”ان کا دکھ بھی تو ہم سے زیادہ ہے، افروز نے تو ان کے ساتھ زندگی کے اہم پل گزارے تھے، دکھ سکھ میں ان کا ساتھ دیا تھا مگر وہ خود ہی ان کو دکھوں کی اندھیر دنیا میں چھوڑ گئی..... زین تم پلیز ان کو تسلی دو..... سہارا دو انہیں سمجھاؤ کہ ہانیہ کے لیے سوچیں، وہ ان کی محبت اور توجہ کی منتظر ہے۔“ انفرادہ لہجے میں نور نے زین کو سمجھایا۔

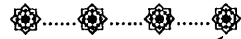
”میں کوشش تو کر رہا ہوں..... میری بات ہوئی تھی امی بابا، انکل آئی اور بواجی سے..... ہانیہ ٹھیک ٹھاک ہے سب اس کا بہت خیال رکھ رہے ہیں حویلی میں۔“

”مگر اسے باپ کی محبت کی بھی ضرورت ہے زین.....“ وہ جو ساری عمر باپ کی توجہ سے محروم رہی تھی یک دم بولی۔

”ہاں..... شاہ نواز بھائی جب دکھوں کے حصار سے

کو آوازیں دینا شروع کر دیتا، اسے نہ پا کر پاگل سا ہو جاتا..... عزیز بیوی کے یوں اچانک چلے جانے کا غم بہت زیادہ تھا..... عمرانہ اور ابرار کے علاوہ زین بھی شاہ نواز کو ڈھیروں تسلیاں دیتے اور اسے ہانیہ کے وجود کا احساس دلانے کی کوشش کرتا..... دل پر نگے زخم آہستہ آہستہ مندمل تو ہو جاتے ہیں مگر کبھی کبھی لاشعوری طور پر انسان کو اس کی کوتاہیوں اور زیادتیوں کا بھی احساس دلا جاتے ہیں۔

شاہ نواز سنبھل تو گیا تھا مگر اسے شدت سے یہ احساس ہونے لگا کہ یہ واقعہ اس کے لیے رب تعالیٰ کی طرف سے ایک آزمائش ہے اللہ کی مخلوق کے ساتھ تحقیر اور ذلت آمیز رویہ اختیار کرنے پر اسے اس ذات برحق کی طرف سے سزا دی گئی ہے، یہ احساس مسلسل اس کے ذہن کو کچھ کے لگاتا، اس نے ہمیشہ سیکھنے بی بی اور نور فاطمہ کو کم تر سمجھا، ان کی تذلیل کی، اس معصوم لڑکی کی محبت کو ٹھکرایا، اور آج اس کی سزا اسے افروز کی یوں اچانک موت کی صورت میں ملی..... مکافات عمل شروع ہو گیا تھا۔ وہ شاہ نواز جسے اپنے حسب نسب پر غرور تھا آج سب کچھ ہوتے ہوئے بھی تہی داماں اور بالکل تنہا رہ گیا تھا۔



”وقت کا کام گزر رہا ہے انسان بڑے بڑے صدمے اور دکھ برداشت کر لیتا ہے پھر بھی کچھ دکھ اندر ہی اندر موجود رہتے ہیں آپنی کے چلے جانے کا دکھ بھی ہم سب لوگوں کے دل میں ہمیشہ رہے گا لمحہ بہ لمحہ ہمیں ان کی یاد آتی ہے نور..... وہ خود تو چلی گئیں مگر ہمیں زندگی کے ہر مقام پر اپنی کمی اور یاد کے ایسے راستے پر ڈال گئی ہیں جہاں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ نور یہ دکھ کبھی بھی کم نہیں ہو سکتا آج وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔“ بوجھل لہجے میں زین نے نور سے کہا۔ ضبط کے جس مقام پر آج وہ تھا اس کی کیفیت وہ ہی سمجھ سکتا تھا جو اس دکھ سے گزرا ہو۔ شاہ نواز نے فیکٹری کو دوبارہ سے چلانا شروع کر دیا تھا۔



نکلیں گے تو انہیں بیٹی کی یاد ضرور آئے گی..... میری تو یہی دعا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں دوبارہ واپس آ جائیں۔ کاش آپ! آپ ہمیں چھوڑ کر نہ جاتیں۔“ ضبط کے عالم میں زین کے منہ سے یہ سب نکلا۔

”واپس آنا مشکل تو ہوگا ان کے لیے مگر ناممکن نہیں اور تم بس افروز کے لیے دعا کیا کرو..... اللہ اس کی مغفرت کرے اور ہمیں اس کا غم سہنے کی توفیق دے آمین۔“ نور نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا۔

”آمین۔“ پھیکسی سی مسکراہٹ لیے زین آہستگی سے بولا کہہا۔

”جی..... جی..... کیسے میں سن رہی ہوں۔“ نور نے کہا۔

”میں نے تمہارا دل توڑا..... تمہاری محبت کو ٹھکرایا..... تمہیں ہر لمحہ حقیر سمجھا اپنے حسب نسب اور خاندان پر فخر کیا..... میں بھول گیا تھا کہ ہر جگہ موجود وہ ذات برحق اسی وقت ہم سے خوش ہوتا ہے جب ہم اس کی مخلوق کو خوش رکھتے ہیں اور یہ کہ اس ذات کے نزدیک سب برابر ہیں یہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے کھوکھلے معیار ہیں جس کی بنا پر ہم اس کی دی ہوئی دولت اور خاندان پر یوں اڑتے ہیں کہ جیسا یہ سب ہمیشہ رہنے والا ہو..... انسان بھول جاتا ہے کہ کسی بھی وقت اس سے یہ سب چھین بھی سکتا ہے مجھے سزا ملی ہے تمہارا دل دکھانے کی کہ مجھ سے میری پسندیدہ سستی، میری بیوی افروز چھین گئی..... بہت دور چلی گئی، خدا را مجھے معاف کر دو جانتا ہوں کہ دل توڑنے کی سزا بہت بڑی ملی ہے مگر شاید تمہارے معاف کرنے سے میرے ضمیر کی چھین کچھ کم ہو جائے۔ پلیز نور معاف کر دو مجھے۔“ اس کے لہجے سے ضمیر کی خلش عیاں تھی۔ ایک التجا اور گزارش کا سا انداز تھا۔

”میں تو ایک عام اور حقیر سی لڑکی ہوں..... جو خود کسی قابل نہ ہو وہ دوسرے کو کیا معاف کرے گی پھر بھی میں نے کبھی بھی آپ یا افروز کا برا نہیں چاہا اگر آپ سمجھتے ہیں

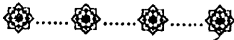
ہانیہ ایک سال کی ہو گئی تھی..... نور اور زین کئی بار اس سے ملنے حویلی آئے تھے..... شاہ نواز جب کچھ سنہیالا تو بیٹی کی یاد شدت سے آئی ہانیہ اس کی زندگی کا اثاثہ تھی، دکھوں کا پہاڑ اپنا احتساب اور دوسروں کی تسلیوں سے کاٹ لوپا تھا مگر اب وقت آ گیا تھا کہ وہ اس لڑکی سے بھی معافی مانگ لے جسے اس نے سب سے بڑا دکھ پہنچایا تھا۔ وہ نور سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ حویلی میں جس طرح بواجی نے ہانیہ کا خیال رکھا تھا وہ ان کا بھی ممنون تھا۔ ان سے بھی اپنے درست رویے کی معافی مانگی تھی۔ عمرانہ بھی سیکینڈ کی عظمت کی قابل ہوئی تھیں کہ کس طرح اس تنہا عورت نے صرف دوسروں کی مدد اور ہمدردی و خدمت کر کے ایک لمبی عمر کاٹی تھی۔ حویلی میں شاہ نواز اور زین کسی کام سے آئے ہوئے تھے پیچھے نور فاطمہ بھی اپنے سب کام چھوڑ چھا کر ہانیہ سے ملنے آ گئی تھی، اسکول سے چٹیاں تھیں فراغت ہی فراغت تھی۔

”افروز..... تم کیوں چلی گئیں مجھے اور اس نصی سی پری کو چھوڑ کر..... دیکھو یہ بھی بچی آج بھی تمہاری منتظر ہے، اس کی روشن آنکھیں آج بھی تمہیں دیکھنے کو بے چین ہیں، یقیناً جانو میں نے شاہ نواز کو بددعا میں ضرور دی تھیں مگر دل سے نہیں۔ بے شک اس نے ایک ہستی مسکراتی نور کو پتھر کی صورت بنادیا تھا مگر نور نے کبھی نہیں

پلیز مجھے معاف کر دو۔“ آہستگی سے اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

”معافی..... کیسی معافی..... معاف تو تم نے مجھے کیا ہے میری محبت کو قبول کر کے۔ تھینک یو..... کیا یہ نور ہمیشہ کے لیے میری آنکھوں کا نور بننے کے لیے تیار ہے؟“ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے بکے تھمتے ہوئے زین نے کہا۔ نور نے حیرانی سے اسے دیکھا اور پھر ایک جاندار قہقہہ لگا کر بکے تھما لیا۔

”زین..... تم بھی.....“ ہنستے ہوئے اس نے کہا تو زین کے لب خود بخود مسکرا اٹھے۔ محبت نے یقین کی منزل پالی تھی۔



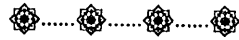
شاہ نواز زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ اب اسے صرف ہانیہ کو توجہ دینی تھی۔ افروز کی یاد ہر لمحہ ہر گھڑی اس کے ساتھ تھی مگر ہانیہ کو ماں کا پیار اور توجہ کی بھی ضرورت تھی سب کے سمجھانے اور قائل کرنے پر وہ ایک فیصلے پر رضا مند ہو گیا اور وہ فیصلہ تھا ماریہ سے نکاح کر کے ہانیہ کو ماں کا پیار اس کا حق دلانے کا فیصلہ..... ماریہ بھی اس تھی بچی کو پا کر بہت خوش تھی..... افروز کی نشانی کو سینے سے لگاے وہ شاہ نواز کے دکھ سکھ کی ساتھی بن گئی تھی۔

شاہ نواز جس نے نور فاطمہ کو صرف اس لیے ٹھکرا لیا تھا کہ وہ ایک نوکرانی کی بیٹی ہے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی ایک ایسی عورت کے ساتھ گزارنے پر راضی و خوش تھا جس کے بارے میں اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے ماں باپ کون تھے..... ذہن کی سب گرہیں جب کھلیں تو اس معمولی سی بات کی شاہ نواز کے سامنے کوئی اہمیت نہ رہی تھی۔



کہ میرے معاف کرنے سے آپ مطمئن ہو سکتے ہیں شاہ نواز تو میں نے آپ کو کھلے دل سے معاف کیا۔“ نور نے ایک ٹوٹے اور بارے ہوئے شخص کو معافی کا اذن دے کر ایک عجیب سا سکون دل میں محسوس کیا تھا۔

”میں تمہارا شکر گزار رہوں گا..... شکر یہ کہ تم نے مجھے معافی کے قابل سمجھا۔ چلتا ہوں۔“ شاہ نواز کہتے ہوئے چلا گیا تھا اور وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ وہ شاہ نواز کو تباہ و برباد ہوتے ہوئے دیکھے گی تو اسے سکون ملے گا ایسا نہیں ہوا تھا اسے چھتتاوا تھا کہ کاش وہ یوں اسے بددعا نہ دیتی۔



”زین..... میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے، ہر دفعہ تمہاری محبت کے سامنے میری اتانے بند باندھ کر تمہیں گرانے کی کوشش کی مگر میں جانتی ہوں کہ تمہارا دل بہت بڑا اور تمہارا ظرف بھی..... وقت آ گیا ہے کہ میں افروز سے کیے گئے وعدے کا پاس رکھوں..... صرف یہی نہیں بلکہ میں نے خود تمہاری محبت میں اتنی طاقت اور شدت محسوس کی کہ خود بخود میرا دل تمہاری طرف کھینچتا چلا گیا۔ تمہارا یقین اور محبت پر تمہارا بھروسہ اس قدر مضبوط رہا کہ اس سے سامنے میری ضد اور خود ساختہ نفرت ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو..... میں سب کشتیاں جلا کر اور سب کچھ بھلا کر تمہاری طرف لوٹی ہوں اس یقین کے ساتھ کہ تم اس صبح کے بھولے کو شام کی واپسی پر قبول کر لو گے اور ہاں یہ بکے تمہارے لیے..... تمہیں ریڈ اینڈ وائٹ روز بہت پسند ہیں ناں۔“ پھولوں کا خوب صورت سا گلہ ستہ اسے دیتے ہوئے نور فاطمہ اس کے سامنے کھڑی تھی..... اسے یقین نہیں آ رہا تھا مگر محبت کے اس کھیل میں اس کا یقین جیت گیا تھا۔

”نور..... سچ میں..... ایہ تم ہو.....؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ بے حد خوشی اور ناقابل یقین لہجے میں اس سے بکے لیتے ہوئے زین خوشی سے چلایا۔

”ہاں..... یہ نور فاطمہ ہی تمہارے سامنے کھڑی ہے“

# بڑی قلم

نظیر فاطمہ

پھر کیا ہوا یہ راہ کی دشواریوں سے پوچھ  
بس اتنا یاد ہے تیری جانب چلا تھا میں  
کل رات ایک شخص تھا مجھ سا کسی کے ساتھ  
جانے میری نگاہ کا دھوکا تھا یا تھا میں

چھن رہے تھے۔ اگست کا تھکا ماندہ سورج مغرب کی  
سمت بادلوں میں منہ چھپا رہا تھا۔ مسز احمد کی گاڑی پورچ  
میں آکر رکھی تھی۔ مسز احمد نے گاڑی کا انجن بند کیا، اپنا ہینڈ  
بیک اور موبائل ہاتھ میں پکڑا اور گاڑی سے اتر کر اندر کی  
جانب بڑھ گئیں۔ اندر داخل ہوئیں تو سب کچھ معمول کے  
مطابق چل رہا تھا۔ بچے بیڈرو کے پاس پڑھ رہے تھے۔ کوثر  
کھانا پکا رہی تھی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئیں۔ بیک  
رکھا، شاور لیا اور فریش ہو کر تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئیں۔  
ابھی انھیں لیٹے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ احمد صاحب  
بھی آگئے۔ انھیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ سوئی  
بن گئیں۔ ان کا رویہ اپنے شوہر کے ساتھ بڑا عجیب سا تھا  
حالانکہ دونوں کی پسند کی شادی تھی۔  
علینہ کا تعلق اچھے گھرانے سے تھا۔  
جہاں کسی چیز کی کمی کوئی نہیں سمجھتا جبکہ احمد کا تعلق ایک  
مڈل کلاس گھرانے سے تھا جہاں دس مرلے کا ایک گھر  
تین بھائیوں کی ملکیت تھا۔ علینہ، احمد کی ظاہری خوب  
صورتی اور آواز پر مر مٹیں۔ ان دنوں احمد ایک سیلور پینٹی کے  
کال سینٹر میں ملازمت کرتے تھے۔ علینہ چار بھائیوں کی

اکلوتی بہن تھیں۔ باپ کی سرچرہی تھیں۔ گھر جا کر وہ رونا  
پینٹا شروع ہوئیں کہ سب کو ان کی بات ماننے ہی بنی۔ احمد  
سے شادی کے بعد تو وہ گویا ہواؤں میں اڑنے لگیں۔ پاؤں  
زمین پر تب لگے جب وہ احمد کے آبائی گھر میں آئی۔ جہاں  
کا ماحول ان کے گھر کے ماحول سے بالکل الٹ تھا جیسا وہ  
پچھے چھوڑ آئی تھیں۔ دونوں جیٹھ شادی شدہ، ایک کے تین  
بچے دوسرے کے چار..... وسائل کی کمی ہر وقت کی چیخ چیخ  
اور شور شراب نے ان کا دماغ الٹ دیا تھا۔  
”تم ملک سے باہر چلے جاؤ احمد۔ یہاں ہمارا گزارا  
نہیں ہے۔“ جب ان کا پہلا بیٹا پیدا ہوا تو انہوں نے شوہر  
کو مجبور کرنا شروع کر دیا۔ احمد کا ایم سی ایس مکمل ہو گیا تھا۔  
تھوڑی جدوجہد کے بعد انہیں دہلی میں اچھی جاب مل گئی۔  
مسز علینہ احمد نے سکون کا سانس لیا۔ احمد کے جانے کے  
بعد وہ بیٹھ سمیت اپنے والدین کے گھر آ گئیں کہ ان کے  
دو بھائی ملک سے باہر تھے اور دو اپنی نوکریوں کے سلسلے میں  
دوسرے شہروں میں مقیم تھے۔ احمد کے جانے کے بعد وہ  
خود بھی نوکری کرنے لگیں۔ پانچ سال کی مسلسل محنت کے  
بعد وہ اس قابل ہوئیں کہ شہر کے پوش علاقے میں پانچ

اخلاق اور کردار کو چھپانے میں ناکام رہتا ہے، برینڈڈ کپڑے اور بیگ خریدنے کے لیے کمیشیاں ڈالتیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں ملک سے باہر گزارنے کے لیے قرض لیتیں لیکن جاتیں ضرور اور پھر فیس بک پر اپنے ایک ایک مل کی تصویریں اپ لوڈ کر کے دوسروں کو متاثر کرنے میں لگی رہتی تھیں۔

احمر بھی اب فیجر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ بچہ اچھے پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ وہ چاہتیں تو قناعت کے ساتھ اچھی زندگی گزار سکتی تھیں پھر بھی مسز علیہ احمر مطمئن نہ تھیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھیں۔ اپنے جھوٹے رکھ رکھاؤ اور دکھاوے کو برقرار رکھنے کے چکر میں اکثر مالی تنگی کا شکار رہتیں۔ ان کے نزدیک احمر کی حیثیت بھی دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی تھی، جسے وہ تین میں شمار کرتیں تاہم میں۔ انہوں نے اپنے سرسالی رشتہ داروں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ بھلے ذہنی سکون سے محروم تھیں، تاہم کسی نہ کسی طرح انھوں

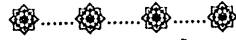
مر لے کا ایک گھر بنا سکیں۔ اس دوران ان کا دوسرا بیٹا بھی دنیا میں آ گیا تھا۔ گھر بننے ہی احمر ہمیشہ کے لیے واپس آ گیا۔ احمر کا یہ فیصلہ مسز علیہ احمر کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

”تم کنوئیں کے مینڈک ہی رہنا..... تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ اپنا لائف اسٹائل بہتر کر سکو۔ ابھی گھر ہی بنا ہے، گاڑی رہتی ہے، گھر کو فرش کرنا ہے مگر نہیں چھیں تو واپس آنے کی جلدی تھی۔“ وہ احمر پر چڑھ دوڑیں مگر احمر اپنے فیصلے پر ڈٹ گئے۔

مسز علیہ احمر انہیں تو واپس نہ بھیج سکیں لیکن خود اپنی جاب کے حوالے سے اتنی حساس ہو گئیں کہ ہر جائز ناجائز حربہ استعمال کر کے وہ آج میجر کے عہدے پر فائز ہو گئی تھیں۔ مسز علیہ احمر ان خواتین میں سے تھیں جو برینڈڈ اور اپر کلاس لائف اسٹائل کو اپنانے کے چکر میں بعض اوقات اپنے آپ سے بھی اتنے دور نکل جاتے ہیں کہ ان کا کردار اور اخلاق پستیوں کی طرف سفر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ یہ بات بھول کر کہ قیمتی سے قیمتی لباس بھی گھٹیا



نے اپنا شاندار لائف اسٹائل برقرار رکھا ہوا تھا۔



کوثر مسز علیہ احمد کے ہاں پچھلے دس سال سے کام کر رہی تھی۔ وہ ایک بیوہ عورت تھی۔ اس کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ جب وہ مسز علیہ احمد کے ہاں آئی تھی تو اس کی بیٹی بارہ سال کی تھی۔ کوثر ایک خوددار اور قناعت پسند عورت تھی۔ جو اپنے کام کو عبادت سمجھ کر کرتی تھی صبح وقت پر آتی اور شام کو اپنا کام پورا کر کے وقت پر ہی چلی جاتی۔ کبھی چھٹی کرنا ہوتی تو پہلے بتا کر جاتی۔ مسز علیہ احمد کو کبھی اس سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی اور سب سے بڑھ کر وہ بلا ضرورت چھٹی بھی نہیں کرتی تھی اور نہ ہی اسے مانگنے تا لگنے کی عادت تھی۔ کبھی مسز احمد موڈ میں ہوتیں تو اپنے کچھ پرانے کپڑے اور سامان نکال کر خود ہی اس کے حوالے کر دیتیں جسے وہ شکریے کے ساتھ لے لیتی مگر خود کبھی کسی چیز کا سوال نہیں کیا تھا۔ اتوار کو اس کی چھٹی ہوتی تھی۔

”بابی اگلے مہینے میری بیٹی کی شادی ہے۔ میں نے اپنی اماں کے ساتھ میٹھی ڈالی ہوئی تھی۔ اس مہینے میری میٹھی نکل آئی ہے اماں بیمار ہیں اس لیے وہ مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں میٹھی لے جاؤں۔ اس لیے میں ہفتے کو نہیں آؤں گی۔“ کوثر نے چھٹی کے وقت مسز علیہ احمد کو مخاطب کیا۔ کوثر کی اماں کسی گاؤں میں رہتی تھی۔

”اچھا“ مسز علیہ احمد نے اسے ایک نظر دیکھا اور دوبارہ سے لیپ ٹاپ پر مصروف ہو گئیں۔ وہ اس سال دیہی کالینڈر پر پلان کر رہی تھیں۔ ان کی تین لاکھ کی میٹھی نکلی تھی۔ پوری میٹھی کے ساتھ دی جانے میں کل خرچ تقریباً پانچ لاکھ روپے آ رہا تھا۔ دو لاکھ روپے بینک سے ادھار لے کر یہ ٹرپ کرنے کا ایکا ارادہ کر چکی تھیں۔ اب بھی وہ لیپ ٹاپ پر دیہی کے مشہور مقامات کے بارے میں معلومات حاصل کر رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے کوثر تم جاؤ۔“ جب مسز احمد کے اچھا کے بعد لمبی خاموشی چھا گئی تو اجازت کی منتظر کوثر کو کھڑے دیکھ

کر اصرار نہ کیا۔

”آپ سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ نوکروں کے معاملے میں مت بولا کریں۔“ وہ تپ گئیں۔

”تم بھی تو حد کرتی ہو وہ تو ہمارے جواب کی منتظر تھی اور تم لیپ ٹاپ میں گم ہو۔“ احمد نے بھی تپا سا جواب دیا۔

”تو آپ کو کیا ہر دہری ہو رہی ہے؟“

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ احمد اٹھ کر چلے گئے۔

”ماما..... ہم دہری جا رہے ہیں ناں؟“ ناشتے کی میز پر ان کے بڑے بیٹے نے ماں سے سوال کیا۔

”جی میری جان ضرور جائیں گے۔ آپ جاؤ اب جا کر ٹی وی دیکھو۔“ گرمیوں کی چھٹیاں تھیں سو بچے بھی آرام سے اٹھتے تھے۔ آج تو اتوار تھا اس لیے سب ہی تاخیر سے اٹھے تھے۔

”احمد..... کل تم ذرا جلدی آ جانا۔ ویزے کے لیے اہلائی کرنے جانا ہے۔“ انہوں نے اخبار پڑھتے احمد کو متوجہ کیا۔ انہوں نے اخبار طے کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ دیر مسز علیہ احمد کو اسے دیکھتے رہے جو اور بج جوس کے سب لے رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اس سال ہم دیہی کا ٹرپ کینسل کر دیتے ہیں۔“ احمد نے محتاط سے انداز میں بات کا آغاز کیا۔

”کیوں؟“ وہ تپ اٹھیں۔

”کوثر کی بیٹی کی شادی ہے۔“ یتیم بچی ہے۔ ان پیسوں سے ہم اس کی مدد کر دیتے ہیں۔“

”کیا مطلب.....! کوثر کو تین لاکھ روپے دے دوں؟“ انہیں احمد کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

”نہیں، میٹھی میں سے ایک لاکھ روپے کوثر کو دے دیتے ہیں۔“

”کس خوشی میں؟“ مسز علیہ احمد نے ان کی بات کاٹی۔

”کوثر پچھلے دس سال سے ہمارے ہاں ملازم ہے۔“

ضرورت مند اور خود وار بھی ہے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتی۔ اس کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ ملازموں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ اس کی پنچی یتیم ہے۔ یتیموں کی مدد کرنا تو ایسے بھی ثواب کا کام ہے۔“ احمر نے رسان سے کہا۔

”تم تو رہنے ہی دو۔ پورے سال کی تھکن اتارنے کا ایک موقع ملتا ہے وہ بھی تم خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ کر دیں گے کوثر کے لیے بھی کچھ۔“ انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

مسز علیہ احمر کی پوری فیملی پندرہ روز کے لیے دیہی چلی گئی۔ وہاں خوب ہلا گلا، سیر و تفریح اور شاپنگ کی۔ مسز علیہ احمر نے ایک ایک لمحے کی تصاویر فیس بک پر اپ لوڈ کیں۔ ہر لمحے سے لطف اندوز ہو کر سب پندرہ روز بعد واپس آ گئے۔

”ارے..... ہاں ہاں، صرف پانچ لاکھ میں پورا بیچ تھا۔ بس ایسا ہی ہے۔ اتنے تھوڑے پیسوں میں ایسی موج مستی ہو گئی کہ بس پورے سال کی تھکاؤٹ اتر گئی۔ ہاں پیر سے میں آفس آؤں گی۔“ وہ اپنی کو لیگ کو بتا رہی تھیں۔ آج کل وہ بہت ہی فریش اور خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

شام کا وقت تھا۔ کوثر اپنا سارا کام مکمل کر چکی تھی۔ مسز علیہ احمر آفس سے آنے کے بعد اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ احمر لاؤنج میں بیٹھنے چائے پی رہے تھے اور ساتھ ساتھ ٹی وی بھی دیکھ رہے تھے۔ کوثر یکن میں بیٹھ کر مسز علیہ احمر کے باپ پر آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اگلے ہفتے اس کی بیٹی کی شادی تھی۔ شادی گاؤں میں ہوتا تھی۔ اس لیے اسے ایک ہفتے کی چھٹی چاہیے تھی۔ جونہی مسز علیہ احمر باہر آئیں کوثر فوراً ان کے پاس آئی اور اپنا مدعا بیان کیا۔ ”مبارک ہو کوثر، تم خوش خوش جاؤ۔ اچھا پہلے کمرے سے میرا پرس اٹھا لو۔“ وہ احمر کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ اتنے میں کوثر ان کا پرس لے آئی۔



”یہ میری طرف سے رکھ لو..... پورے دس ہزار روپے

ہیں۔ بیٹی کے لیے کچھ خرید لینا۔“ مسز علیہ احمر نے ایک لفافہ کوثر کی طرف بڑھایا۔ کوثر نے لفافہ پکڑا اور سلام کر کے رخصت ہو گئی۔ احمر ان کو حیرت بھری نظروں سے تنک رہے تھے۔

”یہ روپے کہاں سے آئے؟ دیہی کی سیر اور شاپنگ کے چکر میں تم نے تو میرا اکاؤنٹ بھی خالی کر دیا تھا۔“ احمر جو کوثر کی مدد نہ کر سکنے پر دل ہی دل میں شرمندہ تھے، کہے بنانہ رہ سکے۔

”میں نے کہا تھا ناں کہ کچھ نہ کچھ کر لیں گے تو بس کر لیا۔“ وہ اتر آئیں۔

”پھر بھی.....“

”بھی میں نے اپنے کو لیگز اور ماتحتوں تک یہ پیغام پہنچایا کہ ایک یتیم پنچی کی شادی ہے تو جتنا کسی سے ہو سکے مدد کر دے۔ یتیم پنچی کی شادی کا سن کر سب نے ثواب کے لالچ میں کچھ نہ کچھ دے دیا اور یوں میرے پاس دس ہزار روپے جمع ہو گئے جو میں نے کوثر کو دے دیے۔ دیکھ لو اتنی بڑی رقم اکٹھی دیکھ کر کوثر کیسے خوش خوشی گئی ہے۔“ مسز علیہ احمر نے ”اتنی بڑی رقم“ پر زور دیا۔ وہ اپنے کارنامے پر پھولنے نہیں سارا رہی تھیں۔

”دس ہزار اور اتنی بڑی رقم..... واہ کیا معیار ہیں ہم مادی چیزوں کے پیچھے بھاگنے والے انسانوں کے..... اپنے نفس کو خوش کرنے کے لیے جب ہم خود پر خرچ کرنے لگیں تو لاکھوں روپے بھی معمولی رقم دھتی ہے اور اللہ کی راہ میں دینا ہو تو وہ دس ہزار جن میں ہماری اپنی جیب سے ایک روپیہ بھی شامل نہیں ہو، بہت بڑی رقم لگتی ہے۔“ احمر ان کی اس حرکت پر دکھ سے سوچ کر رہ گئے تھے۔

# میاں صدق

میمونہ رومان

پارس شاہ..... چکوال

چاندنی، چاند کی ستاروں کی  
خوشبو پھولوں کی رت بہاروں کی  
عید کا چاند جب نکلتا ہے  
یاد آتی ہے اپنے پیاروں کی  
نوشتی..... بدرمجان

اک تغافل سے، اک توجہ تک  
عشق آنسو بھی ہے تبسم بھی  
امبرگل..... جھڈو، سندھ

تم نے تو کہہ دیا کہ محبت نہیں ملی  
مجھ کو تو یہ بھی کہنے کی فرصت نہیں ملی  
پھر اختلاف رائے کی صورت نکل پڑی  
اپنی یہاں کسی سے بھی عادت نہیں ملی  
شمینہ شیش عرف نیا شیش..... گوجرانوالہ  
ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدایا پر ہو  
طلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

حافظ سمیرا..... 157 این بی

ہزار چہروں میں ملی مجھے مشابہت اس کی  
پردل کی یہ ضد کہ وہ نہیں تو اس جیسا بھی نہیں  
تکلیف عمراں..... چچہ وطنی

مجھے لہجوں کے بدلنے سے ہمیشہ خوف آتا ہے  
کہ لہجے جب بدلتے ہیں کوئی اپنا نہیں رہتا

منشیہ نواز..... کجرامہ

کبھی خوشی، کبھی غم دے کر آزماتا ہے  
میرا رب مجھے حسبِ حال دیتا ہے  
اسی نے چاند ستاروں کو بخش دیا ہے ضیاء

وہی جورات کون سے اجال دیتا ہے

ماروی یاسمین..... سرگودھا

اے زندگی تو ہی بتا تجھے کیسے پیار کروں  
تیری تو ہر سانس میری عمر گھٹا دیتی ہے  
نادیہ یاسین..... ساہیوال

مٹ جائے گناہوں کا تصور ہی جہاں سے اقبال  
اگر ہو جائے یقین کہ خدا دیکھ رہا ہے  
فائزہ بلال اقرآفرین..... جام پور پنجاب  
بھیڑ اتنی تو نہ تھی شہر کے بازاروں میں  
مجھے کھونے والے تو نے کچھ دیر تو ڈھونڈا ہوتا  
منزہ بھٹی..... پٹوکی

میرے حصے میں کتا ہیں نہ کھلونے آئے  
خواہش رزق نے چھینا ہے میرا بچپن، مجھ سے  
نورین لطیف..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

روز آتے ہیں بادلِ بردِ رحمت لے کر  
میرے شہر کے اعمال انہیں برسنے نہیں دیتے  
سمیرا تجبیر..... سرگودھا

ضبط کی کون سی منزل تھی کس مقام پر آ کر ہارے ہیں  
اتنا تو مجھے معلوم ہی تھا تمہارے نام پر آ کر ہارے ہیں  
کب جیت کا دعویٰ ہم نے کیا یہ ازل ابد کا قصہ ہے  
ہم بے خبری کے عالم میں انجام پر آ کر ہارے ہیں  
فیض آصف خان..... ملتان

ساون تو باہر برستا ہے  
دل کیوں اندر روتا ہے؟  
نوزیہ سلطانی..... تونسہ شریف

منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا  
بڑا کٹھن ہے خزاں کے ماتھے پر داستانِ گلاب لکھنا  
پروین افضل شاہین..... بہاولنگر

عید کا رنگ چہرے سے چھپاؤں کیسے  
تو میری روح میں ہے کہیں ڈھونڈنے جاؤں کیسے  
میرا ہر دن تیری چاہت میں بنا عید کا دن  
میں فقط ایک ہی دن مہندی لگاؤں کیسے

نادیہ عباس، دیا قریشی، آورش نایاب..... موسیٰ خیل  
خوشبو سے، ہواؤں سے نہیں ملتے کچھ لوگ  
موسم کی اداؤں سے نہیں ملتے کچھ لوگ  
مل جائیں تو جیون کو سجا دیتے ہیں لیکن  
کھوجائیں تو دعاؤں سے نہیں ملتے کچھ لوگ  
آمنہ امداد..... سرگودھا

کس کی مجال ہے کہ ہم کو خریدتا  
ہم خود ہی بک گئے خریدار دیکھ کر  
کوثر مہربین گل..... اورنگی ناؤں کراچی

تمہیں جب کبھی ملیں فصیح میرے دل سے بوجھ اتار دو  
میں بہت دنوں سے اداس ہوں مجھے کوئی شام ادھار دو  
مجھے اپنے روپ کی دھوپ دکھ چکا انھیں میرے خال و خد  
مجھے اپنے رنگ میں رنگ لو میرے سارے رنگ اتار دو

ماریہ انصاری..... کراچی

غریب شہر پہ تہمت تراشنے والو  
امیر شہر کا چھٹی شجرہ نسب دیکھو  
شازیہ فریحہ شیم..... شاہ کلڈر

کوئی ہمدرد نہ تھا، کوئی بھی درد نہ تھا  
اچانک ایک ہمدرد ملا پھر اسی سے ہر درد ملا  
صدیقہ خان..... باغ آزاد کشمیر

ذرا سا ہٹ کہ چلتا ہوں زمانے کی روایت سے  
کہ جن پہ بوجھ ڈالوں وہ کاندھے یاد رکھتا ہوں

طیبہ..... انک

استاد عشق سچ کہا بہت نالائق ہوں میں  
مدت سے اک ہی شخص کو یاد کر رہا ہوں  
کنزہ رحمان..... رخ جنگ

صحرا کے سمندر میں تو میرے ساتھ ساتھ چل  
میں تیری راہوں میں پھول بن کر کھرجاؤں گی  
انام ربیم..... شادیوال گجرات

کوئی وعدہ نہیں پھر بھی انتظار تھا  
دور ہونے پر بھی اپنے پیار پر اعتبار تھا  
نہ جانے کیوں بے رخی کی اس نے ہم سے

کیا ہم سے بھی زیادہ کوئی اس کا طلب گار تھا  
کرن شہزادی..... مانسہرہ

آنکھوں میں رہا دل میں اتر کر نہیں دیکھا  
کشتی کے مسافر نے سمندر نہیں دیکھا  
پتھر مجھے کہتا ہے میرا چاہنے والا  
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا  
مشفی خان..... بھیرکند، مانسہرہ

نہ تھی کوئی رنجشیں بس عادتوں میں تضاد تھا  
اسے پسند نہیں شوخیاں ہمیں سادگی میں کمال تھا  
طاہرہ منور علی بھٹی..... کبیر والہ

میری زندگی کی کتاب کا ہے ورق ورق یوں سجا ہوا  
سر ابتداء، سر انتہا تیرا نام دل پہ لکھا ہوا  
ثمرانہ فضل..... پاک گیٹ ملتان

عنوان محبت پہ ہم بس اتنا ہی لکھ پائے  
بہت کمزور رشتے تھے، بہت مضبوط لوگوں کے  
محمد یاسر..... گکومندی

کلی کی طرح بلند ہیں سب حوصلے میرے  
کشتی بھنور میں ہے کردار تو نہیں  
ارم صابرہ..... تلہ گنگ

قدموں میں تھکن تھی، گھر بھی قریب تھا  
برکھا کریں کہ اب کے سفر ہی عجیب تھا  
نکلے اگر تو چاند دیتے ہیں رک بھی جائے  
اس شہر بے چراغ میں کس کا نصیب تھا

تانیہ انصاری..... ڈسکہ

ہمیں یہ زعم کہ ہم حسن کے مصور ہیں  
انہیں یہ ناز کہ تصویر تو ہماری ہے





# دش مختار

طلعت آغاز  
تج کے بالائی دار کباب

چٹنی کے ساتھ تناول فرمائیں نہایت لذیذ معلوم ہوگا۔  
نزهت جبین ضیاء..... کراچی  
گولا کباب

اجزاء:-

قیمہ  
کچا پیٹا  
لونگ  
جاوڑی  
خشخاش  
بھنا چٹنا پسا ہوا  
ہرا دھنیا  
ادرک  
پیاز  
ترکیب:-

قیمہ میں نمک اور پیٹا پیس کر ملا لیں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں پھر اس میں باقی تمام مصالحے پیس کر اور ہرا دھنیا، پودینہ اور بار پک کٹی ہوئی پیاز ملا دیں یا درگیل مصالحے پیستے ہوئے زیادہ پانی نہ ڈالیں۔ سب کچھ ملانے کے بعد دو گھنٹے تک رکھ دیں پھر گول نکلیا کر کٹھی میں فرنی کر لیں، بہت ہلکی آنچ پر ایک وقت میں چار سے زیادہ نہ ڈالیں۔ اسی طرح تمام گولا کباب تل لیں۔

ارم صابروہ..... تلہ گنگ

پارچہ کباب

اجزاء:-

گائے کے پسندے  
پسا ہوا کچا پیٹا  
پسا ہوا ہن ادرک  
پسی ہوئی لال مرچ  
بھنا اور پسا ہوا دھنیا  
پیاز تلی اور پسی ہوئی  
پسا ہوا گرم مصالحہ  
دہی

اجزاء:-

روکھا قیمہ  
پسا ہوا گرم مصالحہ  
ادرک  
پیاز  
ہری مرچیں  
پودینہ  
دودھ کی بالائی  
کھی  
ہرا دھنیا  
لال مرچ  
نمک  
کچا پیٹا  
ترکیب:-

سب سے پہلے قیے کو سل پر پیسیں (اس کا زیادہ سے زیادہ بار پک ہونا بے حد ضروری ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوگا تو کباب ٹوٹ جائیں گے) پھر اس میں سب مصالحے ملا دیں انہیں بھی بہت بار پک پیسا گیا ہو، اس مرکب میں ادرک، پیاز، ہری مرچیں، دھنیا اور پودینہ بھی بہت بار پک کاٹ کر ملا دیں۔ دوسرا مرحلہ یہ ہوگا کہ قیے اور مصالحے کے آمیزے میں ساری بالائی اور آدھا کھی شامل کر دیں۔ ان سب اجزاء کو کسی گچھے یا قلعگیر سے خوب اچھی طرح ملا لیں اور اسے کافی دیر تک اسی حالت میں پڑا رہنے دیں۔ اس کے بعد اسے ایک بار پھر ملا لیں اور آخری مرحلہ یہ ہوگا کہ اسے سینوں پر چڑھا لیں اور دہیتے ہوئے کوکلوں کی آگ پر پکا کر لال کر لیں۔ درمیان میں گھی ڈکاتے جائیں۔ پیاز اور نمک کی

افغانی نمکین بوٹی

اجزاء:-

بکرے کا گوشت بون لیس  
چربی  
سمٹی کالی مرچ  
لہسن کا پیسٹ  
پیتے کا پیسٹ  
پسی دار چینی  
تیل  
نمک  
آدھا کلو  
ایک پاؤ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
آدھا کپ  
آدھا چائے کا چمچ  
دو کھانے کے چمچ  
حسب ذائقہ

ترکیب:-

چربی کے کیوبز کاٹ لیں۔ ایک مکسنگ باؤل میں بکرے کے گوشت کی بوٹیاں، چربی، چمچ کئی کالی مرچ، لہسن کا پیسٹ، پسی دار چینی، نمک اور پیتے کا پیسٹ مکس کر کے ڈیزھ سے دو گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیں۔ اب چربی اور مٹن کو باری کیو اسٹکس پر ایک ایک کر کے لگا میں اور پہلے سے گرم ادون میں بیک کر لیں یا کولوں پر سینک لیں یا پھر فرائی کر لیں۔ آخر میں سیتوں کے ساتھ سرو کریں۔

مہرین خان..... کراچی

مٹن پائے

اجزاء:-

بکرے کے پائے  
ادک لہسن کا پیسٹ  
ملدی  
ثابت گرم مصالحہ  
تیل  
تلی پیاز  
چھ عدد  
دو کھانے کے چمچ  
آدھا چائے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
آدھا کپ  
دو عدد

دو عدد

ایک کھانے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
آدھا کپ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک نمک

پسی لال مرچ  
پسا دھنیا  
دہی  
پسا گرم مصالحہ  
ہرا دھنیا

ایک کھانے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ  
آدھی پیالی  
چھڑکنے کے لیے

بھنا ہوا پساکھو برا  
بھنی اور پسی ہوئی خشکاش  
تیل  
ہرا دھنیا

ترکیب:-

پسندوں کو کسی بھاری چیز کی مدد سے ہلکا ہلکا پچل لیں۔ پسندوں میں تمام اجزاء ملا کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ کڑا ہی میں تیل گرم کریں اور پسندوں کو اس میں پھیلا میں اور ڈھکن ڈھانک کر درمیانی آنچ پر پکانیں، مزیدار پارچہ کباب ہرا دھنیا چھڑک کر پیش کریں۔

طلعت نظامی..... کراچی

سیخ کباب

اجزاء:-

بیف کا قیمہ  
نمک  
دہی  
ادک لہسن کا پیسٹ  
ہرا دھنیا  
زیرہ  
سکھی  
آدھا کلو  
حسب ذائقہ  
آدھی پیالی  
دو کھانے کے چمچ  
آدھی گھی

ایک چائے کا چمچ  
چوتھائی کپ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک کپ  
دو عدد

چھ سے سات عدد  
ایک چائے کا چمچ  
دو عدد

جا آفل جاوتری  
تلی پیاز  
پسی ہوئی پیاز  
ہری مرچ  
پسا گرم مصالحہ  
کونکہ

ترکیب:-

قیمے میں نمک، دہی، ادک لہسن کا پیسٹ، ہرا دھنیا، زیرہ، جا آفل، جاوتری، پسی پیاز، ہری مرچ اور پسا گرم مصالحہ ڈال کر اچھی طرح پیس لیں۔ اب سیخ کباب بنا کر آگاہشی پر سینک لیں۔

عائشہ فرحان..... بہاول پور

اجزاء:-

پیاز 6 عدد (کاٹ لیں) سوئے، حسب ذائقہ  
ہرا دھنیا آدھی گٹھی (کاٹ لیں)  
نمک اور سرخ مرچ حسب ذائقہ  
ادرک 2 کانگڑا پیس لیں  
ترکیب:

مٹر آدھا کلو  
چاول ڈھائی کلو  
نمک حسب ذائقہ  
ادرک لمبن پسا ہوا ایک کھانے کا چمچ  
آلو تین سے چار عدد  
پیاز دو عدد درمیان  
ٹماٹر دو عدد درمیان  
لال مرچ پیسی ہوئی ایک کھانے کا چمچ  
پسا ہوا دھنیا ایک چائے کا چمچ  
ہلدی ایک چائے کا چمچ  
چکن پاؤڈر ایک کھانے کا چمچ  
کونگہ آمل چار کھانے کے چمچ

ترکیب:-

پیسی ہوئی دال میں پیاز، سوئے، سفید زیرہ، نمک مرچ،  
لمبن، ادرک اور ہرا دھنیا ملا کر یک جان کر لیں۔ اب  
کڑاہی میں گھی گرم کریں اور تمام مصالحے کے چھوٹے  
چھوٹے بانر گرو بنائیں اور کڑاہی میں ڈالتے جائیں۔ جب  
سرخ ہو جائے تو کشمیری چائے کے ساتھ پیش کریں اور داد  
لیں۔

ناہید غفور..... گنگا پور

چنے کی دال کے پکڑے

اجزاء:

چنے کی دال آدھا کلو (رات بھر بھگو کر پیس لیں)  
پیاز 6 عدد (کاٹ لیں) سوئے، حسب ذائقہ  
ہرا دھنیا آدھی گٹھی (کاٹ لیں)  
نمک اور سرخ مرچ حسب ذائقہ  
ادرک 2 کانگڑا پیس لیں  
ترکیب:

پیسی ہوئی دال میں پیاز، سوئے، سفید زیرہ، نمک مرچ،  
لمبن، ادرک اور ہرا دھنیا ملا کر یک جان کر لیں۔ اب  
کڑاہی میں گھی گرم کریں اور تمام مصالحے کے چھوٹے  
چھوٹے بانر گرو بنائیں اور کڑاہی میں ڈالتے جائیں۔ جب  
سرخ ہو جائے تو کشمیری چائے کے ساتھ پیش کریں اور داد  
لیں۔

ہالہ سلیم..... کراچی



مٹر کے دانوں کو جو کر چھلنی میں رکھ لیں، پیاز اور ٹماٹر کو  
باریک کاٹ لیں آلوؤں کو چھیل کر دو ٹکڑے کر لیں چاولوں کو  
دھو کر تین منٹ کے لیے بھگو کر رکھ دیں۔ پٹن میں تیل ڈال  
کر پیاز کو سنہری فرائی کر لیں پھر اس میں ادرک لمبن ڈال کر  
فرائی کریں۔ لال مرچ، دھنیا، ہلدی اور ٹماٹر ڈال کر اتنی دیر  
فرائی کریں کہ ٹماٹر اچھی طرح گل جائیں آلو ڈال کر ہلکا سا  
بھوئیں اور آدھی پیالی پانی ڈال کر ہلکی آٹھ پر بھلے رکھ دیں۔  
آلو گل جائیں تو مٹر اور چاول ڈال کر بھوئیں پھر تین پیالی گرم  
پانی میں چکن پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور اسے  
چاولوں پر ڈال دیں۔ ڈھک کر درمیان آٹھ پر پکائیں اور  
جب پانی خشک ہونے پر آجائے تو چاولوں کو الٹ پلٹ  
کر کے ہلکی آٹھ پر دم پر رکھ دیں۔ گرم گرم تمہاری کوشش میں  
نکال کر دوپہر کے کھانے پر اچار اور رائتے کے ساتھ پیش  
کریں۔

فائزہ ملک..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

چنے کی دال کے پکڑے

اجزاء:

www.naeyufaq.com

چنے کی دال (رات بھر بھگو کر پیس لیں) آدھا کلو

ترکیب:-  
 چھ عدد  
 ایک ٹکڑا  
 حسب ضرورت  
 ہری مرچ  
 کٹی اور ک  
 نمک  
 ترکیب:-

پاؤں میں ایک کھانے کا چمچ اور ک لہسن کا پیسٹ، نمک،  
 ہلدی اور ثابت گرم مصالحہ ڈال کر اچھی طرح ابال لیں۔ گلنے  
 پر تیل گرم کر کے پیاز براؤن کریں اور نکال کر پیس لیں۔ اب  
 ایک چائے کا چمچ اور ک لہسن کا پیسٹ، پیسی لال مرچ اور پیسا  
 دھنیا ڈال کر بھونیں۔ اس کے بعد پائے شامل کر کے دوبارہ  
 بھول لیں پھر تلی اور پیسی ہوئی پیاز، دہی اور پیسا گرم مصالحہ ڈال  
 کر بھون لیں۔ آخر میں پہلے سے بچی ہوئی چٹنی شامل کر کے  
 ہلکی آج پر پکائیں اور نان کے ساتھ سرو کریں۔

یعنی آفتاب..... لاہور

پیشی روٹی اور لہسن مرچ کی چٹنی

اجزاء:-

لہسن  
 ثابت گول مرچ  
 اناروانہ  
 زیرہ پسا ہوا  
 اجوائن  
 پیاز کتری ہوئی  
 ہری مرچ کتری ہوئی  
 ہرا دھنیا کتری ہوا  
 ہری پیاز کتری ہوئی  
 دودھ  
 بینس  
 گندم کا آٹا  
 چھ عدد  
 دس عدد  
 نصف چائے کا چمچ  
 نصف چائے کا چمچ  
 دو چٹکی  
 آدھا کپ  
 دس عدد  
 آدھا کپ  
 ایک عدد  
 آدھا کپ  
 ایک پاؤ  
 آدھا پاؤ

ترکیب:-

بینس، آٹا، بھنا زیرہ، نمک، پیاز، ہری مرچ، ہری پیاز  
 اور ہرے دھنیے ایک چمچ تیل کے ساتھ سوکے بینس، آٹے  
 میں ملا دیں پھر دودھ ڈال کر آٹا میزہ بنائیں اور تھوڑے سے نیم  
 گرم پانی کے ساتھ سخت گوندھ لیں اس کے مناسب سائز  
 کے پیڑے بنا کر توڑے پر گھی کے ساتھ فرانی کر لیں، لہسن،  
 گول مرچ اور اناروانہ کو پیس لیں اور گھی وکھن میں اس چٹنی  
 کو فرانی کر لیں اور بینسی روٹی کے ساتھ آم کا میٹھا اچار بھی رکھ  
 دیں۔

صغریٰ نورین، شہزادی کنول..... جڑانوالہ

مشر تھاری

شہزادی فرخندہ..... خانیوال

لاہوری پائے

اجزاء:-

پائے  
 پیاز  
 ٹماٹر  
 ہری مرچ  
 ہرا دھنیا  
 اور ک  
 لہسن اور ک کا پیسٹ  
 نمک  
 لال مرچ  
 ہلدی  
 زیرہ پاؤ ڈر  
 دھنیا پاؤ ڈر  
 گرم مصالحہ  
 تیز پات  
 لونگ  
 دار چینی  
 گھی  
 دو عدد  
 ایک عدد  
 تین عدد  
 تین عدد  
 گارنیشنگ کے لیے  
 ایک چھوٹا ٹکڑا  
 تین کھانے کے چمچ

حسب ذائقہ

ایک کھانے کا چمچ  
 آدھا چائے کا چمچ  
 ایک کھانے کا چمچ  
 ایک کھانے کا چمچ  
 دو کھانے کے چمچ

دو عدد

چار عدد

دو چھوٹے ٹکڑے

آدھا کپ

# نیرنگ خیال

## ایمان وقار

سورۃ فاتحہ

اللہ کے نام سے میں کرلوں دل کی صفایا  
رحمن ہے، رحیم ہے، ہر شے ہے اس کی مایا  
سب خوبیاں اسی کی جو سارے جہاں کا مالک  
رحمن، رحم والا روز جزا کا سایہ  
کریں تیری ہی عبادت تجھ سے ہی مدد مانگیں  
تو ہی ہے جس نے سب کو سیدھی راہ پر چلایا  
احسان تیرا جن پر ان سے ہمیں ملایا  
جن پر غضب ہے تیرا ان سے ہمیں بچایا  
بہکے ہوؤں سے کوثر کو مولا تو دور رکھنا  
تیری خاص عطا، کرم ہے مجھے حمد پر لگایا  
کوثر خالد..... جزا نوالہ

بے وفا کہلاؤں گی

تم مجھے دھوکہ دے کر بھی با وفا بن بیٹھے ہو  
اگر میں تجھے بھلا دوں تو بے وفا کہلاؤں گی  
دستور زمانہ ہے تم پہ کوئی الزام نہ آئے گا  
تم بھی سنگ دل مجھ کو کہو گے اگر تجھ کو بھول جاؤں گی  
سب سے کہتی ہوں کہ تم بے قصور ہو  
اگر سچ بول دیا زمانے میں رسوا ہو جاؤں گی  
تم نے دل سے نکال دیا مجھ کو ظالم  
تیری محبت کے بنا رہ کر تجھے دکھاؤں گی  
اے دوست میں کبھی یاد نہ کروں گی تجھے  
اور بھول کر بھی تیری ٹکلی میں نہ آؤں گی  
تیری سزا کے واسطے یہ فیصلہ کر دیا میں نے  
اپنے دل کا ساٹھی کسی اور کو بناؤں گی

خواہش دل کی تھی زندگی گزاروں تیرے سنگ میں  
اب سوچا ہے اپنا گلشن الگ مہکاوں گی  
جتنے بھی آنسو تھے سب بہا دیے تیری یاد میں  
دکھ درد بھول کر اب میں مسکراؤں گی  
نجم انجم کی خوشیاں اسے لوٹا دے خدایا  
میں تیرے در پر حاضری دوں گی اور شکر بجالاؤں گی  
نجم، نجم اعوان..... کراچی

چاہتی ہوں

اپنے گمشدہ کا گمان چاہتی ہوں  
جرم محبت کا بیان چاہتی ہوں  
میرے ہمنوا بہت پوشیدہ رکھا حالی دل مگر  
راہ محبت اب عیاں چاہتی ہوں  
ذرا حسرت تو ملاحظہ ہو دل خوش فہم کی  
گویا کافر کو صاحب ایمان چاہتی ہوں  
دست بریدہ لیے پھرتی ہوں تیری ٹکلیوں میں  
کچھ پل کو تیرا دھیان چاہتی ہوں  
بس اک ہی تمنا ہے دلِ ناتواں کی  
گرمی الفت تیری رگ و جان میں رواں چاہتی ہوں  
جو نبض میری رکے تو سانس تیری ٹوٹے  
کچھ ایسا تعلق اپنے درمیان چاہتی ہوں  
وہ جو ہم میں تم میں عشق تھا وہ کب سے حنوط ہے  
اس گمنام عشق کا کوئی نشان چاہتی ہوں  
کنول میری بے انت چاہت کی حسرت تو دیکھیے  
تو چاہے دل و جان سے میں صرف اتنا چاہتی ہوں  
مدیر کنول سرور..... چشتیاں

بہرم

تیری محبت کا  
بھر رکھتے ہوئے  
اے جانان  
شمرہ آج بھی  
تنہا ہی زندگی  
گزار رہی ہے

شرہ گلزار..... کوئی، سحرات

ہجر

جانِ جانان ترے ملنے کی  
خوشی میں

میں اس قدر مسرور ہوں  
کہ جی چاہتا ہے کہ آسمان  
پر جتنے

بھی تارے ہیں وہ میرے  
آنکھ میں آ کر میری  
خوشیوں

میں برابر کے شریک ہوں  
کیونکہ انہوں نے بھی تو  
ہجر کی تمام راتیں  
میرے سنگ  
جاگ کر گزاری ہیں

نعیم انصرا شامی..... جھنگ

حیات

ٹٹمٹاتا دیا بنی ہے حیات  
آ بھی جاؤ کہ مجھ چلی ہے حیات  
اب نہ اس کو کبھی جگانا تم  
بھول بیٹھی ہے، سو چکی ہے حیات  
آندھیوں سے کبھی نہیں بھی ڈری  
اب تو انسان سے ڈر گئی ہے حیات  
موت سے اس نے دوستی کر لی  
زندگی سے بہت لڑی ہے حیات  
اتنا تقسیم اس کو ہونا نہ تھا  
جتنے خانوں میں بٹ گئی ہے حیات  
اس کو بڑھ کر سمیٹ لو جانان  
پھر نہ کہنا بکھر گئی ہے حیات  
اب تو تازہ ہوا بھی ملتی نہیں  
اس ترقی پہ ہنس رہی ہے حیات  
بات کرنے کا ہم کو وقت نہیں

ہم کو کیسی کنول ملی ہے حیات

یا سکین کنول..... پسرور

زہرِ ندامت

کبھی اک راہ چلتا ہوں  
کبھی سمت بدلتا ہوں  
مگر اک بات ہے ہدم  
میرا راستہ بدلنے سے  
کسی بھی سمت چلنے سے  
منزل تو نہیں ملتی  
کلی دل کی نہیں کھلتی

ہمیشہ خوف رہتا ہے  
دل پہ مجھ سے کہتا ہے  
جدائی ہو نہیں سکتی  
محبت کھو نہیں سکتی  
سنوٹم لوٹ آؤ ناں

ابھی گہری ندامت ہے  
ابھی آنکھوں میں پانی ہے  
مسافریا دکر تاجے

اگر سمجھ جاؤ

میری ماں تو لوٹ آؤ

سید عبادت کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان

مثل خوش رنگ

یوں تو مثل خوش رنگ بہار تھے ہم بھی کبھی  
کھلی جو آنکھ تو قسمت نے یوں دھوکا دیا  
گزر چکی ہے دل ناتواں پر قیامت کبھی کی  
قسمت کا وار دیکھ کر دل بھی یوں گھبرا دیا  
آنکھ بند کرتے بھی پلکوں پر پریاں اترتی تھیں  
دنیا کے رنگ و بود دیکھ کر پریوں کو ہی رلا دیا  
یوں تو تھے ہم بھی کبھی محفل پروانہ شب و روز  
جب دوست بچھڑے تو ساتھ فقط خدا نے دیا  
ہم بھی ایسے نہ تھے کہ دوسروں کے کام آتے  
مر کر خاک ہوئے تو ہر اک نے سکرا دیا

مریم ماہ منیر..... لاہور

تو تم کو مائیں

بے حد محبت بھی جان لیوا  
لے حد عداوت بھی جان لیوا  
کوئی بھی راہ مصلحت نکال لاؤ  
تو تم کو مائیں  
ہوئے ہیں خواب چور کتنے  
ہم کتنے لمحے گنواں چکے ہیں  
اور کتنے آنسو ہیں قرض تم پر حساب لاؤ  
تو تم کو مائیں

وہ میری دلہیز پہ تیرا آنا  
میرے تقدیر کا سیاہ پل تھا  
مجھے لگا تو میرے دل سے نکلی  
کسی دعا کا کوئی شر تھا  
ہے کتنے اپنوں کا مان توڑا  
اور کتنے دل تم دکھا چکے ہو  
اپنے ہر عمل پہ خود کا لکھا نصاب لاؤ  
تو تم کو مائیں

ہے اب نیادن نئی سحر ہے  
نیا سفر، نیا سفر ہے  
ہے میرے رب نے ہاتھ تھا  
نہ کسی بشر کا کوئی ڈر ہے  
میں وہ لہر جو عروج پر ہے  
کوئی غزل جو سرور پر ہے  
چلو مجھ پہ پھر سے زوال لاؤ  
یا میری راہوں میں خار لاؤ  
یا اتم کے رب کا جواب لاؤ  
تو تم کو مائیں

انعم زہرہ..... ملتان

کوئی بات نہیں

ذرا سوچیں تو کوئی بات نہیں  
مایوسی کی کوئی رات نہیں

آزمائشوں کے انبار لگے ہیں  
مگر ہمیشہ ایسی مات نہیں  
سوکھے پتوں سے شجر کا پتے ہیں  
پر سوچو تو ان کے احساسات نہیں  
ذہانت کا سفر بہت کٹھن ہے  
پر کہو تو کوئی شکایت نہیں  
پر سکول و خوش نما لمحے ہوتے ہیں  
مگر ان میں جینے کے لمحات نہیں  
ہر سو درد و تکلیف کے مارے ہیں انا  
جانے کیوں پھر بھی برے حالات نہیں

انا ارشد..... عبدالکیم

مجھے تم یاد آتے ہو

مجھے تم یاد آتے ہو  
کبھی تاروں کی راتوں میں  
کبھی بارش کے موسم میں  
کبھی خوشبو بہاروں میں  
کبھی تم صم نظاروں میں

مجھے تم یاد آتے ہو  
کبھی کلن کی کھن کھن میں  
کبھی چوڑی کی چھن چھن میں  
مجھے تم یاد آتے ہو  
کبھی آنکھوں کے کاجل میں  
کبھی ہونٹوں کی لالی میں  
کبھی ماتھے کی بندیا میں  
کبھی خوشبو زلی میں

مجھے تم یاد آتے ہو  
کبھی ڈائری کتاہوں میں  
کبھی قصے فسانوں میں  
کبھی اپنے بے گانوں میں  
کبھی دل کے آئینوں میں

مجھے تم یاد آتے ہو  
کبھی شاعر کی شاعری میں

کبھی مصور کے رنگوں میں  
کبھی بھیکے لکھوں میں  
کبھی دھڑکن میں، سانسوں میں  
مجھے تم یاد آتے ہو  
فقط تم یاد آتے ہو

تمنا بلوچ..... ڈی آئی خان

اے عشق

اے عشق بڑا جے ظالم اے  
اے خون دے اتھرو رلا چھڈ دا  
اے ہجر دا زہر پلا چھڈ دا  
تے سولی وی چڑھا چھڈ دا  
پہنا کے گھنگھروں پیراں وچ  
اے بلھے وانگ نچا چھڈ دا  
اے عشق کسی دا سنگی نئی  
اے دشمن وانگ ترپا چھڈ دا  
اے مالک اپنی مرضی دا  
اے پاگل دی بنا چھڈ دا  
اے کاسہ پھڑا کے عاشق نوں  
در در دی بھیک منگا چھڈ دا  
اے عشق بڑا جے ظالم اے  
اے خون دے اتھرو رلا چھڈ دا

حنا بشری..... لاہور

عشق محبت

من ہے جل تھل  
آنکھوں سے اوچھل  
دل کے ہے تو پاس پیا  
عشق محبت  
اپنے پن کی  
کرتا ہے تو بات پیا  
جگ کی باتوں کو ہے بھلایا  
بس ہے تیری آس پیا  
کیوں الفت تیری

راس نہ آئے  
یہ مجھ کو ہوتا تو بات پیا  
آہیں کھونہ جاؤ  
اس بھڑ میں تم  
چل تو فقط میرے ساتھ پیا

مدیحہ نورین مہک..... گجرات

غزل

وہ بلائیں تو کیا تماشا ہو  
ہم نہ جائیں تو کیا تماشا ہو  
بندہ پرور جو ہم پہ گزری ہے  
ہم سنائے تو کیا تماشا ہو  
یہ کناروں سے پھیلنے والے  
ذوب جائیں تو کیا تماشا ہو  
وقت کی چند ساعتیں ساغر  
لوٹ آئیں تو کیا تماشا ہو

انتخاب: شاہی رحمان..... مانسہرہ

غزل

مجھے جستجو عشق ہے تیری قربتوں کا سوال ہے  
میں ہوں عشق سے نا آشنا، میری دوستوں کا خیال ہے  
میرا قلم ہے گواہ اس پر، میری شاعری بھی دلیل ہے  
میری سانس جو چل رہی، تیری چاہتوں کا کمال ہے  
میری نگاہ سے تو دور ہے، دل و جاں سے تو قریب ہے  
یہ فراق ہے نہ وصول ہے، تیری شفقتوں کا یہ حال ہے  
تجھے زندگی میں کیا ملا؟ صرف عشق ہی تو نہیں زندگی  
تو نہ خوف کا اس بات کا، تیرے دشمنوں کی یہ چال ہے  
وہ نہ مل سکا تو کیا ہوا؟ کسی اور کا وہ نصیب تھا  
یہ عشق کی نہیں ہار دوست، تیری محبتوں کا زوال ہے  
میری منزل ہے دور بہت، پر میری جستجو کو دوام ہے  
کوئی رنج ہے نہ ملا ہے، میری عاشقی بے مثال ہے  
(شاہزادہ پرویز شانو..... ایبٹ آباد)

مسکرا کے دیکھو

کبھی خود سے بھی مل کر دیکھو



کہیں مل سکیں تو سمیٹ لا میرے روز و شب کی کہانیاں  
جو غبارِ وقت میں چھپ گئیں وہ حکایتیں مجھے چاہیں  
جو خوشیوں کے چراغ تھے جو میری امید کے باغ تھے  
وہی لوگ میری آرزو وہی صورتیں مجھے چاہیں  
تری قربتیں نہیں چاہیے مری شاعری کے مزاج کو  
مجھے فاصلوں سے دوام دے تری فرقتیں مجھے چاہیں  
مجھے کچھ اور نہیں چاہیے یہ دعائیں ہیں میری سائیاں  
کڑی دھوپ میں نہیں مل سکیں تو یہی پھٹیں مجھے چاہیں  
محمد مشرفیات..... جان محمد اسٹیشن والا

دشوار

محبت چھوڑ دینے پر

دلوں کو توڑ دینے پر

عجب دستور ہے صاحب

کوئی فتویٰ نہیں لگتا

نورین لطیف..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

کوئی کھیل

دل لگانا کوئی کھیل ہے کیا؟

آزمانا خود کو کوئی کھیل ہے کیا؟

چھوڑے محبوب تو لوگ تڑپتے ہیں

یادوں سے دل بہلانا کوئی کھیل ہے کیا؟

پچھڑنا لازم ہے امتیاز اس دل لگی میں

پھر بھی جیتنا ایسے کوئی کھیل ہے کیا؟

ڈاکٹر محمد امتیاز احمد چودھری..... گوجرانوالہ



کچھ دیر اپنے لیے جی کر دیکھو  
سنوار کے خود کو بہت سا  
آئینے میں اپنا عکس دیکھو  
بہت رو لیے دوسروں کے لیے  
اب خود کے لیے مسکرا کے دیکھو  
اپنے غرض کے لیے بڑھاتے ہیں جو ہاتھ  
کبھی وہ ہاتھ جھٹک کر بھی دیکھو  
یہ دنیا نہیں رکھتی یاد کسی کے غلوں کو  
نہیں آتا یقین تو آزما کر دیکھو  
اب تک نبھائی ہے جس سے دوستی فزہ  
آج ان سے دشمنی مول لے کے تو دیکھو  
(فلزہ ارشد..... کراچی)

کوئی وصل ہو

کوئی چھاؤں ہو

جسے چھاؤں کہنے میں

دو پہر کا گمان نہ ہو

کوئی شام ہو

جسے شام کہنے میں شب کا کوئی نشان نہ ہو

کوئی وصل ہو

جسے وصل کہنے میں جھرت کا دھواں نہ ہو

کوئی لفظ ہو جسے لکھنے پڑھنے کی چاہ میں

کبھی اک لمحہ گراں نہ ہو

یہ کہاں ہوا ہے کہ ہم نہیں

بھی اپنے دل سے پکارنے کی سعی کریں

وہیں آرزو بے اماں نہ ہو

وہیں موسمِ جاں نہ ہو

ماریرہ فیق مغل..... نامعلوم

غزل

میری روح میں جو اتر سکیں وہ محبتیں مجھے چاہیں

جو سراب ہوں نہ عذاب ہوں وہ رفاقتیں مجھے چاہیں

انہیں ساعتوں کی تلاش ہے جو کیلنڈروں سے اتر سکیں

جو سے سے ساتھ گزر سکیں وہی فرحتیں مجھے چاہیں

www.naeyufaq.com

# دوست کا پیغام

ہما احمد

کچھ خاص لوگوں کے نام

السلام علیکم! آج کل کے تمام لوگوں کو میرا سلام، امید کرتی ہوں کہ آپ سب لوگ اللہ کے کرم سے بالکل ٹھیک ہوں گے اور اس مشکل وقت کو بھی حوصلے سے گزارا ہوگا۔ یہ تین چار ماہ زندگی کے مشکل ترین لگتے ہیں۔ سب سے کٹ کر رہنا آسان نہیں تھا مگر پھر بھی سب نے ہمت سے کام لیا اور اسی لیے اللہ نے ہمیں آسانی دی۔ خیر اب بات کریں آج کل کی تو اتنے ماہ بعد آج کل کا پڑھنا گویا عید ہوگئی اور شکر کیا کہ آج کل ملا مجھے آج کل رات کو ملنا تھا اس لیے اپنی دوست عائشہ سے واٹس ایپ پر منگوا کر پڑھا تاکہ جلدی سے تبصرہ کر سکوں، رابعہ محمد عمر بہت شکر یہ مبارک باد کے لیے اور دعاؤں کے لیے ہمیشہ خوش رہیں۔ کنول ناز ہمیں یاد رکھا شکریہ۔ کنول میں نے جواب دیا مگر لگا نہیں۔ ڈیڑا قرا امتز مبارک باد کے لیے شکریہ۔ ایمن غفور بس کیا کریں ہما کچھ نہ کچھ بنانی دیتیں۔ زرناب خان خواب سے نکل کر آپ کے سامنے آگئے کیسا لگا مجھے بہت اچھا لگا آپ سے بات کر کے۔ ارم آصف، رقیہ ناز یاد رکھنے کا شکریہ اور پیاری عائشہ ٹیل، آپ اتر آجٹ، زرناب خاں، ماریہ نذیر، ثناء، انصی آپ لوگوں کے گروپ میں آکر بہت اچھا لگا۔ آپ سب سے مل کر اور ملیا رب نواز آپ سے بھی مل کر اور چندہ ویکلم گروپ آج کل۔ عائشہ ٹیل (تم بہت اچھی ہو یا راور ایم کی جوت ملی ہو، ڈریم گروپ آئی مس یو آل۔ حصہ، توشیب، صائفہ، ماہ جبین اللہ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

گلشن چودھری..... گجرات

دل میں بسنے والوں کے نام

پیاری دلاری بہنوں آپ کا کیا حال ہے، امید کرتی ہوں کہ سب ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کرونا وائرس سے بچائے اور جو اس کی لپیٹ میں آگئی ہیں انہیں مکمل شفا یابی سے نوازے اور ساری انسانیت پر اپنا خاص فضل و کرم کرے، آمین۔ طلعت نظامی آپ کی بیٹی کو اللہ تعالیٰ صحت و تندرستی والی لمبی عمر عطا کرے۔ عشنا کوثر سردار مائیں تو گھروں کا تاج ہوتی ہیں، اللہ آپ کی والدہ کو جلد از جلد صحت یاب کرے اور اللہ تعالیٰ ان پر اپنا خاص فضل کرے۔ یاسمین نشاط آپ کی ساس کی وفات پر دل دکھ سے بھر گیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ مرحمت فرمائے، آمین۔ زہت جبین ضیاء صد شکر آپ کے میاں صاحب کی طبیعت ٹھیک ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ آپ دونوں کا ساتھ طویل بنائے۔ ڈاکٹر ہما جہانگیر آپ کو بہت مبارک آپ نے کرونا وائرس کو شکست دی آپ کی تحریروں کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ماورا طلحہ آپ کے نانا کی وفات کا بہت افسوس ہے۔ بزرگ تو باعث رحمت و برکت ہوتے ہیں۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ پروین افضل شاہین آپ کی ساس کی وفات کا پڑھ کر دل شک میں آگیا۔ پُرس بھیا کو اللہ تعالیٰ صبر عطا فرمائے اور آپ کی والدہ کے درجات بلند کرے، آمین۔ کنول ناز آپ کے والد کی وفات یقیناً آپ کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے اور میں آپ کی تکلیف سمجھ سکتی ہوں کیونکہ میں بھی اس دکھ سے گزر چکی ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو صبر دے اور آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ مرحمت فرمائے، آمین۔ پیاری بہنوں اپنا بہت خیال رکھیں تاکہ یہ وائرس آپ سے کوسوں دور رہے۔ پاک صاف رہیں روزانہ نہار منہ چند دنے کلونکس کے چپالیں، ایک سکھور روز کھائیں اس سے امیون سسٹم مضبوط ہوتا ہے۔ ایک لہن کا جوا چا کر یا پانی سے نگل لیں۔ دن میں کم از کم ایک دفعہ گرم پانی پیئیں تازہ اور گھر کا پکا کھانا کھائیں، ورزش کریں ٹائم سے سوئیں یعنی 10 بجے تک حد سے حد سو جائیں، اللہ تعالیٰ آپ سب پر اپنا خاص فضل کرے اور سب کو اپنی حفظ و امان میں

رکھے، مجھے بھی اپنی خاص دعاؤں میں یاد رکھیں۔  
 ارے کمال..... فیصل آباد

اے نچل اور تمام امت مسلمہ کے نام  
 السلام علیکم! میری طرف سے آپ تمام قارئین اینڈ  
 آنچل اسٹاف کو پیار بھر اسلام میں ادارے کا مشکور ہوں کہ  
 مجھے اپنے پلیٹ فارم پر نہ صرف جگہ دی بلکہ ہمیشہ حوصلہ  
 افزائی بھی کی۔ قیصر آرا صاحبہ، سعیدہ ثار صاحبہ، طاہر  
 قریشی صاحب میں ریلی آپ کا مشکور ہوں، اللہ اس  
 ادارے کو مزید ترقی اور کامیابی سے نوازے، آمین۔ آپ  
 سب سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ مجھے اور پوری امت  
 مسلمہ کے تمام لوگوں کو ہر طرح کی مشکل اور وبائی بیماری  
 کرونا سے بچائے اور اس میں مبتلا تمام مریضوں کو شفا  
 کاملہ عاجلہ سے نوازے، آمین۔ تمام امت مسلمہ کو عید النبی  
 کی خوشیاں مبارک ہوں۔ دعا ہے یہ عید خوشیوں بھری  
 ثابت ہو، آمین۔ فاخرہ صغیر آزاد کشمیر، فاخرہ حمید زہیرہ غازی  
 خان، لیسری لالی کھوٹ، فرح حمید، زریہ نجف جڑانوالہ،  
 شامکہ رانی ایبٹ آباد، آپ سب کا شکریہ اور مجھے خوشی ہے  
 کہ میری شاعری کو نہ صرف آپ سب پرستی ہیں بلکہ پسند  
 بھی کرتی ہیں، اللہ حافظ۔

وقاص عمر..... بنگلہ نو حافظ آباد

یشال حیدر کے نام

بعد از سلام مستنون اللہ رب العزت سے دعا  
 ہے یشال کے مولا کریم آپ سمیت تمام  
 مسلمانوں کی حفاظت فرمائے، آپ جہاں بھی  
 رہو جس کے ساتھ بھی رہو ہمیشہ خوش و آباد رہو،  
 اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے۔ واقعی محبت  
 زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتی یہ تو ماشاء اللہ آپ  
 نے ثابت کر دیا

بعد مدت کے پوچھا اس نے اب کہاں رہتے  
 ہو

میں نے مسکرا کے کہا اپنی اوقات میں  
 یشال میں نے سوچا کہ آپ کو عید مبارک کسی ڈیفرنٹ

طریقے سے دوں تو مجھے تو آ نچل ہی اپنا لگا تمام لکھنے اور  
 پڑھنے والوں کو میری طرف سے عید النبی مبارک ہو۔

خدیجہ یشال..... شیخوپورہ

تمام اینٹوں کے نام

نجانے ہم جن کو جتنا زیادہ چاہتے ہیں  
 وہ اتنا ہی دور کیوں ہوتے ہیں  
 السلام علیکم! کیسی ہومائی سوٹ اینڈ کیوٹ سی آپنی جان  
 اور شامل بھیا کیسے ہیں۔ کیا کہا بالکل ٹھیک ٹھاک فٹ  
 فٹ ہو، اچھا جی، ماشاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش  
 رکھے اور ہر بری نظر سے بچائے۔ مائی کیوٹ سسٹر دو ماہ  
 بعد آپ کی دوسری اینورسری ہے تو سوچا آپ کو آ نچل کے  
 ذریعے دس کروڑ اوہو کیا کہا آپ نے کہ تحفہ نہیں دیا او  
 پاگل آئی۔

تحفوں کی کیا بات تحفے ہزار

تم جیو ہزاروں سال تمہیں اینورسری مبارک

گفت بھی مل جائے گا آپ کو ان شاء اللہ اور تنزیلہ جی  
 تم بھی ہاؤس وائف بننے والی ہو، مبارک ہو۔ بہت بہت  
 اوہوشانی آپنی آپ کیوں مجھے گھور گھور دیکھ رہی ہیں کہ تیرا  
 نام کیوں نہیں لیا اور لوں بھی کیوں ایک منٹ بھی تو تیری  
 مجھ سے بنتی نہیں پنچہ ماری بلی (نوماسٹا پی پلیز)۔ آئی نجم  
 انجم اینڈ فریدہ فری، پروین افضل شاہین، مدیحہ نورین مہک  
 آنٹی کوثر خالد آپ سب کو میری طرف سے عید النبی  
 مبارک ہو۔ ایک ریٹوئسٹ آنٹی کوثر خالد سے آنٹی میرے  
 بابا ماما کی ڈیٹھ ہو گئی ہے۔ میرے لیے کوئی دعا کرنے والا  
 نہیں ہے۔ پلیز پیاری آنٹی مجھے اپنی دعاؤں میں یاد  
 رکھنا۔

خدیجہ ایمان..... دیتکے منادہ

مدلیفہ فضیلت، صومیہ کے نام

سب سے پہلے مدلیفہ تم کو ممکن کی مبارک خیر اب تو  
 شادی ہونے والی ہے۔ فضیلت تم کو پامانی کی مبارک۔ سنا  
 ہے کافی مزیدار سین چلتے ہیں وہاں۔ صومیہ، اریبہ، لائبہ  
 اور عائشہ تم سب کو میری طرف سے پیار، لائبہ آپ اس دن

کدھر کھپی ہوئی تھیں جس دن صوی آئی تھی اور اریبہ آپ سے میں ابھی تک ناراض ہوں، دل کھٹا ہو گیا ہے آپ کی طرف سے عاشی چڑیل تم نے کب یہاں آتا ہے تم بہت یاد آتی ہو، مدی بھی بہت یاد آتی ہے اور صوی موتی میں نے ڈانگنگ شروع کر دی میٹھا تو ویسے ہی چھوڑ دیا ہے۔ وجہ تو تمہیں پتا ہے ناں اور اپنی رو با کیا تبت بت کر رہی ہے اور میرا بیٹا داؤد سب ٹھیک ہی ہوں گی ہنسی کئی، یار کبھی تم ساری یہ اریبہ، صومی، رو با اور لائبہ اپنے ڈائیو کے ساتھ یہاں کا چکر ہی لگا لو، میرا ڈرائیور تو چھینوں پر ہے اس کی بیٹی کی شادی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں کسی دن خود ہی ڈرائیو کر کے وہاں چلی آؤں مجھے سمجھ نہیں آتا تم لوگ مصروف کہاں ہوں، کام تو سارے کام والی ماسی کرتی ہے بے چاری۔ تم لوگ صرف دوروں پر رہتی ہو۔ کبھی مری اور کبھی جہلم، کبھی ناران اور کبھی کاغان اور یہ اتنے بڑے بڑے آئی فونز کیوں لے رکھے ہیں۔ اگر مجھ سے رابطہ نہیں کرنا تو بس سیلفیاں سینڈ کرتی رہا کرو نکمبو اور مون تمہارا جو رشتہ انگلیڈ سے آیا تھا اس کا کیا ہوا؟ مجھے تو تمہارے لیے خالہ رضیہ کا بیٹا جو آسٹریلیا میں انجینئر ہے وہ پسند ہے۔ تمہاری امی کو مشورہ دیتی ہوں اور انگلیڈ والا رو با کے لیے ٹھیک ہے۔ چلو چھوڑو یہ بتاؤ جو پنا فرنیچر ڈلوایا ہے کمرے میں وہ کیسا ہے؟ دیکھنا آؤں گی کبھی میرا تو تم دیکھ گئی ہو اور باجی بتا رہی تھی تم آدھی رات تک موبائل میں گھسی رہتی ہو اور دن چڑھے تک سوتی رہتی ہو، اپنی عادتیں بدل ڈالو کھوتیوں، اچھا اب بس کر رہی ہوں، یہ روما اور شمع وغیرہ میرا خط دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں گی تم دونوں کو کبھی سلام۔

زینت..... باشنہ

جویریہ اور شانزل چودھری

السلام علیکم! کیسی ہیں آپ دونوں ویسے تم دونوں کو کیا ہو سکتا ہے۔ ہیچہ ہنسی کی رہتی ہو، اتنی بے مروت ہو، بندہ کوئی پیغام ہی چھوڑ دیتا ہے آچل میں لیکن تم دونوں کو میری جتنی پروا ہے مجھے اچھی طرح پتا ہے جویریہ کو ان ناؤں سے فرصت ملے تو پیغام لکھے ناں وہی ناؤں جویریہ میڈم جو

شانزل آپ کو میل کرتی ہے۔ کیا اندھا ہونے کا ارادہ ہے مس چشمش۔ پہلے ہی اتنے نمونے ششے لگے ہوئے ہیں اور شانزل صاحب آپ بھی ذرا کم ہی پڑھا کریں۔ اپنے حصے کے اپنی جان سے پیاری خالہ جانی کو پڑھا لیا کرو، ویسے شانزل میں حیران ہو جاتی ہوں کہ تم اپنی ساس سے اس قدر محبت کرتی ہو دنیا میں شاید ہی کوئی اپنی ساس سے اتنی زیادہ محبت کرتا ہو، باقی جویریہ اینکو میری ایڈمیشن کی ڈیٹ گزر گئی ہے۔ تم بہت بری ہو، اس کے علاوہ میری کلاس فیلو، ہما، ارم، ثناء، حفصہ، مصباح، نفیسہ، شگفتہ، تسبیہ، وینا، انیتا، صائمہ اور باقی سب کو سلام، تسبیہ تمہاری وہ نشوونما جس پر فرینڈ شپ پوٹری بھی میرے پاس ابھی بھی ہے اور نفیسہ تمہاری شادی کا احوال سن کر بڑا مزہ آیا تم ایسا ہی کچھ ڈیز رو کرتی تھی اپنا خیال رکھنا سب۔ پروین افضل آپ کی نگارشات ہمیشہ کی طرح بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ میری گاؤں کی فرینڈ شمع (بٹے والی) اور روما کو سلام یہ دونوں بھی آچل کی ریڈرز ہیں۔ سب کو سلام اور میڈم جویریہ آپ کو علیحدہ سلام وجوہوں پر بتاؤں گی۔

نوشابہ..... باشنہ

انہوں کے نام

اول تو سبھی کو سلام، السلام علیکم! امید صادق ہے کہ پیارا آچل اور اس سے جڑے تمام لوگ خیر و عافیت سے ہوں گے میں پچھلے چار پانچ ماہ سے اس سلسلے میں خط لکھ رہی تھی مگر وہ شائع نہ ہو سکے۔ خیر کوئی بات نہیں ہما آپ کی شاید گنجائش نہیں مگر اس ماہ یہ خط لگا کر میرے صبر کا پھل دے دیں۔ پیارے آچل تمہیں تمہاری اکتالیسویں سالگرہ بے حد مبارک ہو، مجھے خوشی ہے کہ سبھی نے اپنے پچھلے پیغامات میں مجھے یاد رکھا۔ بے حد شکریہ پیاری لڑکیوں میں نے اپنے ہر پیغام میں سبھی بہنوں کو یاد کیا تھا مگر آپ سب لاعلم رہے جبکہ باقی سلسلوں میں تو میں شرکت کرتی رہی ہوں، اپنے اس خط میں، میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ میں آپ سب سے بے انتہا محبت کرتی ہوں پھر چاہے میرے خط میں کسی کا نام ہو یا نہ ہو کیونکہ اتنی

گنجائش نہیں ہوتی کہ خط میں سبھی کو باقاعدہ نام لے کر مخاطب کروں مگر پھر بھی ایک ادنیٰ سی کوشش ضرور کرتی ہوں، ان شاء اللہ اپنے اگلے خط میں آپ کو باری باری یاد کروں گی۔ سدا پر سکون و مطمئن اور دلشاد رہیں، پیاری ہمارے آپنی میری کوئی بات اگر آپ کو بری لگی ہو تو پلیز معاف کر دیں مگر ناراضی ختم کر دیں شکریہ سبھی کا، آپ سب سدا یونہی آپچل کی زینت بنی رہیں آمین، فی امان اللہ۔

فائزہ شاہ..... لا اعدی

اپنوں کے نام

السلام علیکم! سب کو عید النضیٰ کی بہت بہت مبارک ہو۔ ام بانی شاہد میں آپ کو نہیں بھولی پیاری لڑکی۔ ارم آصف کیسی ہو پیاری سی دوست، رقیہ ناز میں برا کیوں مانوں گی اتنی محبت پہ لو یو ڈیر۔ رمشا آصف خوش رہو، پیاری اقرامتناز و السلام کیسی ہو پیاری، کبریٰ خان ارے واہ میں آپ کے خواب میں آئی ارے واہ لو یو سوچ اتنی محبت کا بہت شکریہ۔ ارم آصف پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ ماریہ نذیر خوش رہو۔ تحریم پسندیدگی کا شکریہ۔ عائشہ ثلیل، اقرآجٹ شکریہ پسندیدگی کا لکٹی ٹھیکل اچھی نر رہی ہے۔ زرقا شادی کی بہت بہت مبارک ہو ویسے میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھ سے پہلے اسکول مت چھوڑنا اور تم اتنی تیز لگی ہو کے میں اسکول چھوڑا اور تم نے بھی چھوڑ دیا اور مجھ سے کچھ دن پہلے تمہاری شادی ہے خوش رہو۔ تمام پڑھنے والوں کو بہت بہت دعائیں اور سلام مجھے بھی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے، نہ رہی تو قیامت کے دن ملیں گے۔

مدیر یونورین مہک..... گجرات

آپچل فرینڈ کے نام

السلام علیکم! سبھی دوستوں کو پیار بھر اسلام، اس امید پہ کہ سب خیریت سے ہوں گی۔ کئی سال بعد ایک بار پھر دوست کا پیغام آئے میں روبرو ہیں آپ کے، پیاری دوست فرح طاہر آپ کے لیے دعا ہے ہمیشہ خوش رہیں اور کامیاب ہوں ہر منزل پہ۔ نادیہ کامران آپ نظر نہیں

آ رہی، ایس امول آپ تو شاید بھول گئی، ہمیں، فائزہ بھی آپ بھی بہت اچھی لگتی ہو ہمیں اس امید پہ کہ ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ہم صدیقہ خان اب عائشہ صدیقہ احمد زنی کے نام سے لکھیں گے۔ آخر میں آپچل ٹیم رائٹرز اینڈ سبھی قارئین کو سلام اور دعا ہے کہ اللہ پاک سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ آپ کی دعاؤں کی طالب۔

عائشہ صدیقہ احمد زنی

عمارہ (بدانور) اور سب آپچل کے دوستوں کے نام السلام علیکم! کیسے ہو سب۔ میں خاص طور پہ عمارہ کے لیے پیغام لکھ رہی ہوں۔ عمارہ کیسی ہو آپ اور آپچل میں لکھا کرو ہمت کر کے۔ آپ کی آپنی بھی ڈائجسٹ پڑھتی ہیں ان سے بھی لکھوائیں۔ ہمیشہ خوش رہو۔ آپ بہت اچھی ہو۔ اپریل کا آپچل میں نہیں پڑھ سکی۔ دعا کریں سرگودھا میں لاک ڈاؤن ختم ہو جائے آمین۔ ماوراطحہ، صبا عیشال، طاہر بھائی، آئی سعیدہ، ثنا کنول، عریشہ سہیل، زرناب خان، مدیحہ نورین مہک سب فیس بک کے گروپ میں شامل ہیں۔ سب کو بہت سلام اور دعائیں۔ ماورآپنی آپ بہت اچھی ہیں اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اپنے میاں کے ساتھ۔ ہا ہا ہا! مائنڈ مت کیجئے گا۔ شانزہ شانو، نور چودھری، اقرآء، صائمہ، اسن، حراء سب کو سلام۔ منی کے آپچل میں میرا نہ تو لیٹر ہوگا اور نہ ہی کسی اور سلسلے میں نام۔ کیوں کہ اپریل کا پڑھائی نہیں۔ ہمارے آپنی پلیز دوست کے پیغام میں لازمی شامل کر لیجئے گا۔ نام یہ آپ کو ای میل مل گئی تو۔ اوکے جی سب خیال رکھیے گا اپنا۔ اللہ پاکستان کے حالات اچھے کرے آمین ثناء آمین۔

ماریہ نذیر (بھانگٹاوالہ) سرگودھا





## جویریہ سالک

### اصل کامیابی

ترجمہ:- ”یقیناً یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ ایسی ہی چیز کے لیے عمل کرنا چاہیے عمل کرنے والوں کو۔“  
ایسی ہی کامیابی کو ہدف بنا کر ہر کسی کو دنیا میں محنت اور بھاگ دوڑ کرنی چاہیے۔ بھاگ دوڑ تو سب ہی کرتے ہیں مگر اکثر و بیشتر سب کے پیش نظر دنیا اور اس کا مال و متاع ہے۔ ہر کوئی اسی کے حصول کے لیے رات دن سرگرواں ہے اور اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہے۔ (الا ماشاء اللہ) لیکن غور کیا جائے تو چار دن کا یہ عیش و آرام حاصل کر لینا کوئی بہت بڑی کامیابی تو نہیں اور اس قسم کا عرضی ہدف کوئی قابل ذکر ہدف بھی نہیں۔ بہر حال انسان کا وقت اور خون پسینہ اتنی ارزراں چیز نہیں کہ اسے عارضی اور فنی کامیابی کے لیے ضائع کر دیا جائے۔ ایسی قیمتی پونجی کو کسی بڑے ہدف کے حصول کے لیے کام میں لانا چاہیے اور وہ بڑا ہدف ہے جنت اور اس کی نعمتوں کا حصول چنانچہ تمام بھاگ دوڑ کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس ہدف کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کریں۔

حسن اختر..... کراچی

### گناہ کو متلا

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”کیا میں تم کو وہ اعمال نہ بتاؤں جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹاتا ہے اور درجے بلند فرماتا ہے؟“ حاضرین نے عرض کیا۔ حضور ضرور بتائیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ (۱) تکلیف اور ناگواری کے باوجود پوری طرح کامل وضو کرنا۔ (۲) مسجدوں کی طرف زیادہ قدم چلنا (۳) ایک نماز کے بعد

دوسری نماز کا منتظر رہنا۔ پس یہی سچے حقیقی رباط۔“

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ”جو شخص رات کو با وضو سوتا ہے تو ایک فرشتہ ساری رات اس سے جڑا رہتا ہے اور اس کے لیے ان کلمات سے استغفار کرتا ہے۔ اے اللہ اپنے فلاں بندے کی مغفرت کر دے کہ وہ رات کو با وضو سویا ہے۔“

اگر پہلے سے وضو قائم ہو اور نماز کا وقت آجائے تو اسی وضو کے ساتھ نماز پڑھی جاسکتی ہے لیکن تازہ وضو کر لیا جائے تو پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”جس شخص نے طہارت یعنی وضو کے باوجود تازہ وضو کیا اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔“

عثمان عبداللہ..... ناتھ کراچی

### دعا کا طریقہ

فرمان رسول اللہ ﷺ کے مطابق تین بار تو اللہ تعالیٰ اپنا رخ رحمت ادھر ادھر کرتا ہے مگر چوٹی بار اس کا کرم چھلک پڑتا ہے اور بندے کی کشت زار آرزو کو سیراب کرتا ہے۔ بعض بندے بڑے عجلت پسند ہوتے ہیں۔ اپنی اس ادا سے وہ رحمت حق کو تو نہیں البتہ خود کو ذائقہ میں ڈال لیتے ہیں۔ ورنہ اللہ تو سیاہ راتوں میں چمکے اور سیاہ پتھر میں بسیرا کرنے والے حقیر کیڑے کی بھی سنستا ہے۔ بھلا وہ اشرف المخلوقات انسان کی کیوں نہ سنے؟ انسان خواہ بدکار ہو یا نیکو کار تہجد گزار ہو یا ناخوار پرہیزگار ہو یا سوائے روزگار خوش اطوار ہو یا بدکردار دینے والا مند و کجہ کر نہیں دیتا اپنی شان کرم دیکھتا ہے اسی لیے تو ہجرت علیؑ اپنی دعا میں فرماتے ہیں۔

”اٰلہٰی تو میرے ساتھ وہ معاملہ فرما جو تیرے شایان شان ہے وہ نہ کہ جس کا میں حق دار ہوں۔“

شاہ فرحان..... ملتان

### آدھے نمبر

کچھ ٹیچر اتنے سڑیل ہوتے ہیں کہ پیر جتنا مرضی اچھا کرو اس میں سے کیڑے نکالنے سے باز نہیں آتے آپ کا جواب ٹھیک ہے لیکن یہ میرے والے میٹھد سے نہیں ہوا اس لیے آپ کو آدھے نمبر ملیں گے۔

مدیحہ نورین مہک..... معجزات

رحمہ دلی

رحم دلی عورتوں سے سیکھیں، بہن کو بتا ہوتا ہے کہ بھائی کا کس لڑکی سے چکر ہے لیکن وہ اس حلق پر مکر اور جتی ہے۔ وہ بھی غیرت کے نام پر بھائی کو قتل نہیں کرتی۔

انبل اسد حرا افتخار..... چشتیاں

درد

کل شام بیگم پڑوس کے گھر سے آئیں تو ہائے ہائے کر رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ جوڑوں کا درد ہے۔ گاڑی نکالی کینٹ اسپتال کا رخ کیا۔ اس کے پہلو میں وردہ اور سرت رنگی برانڈ کی دکانیں تھیں وہاں سے چار سو تھ خریدے بیگم کو دیے یوں پھر بیگم کا جوڑوں کا درد دور ہوا۔

پردون افضل شاہین..... بہاولنگر

سمجھنے کی بات

جب ناخن بڑے ہو جاتے ہیں تو ناخن کاٹے جاتے ہیں تاکہ انگلیاں اسی طرح رشتوں میں جب غلط فہمیاں آجائیں تو غلط فہمیاں دور کریں تاکہ رشتے توڑ دیں۔  
شمر گلزار..... کوئٹہ معجزات

اقوال ذہین

○ اپنی زبان سے اپنی تعریف کرنا اپنی طرف سے لوگوں کا خیال خراب کرنا ہے۔ (خلیفہ مامون الرشید)

○ ایسی بات میں گفتگو کرنا جس میں کسی کا فائدہ نہ ہو ضلالت اور گمراہی کی علامت ہے۔ (معروف کرچی)

○ جو شخص ارادے کا پکا ہو وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ (حجرت عبداللہ بن عباسؓ)

○ انسان کو سانس اندر لیتے وقت اور باہر نکالتے وقت ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہنا چاہیے۔ (حضرت نصیر الدین محمود دہلویؒ)

○ بہترین انسان وہ ہے جو عروج کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہو اور مصیبت کے وقت صبر اختیار کرے۔ (یحییٰ برکاتیؒ)

○ شریف انسان کی پہچان یہ ہے کہ جب اس کا

مقابلہ کمزور سے پڑے تو اپنے آپ کو پیچھے ہٹا لیتا ہے۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

○ ہر بڑے آدمی کے پیچھے حاسدوں کا جھوم رہتا ہے اس لیے ان سے ہوشیار رہو اور اللہ کو یاد کرتے رہو تاکہ حفاظت میں رہ سکو۔ (حضرت بدر الدین اسحاقؒ)

○ مومن وہ ہے جس کی دوستی اللہ سے ہو اور دوستی بھی ایسی کہ اس پر اولاد کی محبت بھی غالب نہ آ سکے۔ (حضرت نجیب الدین متوکلؒ)

○ دعا کے وقت کسی گناہ یا اطاعت کا خیال دل میں لانے کی بجائے اللہ کی رحمت پر نظر رکھنی چاہیے۔ (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ)

○ جسے لوگ مصیبت کہتے ہیں اسے محبوب (اللہ تعالیٰ) کی طرف سے ایک عطیہ سمجھو محبت کا تقاضہ یہی ہے۔ (حضرت فرید الدین گنج شکرؒ)

○ ارم صابرہ..... تلہ گنگ

ہنر

کلاس روم میں سنا سناتاری تھا استاد کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا سوال تھا ہی ایسا، استاد نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بلیک بورڈ پر ایک لکیر کھینچ دی پھر طلباء سے پوچھا۔ ”تم میں سے کون ہے جو اس کو چھوئے بغیر چھوٹا کر دے؟“

”یہ ناممکن ہے۔“ کلاس کے سب سے ذہین بچے نے آخر اس خاموشی کو توڑا۔

”لکیر کو چھوٹا کرنے کے لیے اسے مٹانا پڑے گا۔ جبکہ آپ نے چھوٹنے سے منع کیا ہے۔“

استاد نے کچھ کہے بغیر پہلی لکیر کے متوازی اس سے بڑی لکیر کھینچ دی جس کے بعد سب نے دیکھا کہ استاد نے پہلی لکیر کو چھوٹے بغیر چھوٹا کر دیا تھا۔ انہوں نے دوسروں کو کوئی نقصان پہنچانے بغیر آگے نکلنے کا ہنر سکھادیا تھا۔

اقرام ممتاز..... سرگودھا

مختلف بیویاں اپنے شوہروں سے

لڑتی ہوئیں

+ پائلٹ کی بیوی: زیادہ مت اڑاؤ، سمجھے۔  
 + پیچر کی بیوی: مجھے مت سکھاؤ، یہ اسکول نہیں۔  
 + ڈینٹسٹ کی بیوی: دانت توڑ کر ہاتھ میں دے دوں گی۔  
 + حکیم کی بیوی: نبض دیکھے بغیر طبیعت درست کر دوں گی۔  
 + ڈاکٹر کی بیوی: تمہارا لٹراساؤنڈ تو میں ابھی کرتی ہوں۔

+ فوجی کی بیوی: تم اپنے آپ کو بڑی توپ چیز سمجھتے ہو۔  
 + شاعر کی بیوی: تمہاری ایسی تقطیع کروں گی کہ ساری بحریں اور نہریں بھول جاؤں گے۔  
 + ایم بی اے کی بیوی: نائنسٹیوراون بزنس۔  
 + وکیل کی: تیرا فیصلہ تو میں کرتی ہوں۔  
 + ڈائریور کی بیوی: میسر لگا اور نکل یہاں سے۔  
 + پولیس مین کی بیوی: ایسی چھترول کراؤں گی کہ نانی یاد آ جائے گی۔  
 + مولوی کی بیوی: ابھی پڑھتی ہوں ختم تمہارا۔  
 + کرن شہزادی..... منہ پر

### کلر گر نسخہ

ایک آدمی ڈاکٹر کے پاس گیا اور کہا ڈاکٹر صاحب ایسی دوا لکھ دیں جس سے میری عمر لمبی ہو جائے۔  
 ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ شادی کر لیں۔  
 آدمی نے حیران ہو کر پوچھا کیا اس سے میری عمر لمبی ہو جائے گی۔  
 ڈاکٹر نے کہا نہیں آپ کی خواہش ختم ہو جائے گی۔  
 ام ہانی شاہد..... ڈگری

### عید مبارک

میں کیوں اسے یاد لاؤں  
 میں کیوں اسے پاس اپنے بلاؤں  
 زندگی



زندگی کی تیز رفتار میں ہمیشہ رشتہ داروں کی گاڑی سے  
کبھی آگے مت جانا۔ ورنہ سفر تو تم بہت کر لو گے لیکن تنہا  
ضرور رہ جاؤ گے۔

صفت اللہ..... گنڈی عمر خان

### زندگی

زندگی میں کوئی خوشی کوئی دکھ  
کوئی جذبہ بھی مستقل نہیں ہوتا ان کے بھی پاؤں  
ہوتے ہیں  
ہمارے سلوک اور رویے دیکھا کر کبھی  
یہ قریب آ جاتے ہیں اور کبھی آہستہ آہستہ دور چلے  
جاتے ہیں

طیبہ شیریں..... کوڑی خدا بخش

### مت بھنے دو

مت بھندو  
آنسوؤں کو  
اپنی ساگر آکھوں کی  
سپیوں میں رہنے دو  
آنسو موتی ہوتے ہیں  
مت بھندو  
جانے کب وہ رخ ملے کہ  
دل گریہ کی قوت سے بھی ہو محروم  
آنسوؤں کا خیر نہ  
اس وقت ساتھ بھاگے گا  
آنسو کے موتی ہوتے ہیں  
مت بھندو

مسز نگہت غفار..... کراچی



”زندگی ایک پھول کی مانند ہے جو بکھر گیا تو سمٹنا  
مشکل ہو جائے گا اور لوگ اسے پیروں تلے کچلتے، ملتے،  
روندتے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہو جائیں گے۔  
ہمیں خود ہی اٹھنا ہوگا۔ چلنا ہوگا تاکہ قافلے سے جا مل  
سکیں۔

بس پہلی اڑان مشکل ہے

یہاں آسان مشکل ہے

ہمیں اقبال کے شاہین بننا ہے جو اپنی پرواز بلند رکھتا  
ہے۔ ہمیں اس دنیا میں اپنی زندگی کو قیمتی سمجھ کر سنبھالنا  
ہے۔

ماریا الفت..... گوجرہ

### وارفنگ

ایک بورڈ پر تحریر لکھی تھی۔  
”خطرہ چار سو چالیس دولٹ۔ جو اس کو چھوئے گا فوراً  
فوت ہو جائے گا۔“  
اس تحریر کے نیچے یہ الفاظ بھی لکھے تھے۔  
”خلاف ورزی کرنے والے کو پولیس کے حوالے  
کر دیا جائے گا۔“

مہر زاکت مری..... مغل پورہ

### فلخ مگر حقیقت

☆ اچھی عادتیں اچھے کردار اور بری عادتیں برے  
کردار کا پتہ دیتی ہیں۔  
☆ نفرتوں کے گھڑے کھودنے والے لوگ اکثر خود  
وہاں گر جاتے ہیں۔  
☆ محبت قسمت سے نہیں ملتی محبت خلوص سے ملتی  
ہے۔

☆ زندگی میں کچھ موڑ کچھ لوگ اور کچھ راستے کبھی دل  
سے نہیں اترتے۔

☆ زندگی گھاس کے تنکے کی طرح گزارو، جو اپنا وجود تو  
کھودیتا ہے، لیکن زمین سے رشتہ بھی نہیں توڑتا۔

امام مارہ..... چچ پٹنی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ شروع اللہ تبارک وتعالیٰ کے بابرکت نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے ہم تمام قارئین کے شکر گزار ہیں کہ کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد بھی آپ سب نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور اپنے ساتھ نور تعادوان کا یقین دلایا جس کے لیے ہم سب آپ کے مشکور ہیں۔ چلیں جی اب بڑھتے ہیں آپ کی ہر مہم کی جانب جہاں آپ سب نے رفق لگائی ہوئی ہے۔

**ارم کمال..... فیصل آباد:** پیاری دلاری شہلا جی سدا سکرائیں اور ہر وارس سے محفوظ رہیں آمین۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ آپ خیریت سے ہوں گی میں بھی ٹھیک ٹھاک ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے آمین۔ دنیا کے رنگ ڈھنگ ہی عجیب ہو گئے ہیں۔ زندگی گہما گہما کو کسی نے مجدد کر دیا ہے۔ سارے دن رات ایک جیسے لگتے ہیں۔ ان ہی دنوں کے درمیان آپ چل کر ٹین مہینوں کا مشترکہ شمارہ دل میں خوشیوں کے پھول کھلا گیا۔ اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ ٹائل نہایت ہی جاذب نظر تھا لیکن ماڈل کی آنکھوں کے نیچے میک اپ تو چہیں دی گئی۔ ”سُرکشیاں“ سے ہوتے ہوئے ”در جواب آپ“ میں پہنچے بہنوں کے دکھ سکھ سے آگاہی ملی۔ ”رہناتا“ ہمیشہ کی طرح روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ ”ہمارا آچکل“ میں عروسہ شہوار فرین نے خوب انسپار کیا۔ ”سروے“ بہت ہی بھرپور اور دلچسپ جواب رہا لیکن کئی بہنوں کا ڈبل ڈبل چھپ گیا شہارے کی سب سے جاندار اور شاندار تحریر سب اس گل کی ”محبت کو پیر کر دو“ رہی اتنی ذہین ہیر و من معاملہ ہم اس پر اعتماد کا ڈکاوا دہا۔ مسز ناصرہ چنگیزی کی بد فطری نے بہت دکھ دیا، حسن چنگیزی کی محبت واقعی پاور فل بھی کرتے خراب حالات کے باوجود حسن کی محبت نے سحاب کے دل کی ساری کدورتیں اور غصہ مٹا کر محبت فاتح عالم کا جھنڈا ابرادیا۔ ”پردے میں رہنے دو“ نازیہ جمال نے بہت سبق آموز تحریر لکھی جب ہم اللہ تعالیٰ کے مستعین کردہ راستے سے بٹتے ہیں اور اپنی مرضی کے غلط راستے چلتے ہیں تو یہی سب ہوتا ہے لیکن صد شکر امین محفوظ راہی اور ارم کو بھی صراطِ مستقیم کا راستہ سمجھ میں آ گیا۔ سلسلے وار ناول ”اکائی“ سو بڑو بڑو چارہا ہے فاطمہ کی قربانیاں ضرور رنگ لائیں گی وقار ابقی نے تو بہت مایوس کیا، جنیت بی بی پاکستان آ کر پتا نہیں کیا کیا طوفان اٹھانے ہیں۔ ”خسارہ“ میں سہلی بی بی جس بات کو کفر سمجھ رہی تھیں وہی اصل میں ان کی ہانگی، ظاہر ہے بیٹیاں ماں کا روتو ہوتی ہیں۔ شمارے کی دوسری بہترین تحریر ”گوری تھجھ سے عشق کچھ خاص ہے“ رہی عازنہ نے اپنی سچی اور بے خلوص محبت سے علیحدہ کو بھی اپنی اصل جڑ سے ملایا اور اپنے دادا کو ان کا ٹھکانا ہوا بیٹا احساس دانش واپس لوٹا دیا۔ ”سپنوں کا شہزادہ“ پڑھ کر ٹیس ٹیس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔ سلسلے وار ناول ”سانسوں کے سفر میں“ شہرہ کے ساتھ بہت برا ہوا، عبدالرحمن نے ایسے بھاگ کر کوئی مروا گئی نہیں دکھائی گھر میں رہ کر ماں بی کو قائل کرتا، اپنی محبت کے ساتھ کوئی ایسے کرتا ہے۔ ہم آں پو عبدالرحمن۔ ”حصار“ بہت پر اثر تحریر رہی بول بول کر بول ہی پائے گا گلاب نہیں۔ ”بیاض دل“ میں بشیر علی رضوان، پروین افضل شاہین، ندا اختر عباسی اور شائستہ جبران کے اشعار دل میں گھر کر گئے۔ ”دُش مقابلہ“ میں سب چیزیں پرانی تھیں۔ ”نیرنگ خیال“ میں رویہ کوثر، سید عبادت کاظمی، عانثہ بریدی اور جاذبہ عباسی کی شاعری غضب کی رہی، ”دوست کا پیغام آئے“ میں سب بہنوں کے کٹ کٹ پیغامات پڑھ کر دل مسرور ہوا۔ جن بہنوں نے مجھے یاد رکھا ان کا بہت شکریہ، جزاک اللہ ”یادگار لکھے“ میں نسیم بشیر حسین، کنول ناز، ارم صابرہ اور عائشہ عمر کے مراسلات زبردست رہے۔ ”آئینہ“ میں اس دلچسپ رفق کو بھی ”ہم سے پوچھیے“ میں سب کے سوالات اور شکالہ کے ایسا کسی جوابات نے نول گول کا سا مزہ دیا، اچھا اب اجازت زندگی رہی تو پھر میں گی فی امان اللہ۔

**صبہ ایٹشل..... فیصل آباد:** السلام علیکم! بہت عرصے بعد آپ چل میں بذریعہ خط شامل ہو رہی ہوں۔ اس ماہ کے افسانوں میں ”حصار“ اپنا حصار قائم کرنے میں کامیاب رہا۔ فہرست دیکھ کر ندا حسین کا ناول ”گوری تھجھ سے عشق ہے کچھ خاص“ پڑھنا شروع کیا۔ کہانیاں تو وہی ہوتی ہیں تو صدیوں سے چلتی آ رہی ہیں اندازِ بیان کہانی کو کچھ الگ بنادینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ندا کی تحریروں میں یہ بات میں نے ہمیشہ محسوس کی ہے یہ بہت دل سے لکھی ہیں اس ناول میں لکھنے سے پہلے کی جانے والی محنت بھی نظر آتی۔ روائی تھسی کی روائی دھونی محبت اور بلا وجہ کارویس کچھ لوگوں کو پسند تو آ جاتا ہو گا لیکن مجھے لگتا ہے جب تک کہانی کا انجام کسی سبق کیساتھ نہ ہو لکھنے والے کو اور باذوق پڑھنے والوں کو مزہ نہیں آتا۔ سب اس گل کا بلکا پھلکا ناول اچھا لگا۔ فی الحال اتنا ہی پڑھا ہے ان شاء اللہ مکمل

تیمبرے کے ساتھ پھر حاضری ہوگی۔ آپ چل پڑھنے والے سب ہی قارئین اور خصوصاً میری تحریروں کو پڑھ کر مثبت تنقیدی یا تعمیری رائے دینے والے سب دوستوں کو میرا دلی و پیارا۔

**سودا نے محمد سردار..... جڑ اٹوالہ:**

گئے دنوں کا گوشوارہ لے کر  
شہلا تیرے آئینے میں آگئی ہوں میں  
السلام علیکم! درحمتہ اللہ وبرکاتہ! دوستو سودا نے محمد سردار عرف کوثر خالد سودا حاضر خدمت ہے اور دعاؤں کے پھول نثار کرتی ہے۔  
خاں خاں، خاں خاں، خاں خاں، خاں خاں! آپ سب کے لیے آدھے صفحے لکھی دعائیں ہیں جو ان اسماء باری تعالیٰ میں پوشیدہ ہیں  
کیونکہ رفا و اوداعا علی ممکن نہیں۔ یعنی کسی کس کا ناموں، میرے لیے سب ہی خاص ہیں۔ ساس جی اللہ کے پاس چلی گئی ہیں اور بہو  
بیٹا اچھے آگئے ہیں۔ ذمہ داری بدل گئی ہے کہیں بھول نہ جاؤں سب سے پہلے پروین افضل کو بیٹنی کی بہت بہت مبارک ہو۔ دو دھوں  
نہائے پوتوں بھلو۔ فریدہ فری کو دعا میں۔ نجمہ زیا اور اپنی محسن کی تصویر ہی بیچ دو اتنا کر غائب ہوناں مجبور ہوناں۔ جو یہ جان حد  
خوش کیوں نہ کر سکی کیونکہ تم نے شرط رکھی ہے عشاء سے بعد نہ کروں اور دن میں ہمیں فرصت نہیں ملتی۔ شمع کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ عمار  
بن یاسر مکتب کو دعاؤں کی ضرورت ہے کی دن کشمیر اور حوا کی بیٹی بلکہ بیٹیوں کو سسرال کی قید سے آزادی ضرور ملے گی کیونکہ

قید حسین بھی ہو تو زہر لگتی ہے  
آزادی جھوپڑی میں بھی سحر لگتی ہے  
سرگوشیاں قیصر آریا پیری میں ہوں ناں، دعاؤں سے ساری دنیا میں اور کوشش سے خاندان اور محلے کو مسرت مگر بنانے میں لگن ہوں،  
میری کوشش اور دعاؤں سے قائل لوگوں کو کھٹا خاص و بنا پڑا اور افضل تعالیٰ کر گئی ہے۔ ”حمودت“ دنوں ہی زبردست ترین رہیں۔  
اسی کے در پر سودا رہتی ہے بھلا کر دنیا کو  
جو ہر پل پیار نہیں کرتا ہے زیادہ ستر ماؤں سے  
بلاتے ہیں در القدس پہ اپنے اک اک عاصی کو  
وہ دیکھتی اتنی کے تاز اٹھانے آگئے آقا

”در جواب اس“ شگفتہ شفیق کینئر کا اسم یہ ہے۔ بصیر واحد واحد میں تو بڑھوں گی تم بھی پڑھو اور بادام سات بھگو کر روزانہ کھاؤ اور ہاں  
ٹینشن ہرگز نہ لینا اللہ بہتر کر دے گا۔ ”رہنا آنا“ جان دے دی ہوئی اسی کی کچی حق تو سب کے کفن ادا نہ ہو۔ ”ہمارا آپل“ عروسہ شہوار میں  
پڑھ کر مسکرائی، کشمیر بہتر مندہ ہیں تجھ سے۔ ”سانسوں کے اس سفر میں“ میں کشمیر چلی جاؤں گی۔ ”محبت کو زیر کر دو“ کشمیر آ زاد  
ہونے نہ دیا۔ ”گوری تجھ سے عشق ہے کچھ خاص“ کشمیر سے باہیں بتا لے بے وفالہ۔ ”کانی“ دلا دے کشمیر کو باہی ”پودے میں رہنے  
دو“ میں ڈوب کر کشمیر کو بچا لیا۔ ”خسارہ“ کشمیر ول منہ کر کے کھڑی آن لگی۔ ”حصہ“ ہوں ورنہ کشمیر کی طرف جانے سے کون روکتا۔ مجھے  
”سپنوں کا شہزادہ“ کھول دے خدا یا مسلمان کھانے کی طرف آیا۔ کشمیر کو بچانے ہم جاتے ہی نہیں حالانکہ پون صدی سے اس نے ہر  
روز ہمیں بلایا۔ ”بہاؤ دل“ حسب معمول بہترین۔ ”نیرنگ خیال“ پرانے شاعر تو ماہر ہیں، یہی اس باری لڑکیوں نے زبردست شاعری  
کی مثلاً۔ ”پادگار کچے“ امر ہوتے ہیں۔ ”آئینہ“ تو سب کی جان ہے۔ اظہوری شاعری بھی اثر دیتی ہے ہمارے لیے اہم ہے اور ہرے  
بھی کبھی مکمل ہوں گے ہماری طرح اور ہم اپنے سے آگے والوں تک پہنچیں گے ان شاء اللہ۔ ”ہم سے پوچھیے“ بھی کسی سے کچھ  
پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے معذرت بہر حال شمال کا ذہن لا جواب ہے۔ نجانے ایسے سوالوں کے ہم کیا جواب دے  
سکتیں۔ بس پڑھ کر بھی مسکرا بھی لیتے ہیں۔ ”آپ کی صحت“ بہو کتا نے سے بھر جوان ہو رہے ہیں۔ پیارے پیارے خوشی جودیتے  
ہیں۔ تمام لکھاریوں، قاریوں کو دعاؤں کی کوئی بطور تحفہ قبول ہو، اللہ سب کی جائز حاجات کو پورا کرے فضول روایات سے دور رکھے،  
آمین ثم آمین۔

**سیدہ تقسیم بشیر حسین..... تنگہ:** بہت پیاری شہلا السلام علیکم! امید ہے کہ آپ سب اللہ کے حکم سے خیریت  
سے ہوں گے۔ پیاری شہلا دو ماہ جدائی نے تو مجھے نیم پاگل سا کر دیا تھا۔ آپ کا کیا حال ہو میرے بغیر؟ آپ کو تو شاید میں یاد بھی نہ  
ہوں، چلے چھوڑیں۔ اس ماہ کا آپل یکم کو لا تو بہ اتالیف چلے معاف کیا۔ ناٹل بہت خوب صورت تھا۔ ”سرگوشیاں“ پڑھ کر کانی سے سو  
فیصد اتفاق کیا لوگ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اتنی شام سمجھ رہے ہیں کوئی ان بے وقوفوں سے پوچھے کہ اگر کوئی مرض ہی نہیں تو  
لاکھوں لوگ کیا ہول کے زور پر مر رہے ہیں۔ اللہ ہی ان سب کو ہدایت دے۔ اس دفعہ ”حمودت“ دنوں ہی بہت پسند آئیں۔ فخر خٹک

نعت کے ساتھ کہانی بھی بھیج دیتی۔ ”در جواب آپ“ اقر اصغر، نازیہ کنول، طلعت نظامی، عشنا کوثر، کنول ناز کے لیے دعائے خاص کی۔ عائشہ سکندر کہانی منتخب ہونے پر مبارکباد آپ چل لیٹ ملنے کی وجہ سے صرف ایک افسانہ ہی پڑھ سکی کیونکہ پھر خط بھی پوسٹ کرنا ہے۔ ”سپنوں کا شہزادہ“ حنا بشری نے درست لکھا۔ سپنوں کا شہزادہ کی کوئیں ملتا اور پھر جب سننے کوٹھتے ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ ان کی گرجیاں ٹوٹ کر آنکھوں کو کھینچ کر دیتی ہیں مجھ سے، ہر کنول جانتا ہے ویری گڈ۔ ”ہمارا آچل“ میں عروسہ شہوار کے لیے نعلی جواب پسند آئے بہت اکیٹھ معلوم ہوئی ہیں۔ ”سلا لکھ مردے“ میں سب کے جواب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ”بیاض دل“ سے سب اس گل، غیر مجید، ارم کمال، رویون اشرف، مندر احمد شہزادہ جبران، الما بشر، فائزہ بھٹی، انیلہ حسن کے اشعار پسند آئے۔ ”تیر خیل“ انکین و قار سب پر مہربان ہیں سولے میرے ایمان آئی تھی، مجھے بھی حکم دیں دے۔ رویون کوثر، سید عبادت، عاتکہ، نذیر، نجم، نجم، ام بانی، فریدہ فری، ڈاکٹر محمد نعیم انصر کی شاعری پسند آئی۔ ”یادگار لمحے“ سب اس گل، مہربان شاہ، کلشن چوہدری، رابعہ عمر، ارم صابر، عائشہ عمر، افرامتناز، الما بشر حسین نے زبردست انتخاب کیے۔ آئندہ شاعران کی آمد صحرائیں برسات ہی لی ویلکھ بیک واپس غائب مت ہو جانا اور آخر میں کنول ناز حاصل پور آپ کے والد کا پڑھ کر بہت دکھ واد میرے والد بھی مجھے بچپن میں چھوڑ گئے تھے بس کچھ شعلی سی یادیں ہیں ذہن میں جسے میں تازہ کرتی رہتی ہوں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔ آمین۔ ”ہم سے پوچھیے“ تین ماہ بعد شامل کی تھی کچھ گفتگو کرنے کو ملی مزہ گیا۔ صرف باریہ نذیر کے سوالات مزید اترتے آئے کہ جی اللہ حافظ اور بی ایمان اللہ زندگی رہی تو پھر ملیں گے ان شاء اللہ۔

**فلنزدہ جہتی..... پتو کھی:** السلام علیکم پاکستان، کہا حال ہیں آپ کے اللہ پاک سے آپ کی اچھی زندگی کی دعا ہے۔ بہت انتظار کرایا اس دفعہ پیار سے چلنے سے سہرورق اچھا تھا۔ ٹائل گرل پھولوں کا کپکپے پکڑے کسی شادی میں جانے کو تیار تھی۔ ارے سنو شادی سے کر شادی کا احوال ضرور لکھنا۔ فہرست ”حضور نعت“ کے بعد ”در جواب آپ“ تک کا سفر کیا۔ حنا بشری شادی کی بہت بہت مبارکباد۔ اللہ پاک سے تمہاری نئی زندگی کی خوشیوں کی دعا۔ پھر قدم رکھنا سنہ میں خود کو لکھنے کے لیے گریہ کیا سارا آئینہ دیکھ لیا مگر ہمارا نام ہی نہیں تھا۔ ایسی نا انصافی۔ کچھ دیر تک تو میں صدمے سے کچھ بول نہ سکی۔ شہلا سے کسی دہشتی کی توقع نہیں تھی۔ آپ آئی ہوں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے ”سانسوں کے اس سفر میں“ ابھی ابھی ہے پڑھ کر ناول تو اچھا لگ رہا تھا۔ آگے دیکھتے ہیں کیا کیا رنگ دکھاتا ہے۔ ”اکائی“ وقار نقی کی بار ضرور ہے تم جب بھی کوئی فیصلہ کرو غلط ہی کرو۔ تم ہمیشہ فاطمہ کا اچھا سوچتے سوچتے اس کا برا کر جاتے ہو۔ جنت بی بی گل سے دنیا جتنی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ ”محبت کو بیز کرو“ کوئی ایسے بھی کرتا ہے تم نے تو محبت میں جان ڈال دی۔ تم یک دم میرے دل میں سب سے اوپر چلی گئی ہو۔ جو لوگ محبت کرتے ہیں وہ محبت میں ہی زندہ رہتے ہیں اور محبت میں ہی مر جاتے ہیں۔ محبت میں تو محبوب کی خوشی کو دیکھا جاتا ہے۔ ابھی بس اتنا ہی پڑھا ہے کیونکہ تیرہ بھیجے کی جلدی تھی ڈاک جسٹ بہت لیٹ ملا اگر پورا پڑھ کر تیرہ کرنی تو پھر شاید تیرہ پہنچ نہیں پاتا۔ ”ہمارا آچل“ عروسہ شہوار اچھا لگا آپ کو پڑھ کر۔ ”دوست کا بیٹا“ جس جس نے مجھے یاد کیا اور عادی ان سب کا شکریہ۔ میں نے بھی آپ سب کو بہت یاد کیا تھا۔ ”بیاض دل“ میں سب کی انتخاب اچھا لکھا۔ اب اجازت دیں، اللہ حافظ۔

**شیراز فنل..... آفیشل گروپ:** السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ مجھے آچل کا سی جون جولائی کا مشترکہ شمار ہل گیا سہرورق بہت پیار لگا پھر سب سے پہلے عشنا آئی کا ناول ”اکائی“ کھلا بہت اچھی قسط بھی عشنا آئی کمال کر دیا شاید اس وقت کی لمبی منظر نگاری وہ لوگ بھی نا کر سکیں جو اس کڑے وقت سے گزر رہے پوری قسط میں دل میں ڈر سارا کہ نہیں کچھ ہونا جائے شکریہ کہ آیت تو اپنے بابا تک پہنچ گئی اور اینڈ میں وہی ہوا جس کا ڈر تھا عشنا آئی نے بھر پور تجسس رکھ چھوڑا عشنا آئی پلی پلیرز اب حیرت ہی رکھیے گا، ہم تو فاطمہ اور سب کے لیے دعا گو ہیں۔ پھر ایمان قاضی نے بھی اچھا لکھا۔ اب بات کروں ”محبت کو بیز کرو“ کی تو سب آپ نے بھی کوئی کی نہ چھوڑی سب اب نے اگر اللہ پر یقین رکھا تو اللہ نے اسے خوب صلا دیا اور اس کی محبت کو بیز ہوئی۔ پھر حنا حسین آپ کا ناول ”گوری تچھ سے عشق ہے کچھ خاص“ پڑھا بہت اچھا ناول تھا آپ نے مشرقی بانے جھیلے اور مغربی گوری کو بڑی خوبصورتی سے ملایا مزا آ گیا۔ افسانوں میں سب سے نذیر ”سپنوں کا شہزادہ“ از حنا بشری لگا آئندہ کے ساتھ چاند نے بہت برا کیا آئندہ کو سپنوں کا شہزادہ نہ ملا لیکن فرحی نعیم نے اپنے افسانے ”حصار“ میں تین شہزادوں سے تین شہزادیوں کے گھر برباد کروا دیے بقول فرحی نعیم کے ان کے گھر بدو کا ہے حصار میں تھے۔ نازیہ جمال نے بھی بہترین افسانہ لکھا راشدہ رفعت کا افسانہ بھی بہت خوب تھا تمہارا سلسلہ بہترین تھے غرض پورا شمار مزید تھا۔ ہماری آئندہ منشاء آچل آپ سے اچھی تحریر لکھنے کو کہا گیا اور ماوراء الطحا آپ کو بھی بڑی عید کے لیے تحریر لکھنے کی درخواست کی گئی امید ہے صبا آپ اور ماورا آپ کی طرف سے جلد اچھی تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔

**میمونہ خفن شیروانی..... کبیر والا۔** اسلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی شہلا آئی اور میرے پہلے تبصرے کو آپ کی نظر میں جگہ دیں گے۔ میں ہمارا چل چل ہاتھ میں آیا تو کچھ سکون محسوس کر رہی ہوں اور پرچوں بھی ہوں بھی جذبات کی زیادتی کے باعث دینی دن میں ختم کر لیا۔ اب چل ختم ہوا تو سوچا تبصرہ بھی کر لیجا جائے۔ سب اچھے سوچ کو ملی جامہ پہناتے ہوئے تبصرے کی جانب آتی ہوں۔ سب سے پہلے بات کرتے ہیں سرورق کی نہایت ہی اچھا لگا۔ ”مختصر جمالی اور فخریہ کی پیش کردہ ”حمود وخت“ نے گویا ایمان کو مزید نکھار دیا ہو۔ اس کے بعد سلسلہ وار ناولوں کی متوجہ ہوئی۔ ”اکالی“ عشا کوثر سردار کا لکھا رہی ہیں۔ آپ کا ناول دلوں میں پاکستان کے لیے محبت اور اپنے وطن کے لیے کچھ کرنے کا سبق دیتا ہے۔ منظر کشی میں تو آپ کا کوئی خانی نہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی ساتھ ساتھ ہجرت کر رہے ہیں۔ امید ہے آپ کا ناول اردو ادب کے لیے ایک بہترین تحفہ ہوگا۔ ”سانسوں کے اس سفر میں“ ام ایمان قاضی آپ کا شمار بہترین لکھار یوں میں ہوتا ہے گو کہ ابھی آپ کے ناول کی سمجھ نہیں آ رہی مگر چونکہ ابھی ناول کا آغاز ہے اس لیے میں اس پر کوئی رائے قائم نہیں کر پا رہی لیکن مجھے امید ہے کہ جوں جوں ناول آگے بڑھے گا ہم اس کو سمجھ جائیں گے اور ہمارے سامنے ایک اچھا شمار کا ہوگا۔ افسانے سب ہی بہترین تھے جو آپ کی معیاری ہونے کا ثبوت ہے بلاشبہ آپ کی ٹیم بہت محنت سے کہانیوں کا مطالعہ کر کے انہیں جگہ دیتی ہے۔ اب میں مکمل ناول کی جانب چلی۔ ”محبت کو ریزہ کر دو“ سب اس کل فہرست میں آپ کا نام دیکھا تو لگا کہ کوئی بہت دلچسپ کہانی پڑھنے کو ملے گی مگر اس بار آپ نے مایوس کیا۔ ناول کا ہیرو اور سربور ہوتا تو اچھا ہوتا اور ان کی ملاقات بھی کسی اور طرح سے کروائی۔ اس کے علاوہ ناول میں ٹھہراؤ کی کمی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بھاگ کر ناول پڑھ رہی ہوں۔ ”گوری تھ“ سے عشق ہے کچھ خاص ”ندا حسین“ آپ کا ناول حقیقت سے ٹھوڑا دور مگر اچھا تھا۔ مستقل سلسلہ سب ہی بہت اچھے تھے۔ ”سیرنگ خیال“ میں اپنی شاعری نہ دیکھ کر فحشوں ہوا مگر کوئی بات نہیں اس بار نہیں مگر آپ کی بارگ جانے گی۔ ایسی کے ساتھ اب میں اجازت چاہوں گی اور امید کروں گی کہ میری تنقید برائے اصلاح کسی کی دل آزاری کا سبب نہیں بنے گی اللہ حافظ۔

**افتر العین خفن عینی..... ہری پور۔** اسلام علیکم! آپ کی ریڈرز اینڈ فیکل امید ہے آپ سب بخیر وعافیت لائف کو انجوائے کر رہے ہوں گے۔ پہلی بار کسی بھی شمارے میں لکھنے کی توفیق ہوئی بابا ہوا تو کیا لگا آپ کو بتانے کا ضرور آپ چل، ہمیشہ سے میری پہلی چوڑاں بابا ہے کچھ بھی ہو جائے آپ کی ہر حال میں آتا ہے اور بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے لیکن اس بار مجھے کورڈنا تکین صورت حال کا اندازہ نہیں تھا اس لیے جب بابا بازار جاتے تو آپ کی لے کر آنے کی ضد کرنی بابا کہتے بنائیں آیا اور میں ابھڑ کر آپ لاتے نہیں ہیں شکر کا کلمہ پڑھا آپ چل ملا ایک بار پھر سانس آئی بدن میں بابا بابا آتے ہیں تبصرے کی طرف تو جناب سب سے پہلے ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا (معذرت کے ساتھ) آگے چلو تو آئی کی ”سرگوشیاں“ میں ٹھوڑا سا آگے بڑھو ”حمود وخت“ سے مستفید ہوئے اور چھٹا لنگ لگائی ”سانسوں کے اس سفر میں“ کی طرف یہ کہنا تبصرہ کو چھوڑ دیا میں نے کون سے گالیاں بنائے کیا کچھ یا مگر رک گیا ارے بھی وہ دادی کو راہ راست پر لایا تھا اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی تھی ارے واہ ہجرت پرے تو کیا کہنے کہانی ختم کی اور پہنچے ”محبت کو ریزہ کر دو“ کیا زبردست اسٹوری بھی دل کے تاروں کو کچھو کچھو ”خسارہ“ لا جواب۔ ”گوری تھ“ سے عشق ہے کچھ خاص ”تو لوٹا دیا بیٹی نے اپنے وطن و لیے اپنا وطن تو اپنا ہی ہوتا ہے عازر کے خیالات سے متفق ہوں ”حصار“ واقعی بدعا میں بھی تو پیچھا کرتی ہیں اور یہ حقیقت ہم اکثر بھول جاتے ہیں۔ ”اکالی“ زبردست آزادی کے اوقات کی کیا خوب اچھی طرح سے عکاسی کی عشا کوثر سردار نے، بانی رہ گیا ”سیرنگ خیال“ تو اس میں سب اس گل (آئی، آئی) کی نظم اچھی تھی، سید عبادت کا بھی میرے ماموں کے فریڈ ہیں ان کی غزل بھی اچھی ہوئی ہیں ”بیاض دل“ میں کچھ زیادہ اچھے والا شعر کوئی نہیں تھا، ہمارا کاشف (مجھے آپ کی کسی بھی کی میل کی اتج نہیں پتا آئی آپ کی ہلو بتا دیجیے) ان کی پروین افضل شاہن اور انجم زہرہ کے ساتھ ہائیں زبردست ہوئی ہیں بانی کچھ رہ گیا تو سوسوری اور ہاں شہلا (آئی، آئی) میں اپنے بابا کے موبائل سے ای میل کر رہی ہوں میرے بابا سولا کو چلے جائیں گے شاید یہ فرسٹ اینڈ لاسٹ ٹائم میرا ای میل ہو اللہ حافظ دعاؤں میں یاد رکھنے گا اور یہ دعا کہ اللہ رب اعزت مجھے میرے عزائم میں کامیاب فرمائیں آمین۔

ہم دعا ہے کہ یہ آنے والے ماہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اہل وطن کے لیے امن و آسائش، سکون و خوش حالی اور اس ناگہانی وبا سے آزادی کی نوید کے آئے آپ کے دسترخوانِ نعمتوں سے اور دلِ محبتوں سے بھر رہے ہیں آمین۔





شمالہ کاشف

**شذیہ ہلشم میواتی..... کھٹیل خلص**

س: ارے! بی جلدی پہچالیے میں کون ہوں؟

ج: وہی جوگی کے ککڑ پر بیٹھی ہوتی ہے۔

س: میری آمد کا مقصد؟

ج: دنیا میں فساد۔

س: "کوئی بات نہیں ڈیر آپی، زندگی باقی ملاقات

باقی۔"

ج: ڈرانا ضروری تھا؟

**تکنیہ خدام حسین جلدی واہن**

س: اب آجائیے جی انصاف کی طرف، آپ نے

ہمیں موٹی کہا؟ ذرا دیکھیے تو اتنی اسٹارٹ اور اسٹالش

"ککڑی آپ کو موٹی نظر آتی ہے؟"

ج: اپنے منہ سے کہہ رہی ہو ورنہ دوسروں سے پوچھو

جو تمہیں دیکھ کر موٹو موٹو کے نعرے لگاتے ہیں۔

س: آپی جی آپ کے لیے ہم نے ایک شعر دریافت

کیا ہے عرض ہے۔

نگاہیں آپ کی خنجر جیسی تو ادا نہیں بندوق سے کم نہیں

جو لوگ آپ پہ مرتے ہیں ان بیوقوفوں میں ہم نہیں

ج: جو ہم پہ مرتے ہیں انہیں بے وقوف نہ سمجھو

یہ محفل ہدیوں کی یہاں جلنے والوں کا کیا کام

س: آپی جی تنگ تو نہیں آگئیں آپ؟

ج: تنگ تو تم سے کرسی آگئی جس پر تم بیٹھی ہو اور وہ

بے چاری تمہارے وزن سے ٹوٹنے کر قریب آگئی ہے۔

**دقتیہ فلز..... میلیسی**

س: بابا، ہوشیار کھڑے ہو جائیں کیوں کس آپ کی

اپنی شہزادی کو کئی ماہ بعد شامل کیا جا رہا ہے وہ ملکہ کرو بہا آگئی

ہے گلاب کے پھولوں سے کرنا نہ کہ.....  
ج: گلاب کے پھول؟ تمہیں تو میں گھنٹی باندھنے کا  
سوچ رہی تھی۔

س: شمالہ جی سب سے پہلے ایک ٹانگ پر کھڑی

ہو جائیں، ہم اتنی دور سٹائے ہیں اور آپ.....

ج: کام کاج میں الجھا دیتی ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں

گھر میں رہا کرو۔

س: علامہ اقبال کی نواسی شعر کا جواب شعر میں دے

دینا۔

اسے سمجھنے کی خواہش ناکام ہوتی جا رہی ہے

کیونکہ وہ ریشم کی طرح الجھتا جا رہا ہے

ج: ایسا دم کٹا شیر لا جواب ہے یعنی اس کا کوئی جواب

نہیں۔

س: مجھے آپ ایک بات بتائیں آپ مجھے غائب

کیوں کر دیتی ہیں شامل کیوں نہیں کرتیں۔

ج: کیونکہ تم غائب دماغ ہو اس لیے۔

س: اوکے جی خوش رہیں ہمارے ساتھ بھی ہمارے

بعد بھی اپنے خرچے پر اور مجھے اجازت دیں کہیں آپ پیسے

نہ مانگنے لگ جائیں۔

ج: بھول جاؤ کہ میں کبھی ادھار معاف کروں گی۔

**دمشلہ لوبشمہ زہد عوشی..... ثمن تلہ گنگ**

س: ڈیر آئی! پہلی بار آپ کی محفل میں ہم دونوں

چراغاں کرنے تشریف لائی ہیں، خوش آمدید تو کہیے۔

ج: خوش آمدید۔ کتنی موم بتیاں لائی ہو؟

س: یہ ہمارے پڑوسی دن بہ دن اتنے ظالم کیوں

ہوتے جا رہے ہیں؟

ج: تم ان کا ادھار جو واپس نہیں کر رہیں۔

س: سب کہتے ہیں میری مسکراہٹ بہت دلکش ہے۔

آپ کہیں فدا ای نہ ہو جائیں؟

ج: فدا تو میں ہو جاتی پر یہ تو بتاؤ کہ تمہاری بیٹی کہاں

گئی۔  
ج: وہاں بھی تم جیسی سے ملوں گی ایسا کبھی ہونہیں  
سکتا۔

س: آپنی دیکھو۔

وہ جو دھڑکنوں کی زبان سنتا تھا

آج سنتا ہی نہیں سسکیاں میری

ج: بے چارے کی شادی ہوگئی چہ چہ۔

س: آپنی ہم دونوں شرافت سے چلی جاتی ہیں اس

سے پہلے آپ ہمیں دھکے دے کر نکالیں۔

ج: نہیں نہیں اور بھی بہت کچھ دے کر رخصت کروں

گی اتنی جلدی بھی کیا ہے جانے کی۔

**بیوین افضل شاہین ..... بھولنگر**

س: میرے میاں جانی پر نس افضل شاہین مجھے گاڑی

چلانا کیوں نہیں سکھاتے؟

ج: اگر وہ تمہیں گاڑی چلانا سکھا دیں گے تو انہیں

بٹھائے گا کون؟

س: زن مریدو لہا کہاں پائے جاتے ہیں؟

ج: تم نے ان کی بیوی سے تربیت لینی ہے کیا؟

س: شادی سے پہلے ہر لڑکا آسمان سے تارے توڑ کر

لانے کا کہتا ہے اور شادی کے بعد وہی لڑکا؟

ج: اپنی محبوبہ کو اماؤں کی رات کہتا پھرتا ہے۔

**طیبہ یاسمین ..... جھنگ**

س: آپنی پہلی بار شرکت کر رہی ہوں پلیز کرسی وغیرہ کا

انتظام کیجیے۔

ج: میں کرسی کا انتظام نہیں کروں ورنہ تم واپس نہیں جاؤ

گی۔

س: آپنی کل رات آپ میرے خواب میں آئیں میں

نے اتنی زور سے چیخ ماری ہتا ہے کیوں؟

ج: اتنی خوب صورت لڑکی پہلی بار خواب میں جو دیکھی

اس لیے۔

س: آپنی اچھی سی دعا کے ساتھ رخصت کیجیے آج کل

س: بشو اتنی یہ اپنی لیلیٰ رب نواز تو آگئی اس کا بھنوں  
کب آئے گا۔ (نیورمانڈ)

ج: وہ بھی آجائے گا مگر تمہیں اس کا انتظار کیوں ہے؟

س: بشو اتنی میرا دل کرتا ہے..... بھلا کیا۔

ج: کہہ چوٹی چھوڑ دوں۔ اب چھوڑ ہی دو بیٹا بڑی ہوگئی

ہو۔

س: اوکے آنٹی آپ تو ویلی ہیں میرے پاس تو بہت

کام ہیں۔ پلیز اچھی سی دعا دیں۔

ج: اللہ تمہارے کام کاج میں اضافہ کرے۔

**شہزاد عنصر ..... شیخوچک**

س: آپنی پہلی دفعہ شرکت کی ہے خوب صورت سا

لقب دے کر ویلکم کریں۔

ج: خوش آمدید کوڑھ مغز۔

س: آپنی آپ پہلے تو اتنی کالی تھیں آپ نے اپنا رنگ

کیسے سفید کیا۔ مجھے بھی کوئی ٹونک بتائیں۔

ج: اپنا راز نہیں بتا سکتی۔ تمہارے لیے ٹونک حاضر ہے

منہ پر سفیدی کی ایک کوچی پھیر لو۔

**گلشن، حفصہ چوہدری ..... گجرات**

س: چین کھو گیا ہے کچھ تو ہو گیا ہے، تم سے ملنے کے

بعد، شامکے جی۔

ج: یہ گھر میرا گلشن ہے، گلشن کا اللہ حافظ۔

س: آپنی تمہیں دل لگی بھول جانا پڑے گی۔ اس کے

بارے میں اماں کو بتا کر تو دیکھو۔

ج: اور اس کے بعد سو جوتے گن کر کھا کر بھی دیکھو۔

س: آپنی گھر میں کام کرنے والی کو ماسی کے بجائے

پھوپھی کیوں نہیں کہتے۔

ج: اس لیے کہ پھوپھی ساس بھی بن سکتی ہے۔ اب

سوچ کر بتاؤ ماسی کے بارے میں؟

س: آپنی زمین پر نہ ہی تو آسمان پائل کیا خیال ہے۔

مجھے دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔

ج: تمہیں پڑھا لکھا تمیز و صبر والا سسرال ملے۔ سب کہہ دین۔

### بنت حوا..... مقام نامعلوم

س: کیا حال ہے..... کیا کر رہی ہیں؟

ج: حال بہت پتلا ہے پنکھا جھل رہی ہوں۔

س: شام کلمہ جی دوستی کریں گی مجھ سے؟

ج: میں صرف ذہین لوگوں سے دوستی کرتی ہوں۔

س: شمی آپ کی آپ سیر سپاٹے کر کے واپس آ گئی ہیں کہ؟

ج: صرف سیر کر کے آئی ہوں، سپانا وہیں چھوڑ کر آ گئی۔

س: آنٹی میں بھی کچھ پکھا پک؟

ج: نامی سے ملتی ہو مجھے بھی تم ویسی ہی لگیں۔

س: آپ کی گھر والے کہتے ہیں کہ تم عانی، مریم سعیدی گل کھلاؤ گی..... بھلا کس چیز کے۔

ج: اپنے سہرے کے۔

س: آپ کی کیا میں آپ کی کرسی پر بیٹھ سکتی ہوں؟

ج: میں اٹھوں گی تو بیٹھوں گی ناں؟

س: آپ کی جب آپ غصے میں ہوتی ہیں تو پھر کیا کرتی ہیں؟

ج: جو کرتی ہوں وہ ناقابل اشاعت ہے۔

س: آپ کی آپ کافی وہ ہیں بھلا کیا؟ ہرگز نہیں۔ جو آپ سمجھ رہی ہیں۔

ج: ہرگز وہ بھی نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔

س: آپ کی میں سورج کی طرف کیوں نہیں دیکھ سکتی؟

ج: کیوں کہ سورج کبھی یہ برداشت نہیں کرے گا تم اسے دیکھو۔

کیسا لگا؟

ج: بالکل نور جہاں کی طرح اب اپنی فراک چھوڑ دو۔

س: آپ ہمیشہ خود کو اسٹاکس اسمارٹ کیوں کہتی ہیں۔ کیا سچائی، ہضم نہیں ہوتی آپ کو؟

ج: مجھے تو ہضم ہو جاتی ہے پر تمہیں نہیں ہوتی۔

س: ویسے آپ جیسے لوگ خود کو اسی طرح مطمئن کرتے ہیں، کیوں ناں؟

ج: کس سے لڑ کر آئی ہو سچ بتانا۔

س: نیارا آئی! نور چودھری آپ کو اتنا کیوں چاہتی ہے اور کیسے؟ ہی ہی، یعنی کہ وہ کچھ.....؟

ج: باؤلی ہے یہ کہنا چاہتی ہو تو کھل کر کہو۔

س: ایک راز کی بات بتاؤں آپ کو؟

ج: مت بتاؤ سب کو پتا ہے۔

س: سفید بالوں والی داہن تھوڑی آ کورنگتی ہے کچھ خیال کر لیں اپنا ہالہا۔

ج: میرے سفید بال چھوڑو اپنی تپسی کا خیال رکھو۔

س: اچھا یہ تو بتائیں ”ہم سے پوچھیے“ میں جواب کہیں آپ کے ”وہ“ تو نہیں بتاتے آپ کو؟ سچ بتانا۔

ج: اگر بتا بھی دیتے ہیں تو تم جل کیوں رہی ہو۔

س: اچھا دھکے مت دیں جا رہی ہوں لیکن ایک سچ سن لیں وہ یہ کہ آپ جن لوگوں کے سوالوں کو ردی میں ڈالتی ہیں ناں آئی تھنک ان کے جواب آپ نہیں دے سکتیں۔ اسی لیے ناں..... ہالہا۔

ج: جواب تو بہت ہیں مگر سوال بھی تو سنئے ہوں۔ عقل کی دشمن۔

ج: جواب تو بہت ہیں مگر سوال بھی تو سنئے ہوں۔ عقل کی دشمن۔



شلزہ پرویز شائع..... ایبٹ آباد ہزارہ

www.naeyufaq.com

س: آداب آپ کی جان! تیرے در پر صنم میں چلی آئی



# آپ کی صحت

ڈاکٹر شائستہ سرفراز

سلطانہ ساہیوال سے لکھتی ہیں کہ میرے شوہر کے بال بہت تیزی سے گر رہے ہیں میں نے اپنی ایک دوست سے آپ کے بارے میں سنا تھا کہ آپ بال گرنے کا تیل بناتے ہیں جس سے بال دوبارہ آجاتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے گائیڈ کریں کہ میں یہ کیسے منگوا سکتی ہوں۔

محترمہ آپ ہمارے کلینک کے ایزی پیسہ اکاؤنٹ میں ہمیں پیسے بھیجیں ہم آپ کے گھر

APHRODITE HAIR GROWER

OIL بھجوادیں گے۔ ہمارا ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر

0349-4900800 ہے۔ ایک بوتل منگوانے کے

لیے آپ کو سات سو روپے بھیجنا ہوں گے۔ ایزی پیسہ

کرنے کے بعد ہمارے کلینک کے فون نمبر پر رابطہ

کر کے اپنے بھیجے گئے پیسوں کی تفصیل اپنا نام اور مکمل

پتہ اور نوٹ کرا دیں۔

انم کراچی سے لکھتی ہیں کہ میری سہیلی کا مسئلہ شائع

کیے بغیر دوا تجویز کر دیں۔

محترمہ آپ ہمارے کلینک پر رابطہ کریں۔

س حیدرآباد سے لکھتی ہیں کہ میرے چہرے پر غیر

ضروری بال ہیں جن میں وقت گزرنے کے ساتھ

اضافہ ہو رہا ہے۔ ابھی میری عمر بائیس سال ہے برائے

معزز قارئین کی خدمت میں خاصی طویل غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضر ہیں، برائے مہربانی توجہ فرمائیں ہمارا کلینک موجودہ جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو رہا ہے، اگلے شمارے میں ان شاء اللہ آپ کو نیا پتہ مل جائے گا۔

عظمیٰ لاہور سے لکھتی ہیں کہ مجھے بار بار پیشاب کا مسئلہ ہے وضو بھی دیر تک نہیں رہتا برائے مہربانی کوئی دوا تجویز کریں۔

محترمہ آپ RUSH AROWA 30 کے

پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین بار پیئیں۔

واجد احمد پشاور سے لکھتے ہیں کہ میری عمر تینالیس

سال ہے اور میری شادی ابھی ہوئی ہے ازدواجی زندگی

میں مسائل کا سامنا ہے جس کی وجہ سے بہت پریشان

ہوں بڑی امید کے ساتھ آپ کو خط لکھ رہا ہوں برائے

مہربانی میرا مسئلہ حل کریں۔

محترمہ آپ STEPHISOGORIA 30 کے

پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین بار

پیئیں۔

# ہومیو ڈاکٹر محمد ہاشم مرزا



ڈاکٹر صاحب مرحوم 50 سال سے زائد عرصہ طب کے شعبے سے وابستہ رہے اور 20 سال سے زائد عرصہ ”ماہنامہ آنجل“ کے معروف سلسلے ”آپ کی صحت“ کے ذریعے قارئین کو ہومیو پیتھک طریقہ علاج کے مطابق طبی مشورے فراہم کرتے رہے۔ مندرجہ ذیل دوائیں ڈاکٹر صاحب کے 50 سالہ طبی تجربے کا نچوڑ ہیں۔

چہرے و دیگر غیر ضروری بالوں کا مستقل خاتمہ



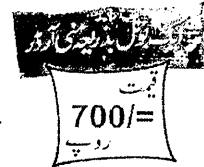
براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت =/800 روپے

قدرتی بال، سر کی رونق بحال



براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت =/500 روپے

ایفروڈائنٹ پین کمر



براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت =/500 روپے

ایفروڈائنٹ بریسٹ بیوٹی



براہ راست کلینک سے لینے پر قیمت =/500 روپے

زیر نگرانی:

ہومیو ڈاکٹر محمد ہاشم مرزا کلینک

ایڈریس: دوکان نمبر C-5، کے ڈی فلیٹس فیز 4،

شادمان ٹاؤن نمبر 2، سیکٹر B-14، نارتھ کراچی 75850

فون نمبر: 021-36997059، صبح 10 تا رات 9 بجے

منی آرڈر کی سہولت میسر نہ ہونے کی صورت میں فون پر رابطہ کریں

محمد عاصم مرزا

محمد آصف مرزا

محمد عامر مرزا

منی آرڈر بذریعہ  
پاکستان پوسٹ پیجنے کا پتہ:  
منی آرڈر کرنے کے بعد فارم نمبر، نام،  
ایڈریس، مطلوبہ دوا، قیمتی مٹی رقم،  
0320-1299119 پر SMS کریں

مہربانی کوئی دوا تجویز کریں۔ سال ہے مگر نسوانی حسن نہ ہونے کے برابر ہے جس کی

محترمہ آپ ہمارے کلینک کا تیار کردہ وجہ سے بہت شرمندگی ہوتی ہے برائے مہربانی کوئی دوا تجویز کریں۔ **APHRODITE HAIR INHIBITOR**

منگوائیں ہمارے ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر محترمہ آپ مبلغ تیرہ سو روپے ہمارے ایزی پیسہ اکاؤنٹ میں بھیجیں ہم آپ کو **APHRODITE** آ کر ارسال کر دیں گے ایک بوتل آئل کی قیمت نو سو روپے ہے۔

سعیدہ لاہور سے لکھتی ہیں میرا چھوٹا بیٹا مٹی بہت کھاتا ہے اس کی عمر پانچ سال ہے پیٹ میں ہر وقت درد رہتا ہے۔

ایڈریس: دکان نمبر C-5 کے ڈی اے فلیٹس فیر 4 محترمہ آپ اپنے بیٹے کو **ALUMINA 30** شادمان ٹاؤن نمبر 2 سیکٹر B-14 نارتھ کراچی 75850 کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں تین بار دیں۔

ایزی پیسہ اکاؤنٹ نمبر 0349-4900800 خط محترمہ آپ کا پتا آپ کی صحت ماہنامہ آنچل کراچی پوسٹ بکس سال ہے لیکن میرا قد بہت چھوٹا ہے برائے مہربانی کئی دوا تجویز کریں۔

hashim.mirza@aphrodite.com.pk



محترمہ آپ **CALCIUM PHOS 6X** کی دو گولیاں دن میں تین بار کھائیں اور **BARRIUM CARB 200** کے پانچ قطرے آدھا کپ پانی میں ہفتہ میں صرف ایک بار پیئیں۔

www.naeyufaq.com

فاطمہ سیالکوٹ سے لکھتی ہیں کہ میری عمر اٹھارہ